

فقہ اسلامی

ایک تعارف، ایک تجزیہ

ڈاکٹر ادریس زبیر

پی ایچ ڈی حدیث و علوم، حدیث، فاضل درس نظامی

فہرست مضامین

پیش لفظ

پہلا باب

تعارف فقہ

13	-----	فقہ
13	-----	اسلامی فقہ کی اہمیت و ضرورت
15	-----	خصوصیات
16	-----	لفظ فقہ کا معنی: اہل لغت کے نزدیک
16	-----	قرآن مجید میں
17	-----	حدیث رسول میں
17	-----	شرع میں
21	-----	مفہوم فقہ میں تغیر
21	-----	فقہ کی جامع تعریف
22	-----	فقہ کا موضوع
22	-----	چند مسائل فقہ
26	-----	فقہ، قانون اور شریعت
27	-----	قانون سے مراد
27	-----	اس کی نشوونما
29	-----	شریعت: معنی و مفہوم
29	-----	عبرت کا مقام
30	-----	شریعت اور قانون میں فرق
30	-----	محل لاء
31	-----	اسلامی فقہ کا مزاج
34	-----	معدل رویہ
34	-----	فقہیہ کسے کہتے ہیں؟
36	-----	فقہاء کرام کے درجات
36	-----	فقہ میں اہم چیز کون سی ہے؟
37	-----	آیت یا لفظ کے فہم میں اختلاف

37	-----	حدیث کے فہم میں اختلاف
39	-----	اجتہاد میں اختلاف
39	-----	فقہ کے بارے میں غلط فہمیاں
	-----	یاد رکھنے کی بات
		دوسرا باب

مصادر فقہ اسلامی

40	-----	اصلی و ذیلی
40	-----	مصادر کا مختصر تعارف
40	-----	قرآن مجید
41	-----	الفاظ قرآن و شرعی احکام
42	-----	فہم قرآن کی ضروری شرائط
43	-----	قرآن کی برکات
43	-----	سنت رسول ﷺ
43	-----	سنت کے مختلف معانی
44	-----	فقہ اسلامی میں سنت کا مقام
44	-----	ہر صورت میں آپ کی اطاعت
47	-----	سنت کا انکار قرآن کا انکار
47	-----	سنت قرآن کی مبین ہے
47	-----	قرآن و سنت میں تفریق ناجائز
48	-----	احکام میں قرآن و سنت کا باہمی تعلق
49	-----	کتابت حدیث
49	-----	اجماع
49	-----	لغوی تعریف
49	-----	اصطلاحی تعریف
50	-----	اجماع کا موضوع
50	-----	اجماع کے منعقد ہونے کی شرط
50	-----	کیا اجماع ہوتا بھی ہے؟
50	-----	اجماع کی اقسام: صریح و سکوتی

51	-----	قیاس
51	-----	لغوی معنی
51	-----	اصطلاحی معنی
51	-----	قیاس کے ارکان: اصل، فرع، حکم اور علت
52	-----	قیاس کی شرائط
52	-----	حجیت قیاس: قرآن س، سنت رسول سے، اقوال صحابہ سے
53	-----	قیاس کیوں؟ وجوہات و اسباب
54	-----	اجتہاد: لغوی معنی، اصطلاحی معنی
55	-----	اجتہاد کی اہمیت
55	-----	اجتہاد اور تفقہ
56	-----	اجتہاد کی شرائط
57	-----	دیگر شرائط اجتہاد
58	-----	اجتہاد کا اجر
58	-----	اختلاف ہو تو حق صرف ایک کے ساتھ ہوگا
58	-----	امام لکھنویؒ کا فیصلہ
		تیرا باب

تدوین فقہ اور اس کے مراحل

60	-----	زمانہ رسالت میں
61	-----	زمانہ صحابہ میں
61	-----	زمانہ تابعین و مابعد میں
60	-----	آغاز دور جمہود
63	-----	فقہ اسلامی کی مختصر تاریخ
63	-----	زمانہ رسالت میں فقہ
64	-----	زمانہ صحابہ میں فقہ
65	-----	زمانہ تابعین میں فقہ
65	-----	خیر القرون کا علم اور اختلاف
65	-----	صدیق اکبر کا علم
66	-----	فاروق اعظم کا علم

66	-----	عثمان ذوالنورینؓ کا علم
66	-----	دیگر صحابہ کا علم
67	-----	ایک سنہری اصول
67	-----	ائمہ فقہاء کا علم
		چوتھا باب

فقہاء اربعہ

69	-----	امام ابوحنیفہؒ
69	-----	اساتذہ
69	-----	ایک نکتہ
70	-----	شاگرد
71	-----	فقہ حنفی کے اصول: کتاب اللہ، سنت، اجماع اور قیاس
71	-----	فقہ حنفی کی مشہور کتب: اقسام و تعریف
72	-----	نمایاں خدو خال
72	-----	فقہ حنفی کے بارے میں علماء احناف کی آراء
72	-----	پہلی رائے، دوسری رائے، تیسری رائے، چوتھی رائے اور ضابطے
73	-----	تلفیق
73	-----	دو اقسام: تلفیق مذموم، تلفیق محمود
74	-----	فقہ حنفی کی چند اصطلاحات
74	-----	مفتی بھا، الروایہ، الامام، الشیخان، الطرفان، صاحبان، اصحابنا، مشائخ
75	-----	ائمہ اربعہ کے مابین اختلاف کی صورتیں
75	-----	وفات
77	-----	ایک تحقیق طلب معاملہ: مجلس علمی، بعض دعویٰ کا ضعف
78	-----	امام مالکؒ
78	-----	اساتذہ
78	-----	تدریس و علمی وقار
79	-----	فقہ مالکی کی اہم کتب: موطا امام مالک، المدونہ
80	-----	امام مالکؒ کے شاگرد
80	-----	فقہ مالکی کے اصول

80	-----	اجتہاد کا ایک جامع اصول
80	-----	افتاء میں رجحان
80	-----	چند مالکی اصطلاحات، مفتی، مذہب
81	-----	موازنہ مابین فقہ مالکی و حنفی
82	-----	وفات
82	-----	امام شافعیؒ
82	-----	بچپن
82	-----	اساتذہ
82	-----	رحلہ برائے علم
83	-----	فکر میں تبدیلی
83	-----	تلامذہ
84	-----	فقہ شافعی کے اصول
84	-----	استدلال میں اصل حیثیت کس کی؟
84	-----	مشہور شافعی کتب
85	-----	بعض مشہور شافعی اصطلاحات:
86	-----	اختلافی اصطلاحات
86	-----	تقابلی مطالعہ
87	-----	وفات
88	-----	امام احمد بن حنبل
88	-----	سماعت حدیث
89	-----	اساتذہ
89	-----	تلامذہ
89	-----	تقویٰ
89	-----	فتنہ خلق قرآن
91	-----	خراج عقیدت
91	-----	عقیدہ
91	-----	وفات
91	-----	فقہ حنبلی کے اصول
91	-----	نصوص

92	-----	فتاویٰ صحابہ کا چناؤ
92	-----	حدیث مرسل
92	-----	ضرورۃ قیاس
92	-----	قابل اعتماد حنبلی کتب
92	-----	چند حنبلی اصطلاحات
92	-----	ائمہ اربعہ کے فقہی مناہج پر تبصرہ
94	-----	وقع رائے
95	-----	فقہ اسلامی کی انواع
96	-----	پانچواں باب

منہج سے اعراض

98	-----	فقہی مذاہب کا آغاز
99	-----	تقسیم کی وجہ
100	-----	مذہبی شدت کا غلبہ
102	-----	امام ابن تیمیہ کا ایک صائب مشورہ
102	-----	مسلم کی فقہ کی اشاعت کے اسباب
102	-----	قاضیوں کا کردار
102	-----	فقہاء کے میلانات
104	-----	غلو
105	-----	ایک اور نمونہ
105	-----	تلخ یاد گاریں
105	-----	تقلید: لغوی معنی، اصطلاحی معنی
106	-----	تبصرہ
106	-----	تقلید کی ابتداء
106	-----	تقلید کا حکم
107	-----	تقلید کے نتائج
108	-----	گروہ بندیاں
109	-----	مقلد و غیر مقلد
109	-----	فروعی مسائل

109	-----	مسئلہ اٹھنے کے بعد
109	-----	مسئلہ اٹھنے سے پہلے
110	-----	ذاتی رائے اور فروعی مسئلہ
111	-----	فروعی مسائل جانچنے کے اصول
112	-----	نتائج
112	-----	فقہ اسلامی کے محاسن
112	-----	دین و دنیا
112	-----	فقہی برکتیں
112	-----	دین میں توسع
113	-----	مجتہد معصوم نہیں
113	-----	ضرورت اجتہاد
		چھٹا باب

فقہ اسلامی کی قبولیت کی چند شرائط

114	-----	اطاعت و اتباع
115	-----	صحیح حدیث: ائمہ اربعہ کا رجحان
116	-----	غیر واقع مسائل سے اجتناب
117	-----	فقہ اسلامی پر کھنے کے معیارات
117	-----	معیاری کتب کا مطالعہ
118	-----	فقہی مسائل کی جانچ
118	-----	فقہ سے مستفید ہونے کے دواہم گر
119	-----	کتب فقہ کا انتخاب
119	-----	چند مفید فقہی کتب
119	-----	فقہ اسلامی کے چند مطالبات
120	-----	کون سی فقہ مراد لی جائے
120	-----	فقہی لٹریچر: عمومی انداز، مجتہدانہ انداز
121	-----	فقہاء ہمارا عظیم سرمایہ
121	-----	تعصب سے دور رہے
122	-----	فقیح اختلاف کے اسباب

122	-----	تعصبات ختم کرنے کے دو تجاویز
122	-----	اسباب اختلاف سے آگاہی
122	-----	اختلاف کے باوجود رواداری
123	-----	فقہاء امت سے استفادہ
124	-----	اجتہاد کا دروازہ بند نہ کیا جائے
125	-----	استنباط
125	-----	جرح و تعدیل
126	-----	تخریج سے اجتناب
130	-----	فتویٰ و مفتی
130	-----	مفتی اور اس کی شرائط
130	-----	مفتی کی خصوصیات
130	-----	علم و صداقت
131	-----	اخلاق و کردار
131	-----	فہم و فراست
131	-----	غیر متعصب ہو
131	-----	قرآن و حدیث کا عالم ہو
132	-----	فتویٰ نویسی کا اسلوب
132	-----	فتویٰ نویسی کی مختصر تاریخ
133	-----	تالیعین کے دور میں فتویٰ
133	-----	زمانہ خیر کے بعد فتویٰ
134	-----	افتاء کے نوعیتیں
134	-----	فتویٰ کی اہمیت
134	-----	فتویٰ کی تاریخی اہمیت
135	-----	آج کے فتاویٰ
135	-----	مفتی بدلتا رہے
136	-----	غلط فتویٰ کی سنگینی
137	-----	اختلاف اقوال اور فتویٰ
138	-----	آخری گزارش
140	-----	امت کا المیہ

قال ابن سيرين رحمه الله:
إن هذا العلم دين فانظروا عمن تأخذون دينكم.

امام ابن سيرینؒ فرماتے ہیں:
بلاشبہ یہ علم، دین ہے پس دیکھا کرو کہ دین تم کس سے لے رہے ہو۔

پیش لفظ

فقہ اسلامی - فرقہ واریت سے پاک ایک ایسی فکر سلیم کا نام ہے جو خالصتاً قرآن و سنت رسول کی تعلیمات میں سنبھلی گئی ہو۔ استدلال، استنباط اور اجتہاد میں قرآن و سنت رسول ﷺ کی خوگر ہو اور شرعی احکام کی تشریح میں ان دونوں کو ہی ہر حال میں ترجیح دیتی ہو۔ یہ تعلیمات اللہ کی دین ہیں جو اپنے لطف و کرم سے کسی بھی بندے کو خیر کثیر کے طور پر وہ بہہ کر دیتا ہے۔

مذہبی و فرقہ دارانہ رجحانات زندگی کے ہر سٹیج پر نمایاں ہیں۔ بلاشبہ ان میں تعصب و تشدد کے عناصر ہیں مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ ان بندگان خدا میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنے اخلاص و عمل کے باوجود اپنی کئی کوششوں پر سوال کناں ہیں کہ یہ سب کچھ کس کے لئے کیا جا رہا ہے؟ کیا اپنی جماعت، گروہ یا شخصیت کے لئے؟ یا اللہ کے لئے؟ منصف ضمیر کے اس سوال پر جہاں یہ لوگ لڑکھڑاتے ہیں وہاں ان کے پاس ان سوالات کا جواب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ خاموشی اختیار کی جائے یا اپنی ذہنی اثران پر مزید پابندی لگا دی جائے۔

فقہ اسلامی - اس علم کا نام ہے جو کتاب و سنت رسول ﷺ سے سچی وابستگی کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ یہ علم و فہم بعض ایسے مبہم خیالات کا صفایا کرتا ہے جن کی تہہ میں حقیقت کچھ اور ہوتی ہے اور ایسے دروہام کھولتا ہے جن میں ظلمت کو بھی روشنی نصیب ہوتی ہے۔ جس کے ادراک کے بعد ضلالت یا نزاع کی کوئی شکل باقی نہیں رہتی۔

کتاب ہذا میں کوشش کی گئی ہے کہ رائج معنی سے ہٹ کر فقہ کا صحیح معنی و مفہوم متعین کیا جائے۔ اور وہ اثرات زائل کئے جائیں جو کسی بھی صورت میں فقہ کے معنی کو محدود کرتے یا مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہیں۔

اس میدان کے شہسوار کون ہیں؟ ان کی خصوصیات کیا ہیں؟ زبان رسالت نے علم اور اس کے درجات جس طرح واضح کئے ہیں اس کے بعد مزید کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

رائج تاریخ فقہ کو اس کتاب میں بیان کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ آج کے معروضی حالات میں طالب علم کی یہ ضرورت نہیں بلکہ اس فقہی منہج کی ضرورت ہے جو جناب رسالت مآب ﷺ نے چھوڑا اور جس کے وارثوں نے اس منہج کو بحفاظت سنبھالا اور اس کی آبیاری کی۔ وہ منہج کیا تھا؟ سب جانتے ہیں کہ آپ ﷺ کا چھوڑا ہوا منہج:

ترکت فیکم أمرین لن تضلوا ما إن تمسکتہم
بہما: کتاب اللہ و سنتی۔ الحدیث
میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ جب
تک تم نے ان دونوں کو تھامے رکھا کبھی گمراہ نہیں
ہو گے: ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری سنت۔

یہی وہ مقام ہے جس کی تلاش آج ہمارے لئے بھول بھلیوں کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ اس کے برعکس رواجی تاریخ فقہ بظاہر واضح اور روشن ہے مگر اس کے حقائق دیز پر دوں میں مستور۔ جنہیں بغور پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاریخ دراصل مسالک و مذاہب کی تاریخ ہے اپنے فضائل اور ترجیحات کی تاریخ ہے۔ مسلک کی خدمت و محنت تو اس تاریخ میں نظر آتی ہے مگر دین کی خدمت کہاں؟ گلتا یہی ہے کہ چوتھی صدی کے وقوف کے بعد ہم سعی نہیں کر سکے بلکہ جہاں ہم کھڑے تھے آج بھی وہیں کھڑے ہیں۔ ہاں ان حضرات میں جو مخلص تھے ان کا تحریری و عملی سرمایہ ہمارے لئے نعمت عظمیٰ سے کم نہیں۔ اللہ ان پر اپنی رحمتوں کی برکھا برسائے۔ آمین

ہماری فقہی تاریخ میں سمرقند و بخارا اور بغداد کی تاریخ بھی ہے جسے ہم پڑھ کر اپنے پیدا شدہ حالات کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ اس لئے مسلکی تاریخ کو دہرانا

اتنا اہم نہیں جتنا اسے فرموش کر دینا ضروری ہے حالات ہم سے جن مخلصانہ جذبوں کے متقاضی ہیں وہ یہ ہیں کہ مسلکی تعصبات کو خیر باد کہا جائے۔ امت مسلمہ بہت زخمی ہو چکی اپنے ہی اس پر کرم کر لیں تو اس پر بڑا احسان ہوگا۔ ہم اس دور کے تقاضوں کو سمجھیں۔ ہم اگر اپنے علمی سوتوں کو بند کریں گے تو ماضی پر رشک کرنا بے وقوفی ہوگا۔ اس لئے کہ حال، ماضی سے جڑ کر مستقبل بناتا ہے اگر حال کا وجود ہی نہ رہے تو مستقل یا ماضی تو ایک داستان سے زائد کچھ نہ ہوگا۔ اس منہج کو سنبھالا دینے کے لئے اس ارشاد رسول ﷺ کو حرز جاں بنانا ہوگا: کہ

إنه من يعش من بعدى..... میرے بعد جو جنے گا وہ بہت سے اختلافات دیکھے گا۔ ایسی صورت میں میری جانی بوجھی سنت کو تھام لینا۔

فقہ اسلامی کے اصل مصادر کون سے ہیں؟ اور ان کے تابع کون کون سے؟ ان کا مختصر تعارف بعض ضمنی مباحث کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

فقہ اسلامی کی تدوین عمومی انداز میں ہوئی اور اسے ہی پسند کیا گیا۔ یعنی مختلف فقہاء کی کاوشوں میں جہاں مخصوص ذہن کا فرمانظر نہ آیا اسے فقہ اسلامی نے اپنے اندر سمو لیا مگر جہاں یہ رنگ غالب نظر آیا وہاں فقہ اسلامی نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اس لئے کہ فقہ اسلامی وسعت کے اعتبار سے اپنا اونچا مقام رکھتی ہے وہ اپنے آپ کو محدود رکھنا تو کیا دیکھنا بھی نہیں چاہتی۔ اس لئے اس میں ہر وہ مثبت کاوش شامل ہوئی جو فقہ اسلامی کو ذاتی سوچ اور مذہبی رجحانات سے پاک نظر آئی۔ فقیہ محترم کی ہر وہ رائے، اجتہاد یا استنباط و قیاس حثیت اختیار کر گیا جو کتاب و سنت (قرآن مجید و سنت رسول ﷺ) اور مقاصد شریعت سے مطابقت رکھتا تھا۔ اس لئے کسی مجتہد کو عقل کل کا دعویٰ تھا نہ علم کلی کا۔ اور نہ ہی کسی کے بارے میں ایسی مبالغہ آرائی کی جاسکتی ہے۔ فقہاء صحابہ ہوں یا فقہاء سابعہ، اسی طرح فقہاء اربعہ ہوں یا دیگر فقہاء ان سب نے بہ اخلاص اپنی اجتہادی کوششوں کو جاری و ساری رکھا اس ضمن میں اگر کہیں علمی سہو، لاعلمی یا خطا کا علم ہوا بھی تو انہوں نے خود اصلاح کر لی یا ان کی جب اصلاح کی گئی تو ان کی متواضع طبیعت نے اپنی اس اصلاح کو رب ذوالجلال کے حضور شکرانہ ادا کر کے قبول کیا۔ اور امت کو ایک خاموش سبق بھی دے دیا کہ اس راہ کے مسافروں کا یہی چلن ہوا کرتا ہے: کہ

ما عرفناك حق معرفتك..... کہ دین کی معرفت کا صحیح حق ہم سے ادا نہیں ہو سکا۔

فتویٰ و افتاء بھی ایک موثر معاشرتی قوت و ضرورت بن کر ابھرے جو سائل کی دینی تشنگی کا سامان تھے اور عامۃ الناس کی شعوری بیداری کا ایک ذریعہ بھی بنے۔ یہ منصب جلیلہ جسے حاصل ہوتا وہ طویل عرصہ کی مطالعاتی محنت و مشقت کا ذہنی ثمرہ ہوتا۔ اس میں ہر نووارد کی یا مذہبی تعصب سے مالا مال مفتی کی گنجائش نہ ہوتی۔ اور نہ ہی اس افتاء کے بعض مراحل سے گزرنے کے بعد اسے اس کا اہل سمجھا جاتا تھا۔ اسی لئے علم و دلائل سے پختہ فتاویٰ جہاں جان رکھتے وہاں ان کی قدر و قیمت سے واقف علماء و خواص بھی تھے جو ان پر خود عمل کرنا اور دوسروں سے بھی کروانا ضروری سمجھتے تھے جس کی وجہ افتاء و فتویٰ کی شریعت کی قدر دانی تھی۔ فقہ اسلامی مختلف شعبہ ہائے زندگی کے مباحث پر مشتمل ہے۔ اس کے فہم کے متخصصین بھی ہیں۔ اور بعض نابغہ روزگار شخصیات ایسی بھی ہیں جن کے علم و فضل اور اجتہادات سے ایک دنیا مستفید ہوئی اور ہو رہی ہے۔ فقہ اسلامی ایک ایسا بہاؤ ہے جو زمان و مکان کی علمی و شرعی ضرورتوں کو پورا کرتا اور ذہنی تشویش کو دھو تا اور پاکیزہ کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کے بہاؤ میں ٹھہراؤ نہیں اس لئے کہ ٹھہراؤ میں زندگی ہے نہ تازگی۔ یہ ایسا باغ ہے جو ہر موسم میں اپنے اشجار کو آگاتا اور اپنے لذیذ پھلوں سے اپنے چاہنے والوں کو لذت سے آشنا کرتا ہے۔ عجب چیز ہے لذت آشنائی۔ ہمارے ان فقہاء پر اللہ تعالیٰ اپنی خیر و برکت نازل فرمائے جنہوں نے امت کو اس خیر سے آشنا کرایا اور خود بہت کچھ نوازا۔

ہمارا ماضی کچھ تلخ حقائق بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے جس کی کڑواہٹ ابھی تک بانٹی جاتی ہے۔ گوان کی بنیادیں صدیوں پرانی ہیں مگر ماضی کی اٹھان نے اسے اب ایسا درخت بنا دیا ہے جو سوائے کڑوے کیلے پھل دینے کے یا اپنے سائے سے دوسروں کو محروم کرنے کے یا اپنے بیج سے اپنی نسل کو باقی رکھنے کے کچھ نہیں کر پارہا۔ یا یہ ایسی عمارت کھڑی ہو چکی ہے کہ جس کی چار دیواری میں اپنا اگر کوئی آجائے تو خوشی محسوس کرے اور اگر غیر آجائے تو خونی نگاہوں کا سامنا کرے اور فوراً انکال دیا جائے۔ یہ ایسی فضا ہے جس میں اپنوں کو ہی مخصوص تربیت دی جاتی ہے اور مخصوص سوچ کے ساتھ انہیں مارکیٹ کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ علمی بحث و تحقیق غیر جانب داری اور حقیقت پسندی کی متقاضی ہوتی ہے لیکن اس موضوع میں بے شمار مثالیں ایسی موجود ہیں کہ علم و تحقیق کا قلم

پاکیزگی سے ہٹ کر کسی اور جانب مڑ گیا ہے۔ معروضی شکل اس میں کم اور خاص غرض کے ساتھ وابستگی صاف نظر آتی ہے۔
ایسے حالات میں فقہ اسلامی کیا تقاضا کرتی ہے اور ایک بندہ خدا کو حد اعتدال پر لانے کے لئے کیا لائحہ عمل دیتی ہے۔ کچھ ایسے امکانات ابھی تک باقی ہیں جو مایوسی سے نکال کر امید کی روشن کرن فروزاں کرتے ہیں۔ کتاب کا آخری باب ان سوالوں کا جواب ہے۔
کتاب کی تصنیف میں جن مصادر و مآخذ سے مدد لی گئی ہے ان کا کتاب میں جا بجا حوالہ تو دے دیا گیا ہے مگر الگ کتابی فہرست تیار نہیں کی جاسکی جو ان شاء اللہ اگلے ایڈیشن میں شامل کر دی جائے گی۔

مؤلف

اس کے نام جس نے اپنے فہم دین کی روش کو بغیر کسی تعصب یا تعلیٰ کے قرآن اور سنت رسول ﷺ کے ساتھ وابستہ کر لیا۔

عن العرباض بن سارية رضي الله عنه قال:

وعظنا رسول الله ﷺ موعظة ذرفت منها العيون، ووجلت منها القلوب، قلنا: يا رسول الله ﷺ، إن هذه موعظة مودع فما تعهد إلينا؟ فقال: قد تركتكم على البيضاء، ليلها كنهارها، لا يزيغ عنها بعدى إلا هالك، ومن يعش منكم بعدى فسيرى اختلافا كثيرا، فعليكم بما عرفتم من سنتي، وسنة الخلفاء الراشدين المهديين، وعليكم بالطاعة وإن عبدا حبشيا، وعضوا عليها بالنواجذ، وإياكم ومحدثات الأمور فإن كل بدعة ضلالة. (أخرجه أحمد: 4/126)

سیدنا عرباض بن ساریہؓ سے روایت ہے: جناب رسالت مآب ﷺ نے ہمیں ایک ایسا وعظ ارشاد فرمایا کہ ہماری آنکھیں نم ہو گئیں اور دل پسچ سے گئے۔ ہم نے عرض کی: اللہ کے رسول! آپ ﷺ کا یہ وعظ الوداعی سا وعظ لگتا ہے۔ آپ ہم سے کیا توقع کر سکتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "میں نے تمہیں روشن شاہراہ پہ چلا دیا ہے جس کی تاریکی بھی اس کی روشنی کی مانند ہے۔ میرے بعد اگر کوئی اس راہ سے بھٹکا تو وہ خود ہی تباہ ہوگا۔ سنو! میرے بعد جو زندہ رہا وہ بہت سے اختلافات کو اپنے درمیان دیکھے گا۔ اس وقت تم لوگ میری اور ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی معروف سنت کو تھام لینا۔ اپنے آپ کو اطاعت امیر کا خوگر بنانا خواہ تمہارا وہ امیر حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ اطاعت کو اپنی ڈاڑھوں سے پکڑ لینا۔ اور ہاں اپنے آپ کو نئی نئی گھڑی نیکیوں سے بھی باز رکھنا اس لئے کہ ہر بدعت گمراہی ہوتی ہے۔"

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم.....

فقہ: دین اسلام کے اس فہم، فطنت، ادراک اور علم کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اپنے پاکباز بندوں کو نور کی شکل میں عطا کر دیتے ہیں۔ یہی وہ نور ہے جس کی روشنی میں وہ اپنا فہم مستقیم بناتے، اس پر عمل کرتے اور اسی میں چلتے ہیں۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

شکوت إلی وکیع سوء حفظی فأوصانی إلی ترک المعاصی

فقال العلم نور من إله ونور الله لا یهدی لعاصی

ترجمہ: میں نے وکیع سے اپنے برے حافظے کی شکایت کی تو انہوں نے مجھے معاصی ترک کرنے کی نصیحت فرمائی۔ انہوں نے فرمایا کہ علم ایک خداداد نور ہوتا ہے اور یہ نور اللہ کے نافرمانوں کو نصیب نہیں ہوا کرتا۔

دین، نام ہے قرآن و سنت رسول ﷺ کا۔ ان سے مسائل کا معلوم کرنا اور ان کا صحیح فہم حاصل کرنا فقہ کہلاتا ہے۔ یہ مسائل جنہیں احکام شرعی بھی کہا جاتا ہے ان کا علم یا تو ہمیں براہ راست قرآن و سنت رسولؐ سے حاصل ہو جاتا ہے یا پھر فقہاء و محدثین اور علماء کی علمی بصیرت سے۔ دوسرے لفظوں میں قرآن و سنت رسولؐ میں جو بالغ، عاقل، مسلم مرد و عورت سے متعلق احکام ہیں، خواہ وہ واضح ہوں یا غیر واضح، انہیں دین کے معروف قاعدوں کی روشنی میں ترتیب و تفصیل سے پیش کرنا بھی فقہ کہلاتا ہے۔ جو مسائل شریعت میں واضح ہیں اور صحیح احادیث سے ثابت بھی ہیں ان کا فہم بھی فقہ کہلاتا ہے مثلاً وضو کا صحیح طریقہ جاننا اور نماز کو سنت کے مطابق پڑھنا۔ ان میں نہ تو کسی عالم یا فقیہ و محدث کے اجتہاد و استنباط کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ ہی کسی مسلکی فقہ کی۔

رہے وہ نئے مسائل، جو شریعت میں غیر واضح ہیں اس سلسلے میں علماء و فقہاء کی کاوشوں کے نتائج کو بھی فقہ کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ وہ ان مسائل کے حل کے لئے کتاب و سنت سے ہی علت (Effective Cause) تلاش کرتے ہیں اور اس کی گہرائی تک جاتے ہیں اور جہاں جہاں وہ علت پاتے ہیں انہیں صحیح دلائل کے ساتھ بیان کر کے حکم بتا دیتے ہیں۔ فقہاء کرام کے ان فیصلوں یا فتاویٰ میں یہ اختلاف بھی ہو سکتا ہے کہ جناب رسالت مآب ﷺ کے کون سے افعال شرعی کہلائے جائیں گے اور کون سے غیر شرعی۔ اس لئے فقیہ یا مجتہد کے فیصلوں کا نفاذ نہیں بلکہ اطلاق ہوتا ہے۔ یہی اسلامی فقہ کہلاتی ہے۔

اسلامی فقہ کی اہمیت و ضرورت

کسی شخص کے مسلمان ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ شریعت کا ایسا علم رکھتا ہے جو اسے جہالت کی زندگی سے باز رکھے گا اور وہ پورے شعور کے ساتھ زندگی کے ہر قدم اور موڑ پر ایسے کام بجالائے گا جو اسے ایک مسلمان ظاہر کریں۔ وہ اللہ کے دیئے ہوئے علم کے مطابق یہ ضرور سوچے گا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اس میں جائز کیا ہے اور ناجائز کیا؟ حلال کیا ہے اور حرام کیا؟ وہ محض ظن و تخمین کی بنیاد پر اپنی دینی زندگی کی عمارت نہیں اٹھاتا بلکہ شعوری طور پر ہر عمل کو بجالاتے وقت وہ دین سے اس کا حکم دریافت کرتا ہے کہ ایک عاقل، بالغ مسلمان مرد و عورت، آزاد یا غلام کو از روئے شریعت، اپنی عبادات اور اپنے معاملات کی ادائیگی کس طرح کرنی ہے؟ کیونکہ جیتے جی ان کی ادائیگی بہر حال ضروری ہے اور ان سب کا سیکھنا بھی ضروری ہے۔ یوں مسلمان سے فقہ اسلامی قریب تر ہوتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَآفَّةً فَلَوْلَا
نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَ
لِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ
يَحْذَرُونَ﴾ (التوبة: 122)

اہل ایمان کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ سب کے
سب جہاد کیلئے نکل کھڑے ہوں بلکہ مسلمانوں کی ہر
بستی و طبقہ میں سے کیوں نہیں ایک جماعت نکلتی جو
دین میں تفقہ حاصل کرے۔ اور جب وہ واپس پلٹے
تو اپنی قوم کو ڈرائے شاید کہ وہ بچے۔

اس آیت کو بغور پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے دو گروپ بنائے ہیں ایک پر جہاد فی سبیل اللہ واجب کیا اور دوسرے پر تفقہ فی
الدین۔ تاکہ سب مومن جہاد میں شامل ہو کر شریعت کے علم کو ختم نہ کر بیٹھیں اور نہ ہی یہ چاہا کہ سب تفقہ فی الدین میں ایسے لگ جائیں کہ کفار، مسلمانوں پر
غلبہ حاصل کر لیں۔ اس طرح اسلام کی عظمت و شان کی نگرانی مجاہدین سے کروائی اور شریعت کی علمی و عملی حفاظت اس کے طلبہ سے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ نزول قرآن مجید کے وقت یا تو قرآن کو دین کہا گیا ہے یا رسول اکرم ﷺ کی احادیث طیبہ کو۔ لہذا اس آیت میں لفظ فقہ سے مراد
قرآن و حدیث کا علم ہے۔ کیونکہ رسول اکرم ﷺ کی ذات گرامی ہی تھی جو دین نبی کا ایک منبع و مصدر تھی۔ رہا انذار، تو اسے آپ ﷺ یا تو قرآن کریم
سے کرتے یا حدیث مبارک سے۔ اس لئے مجتہد کے لئے قرآن کے ساتھ حدیث کا علم ہونا بھی شرط ہے۔ یہی فقہ اور تفقہ دین کو مطلوب ہوتا ہے۔ ہادی
برحق ﷺ نے اپنی حدیث مبارک کو فقہ کا نام دیا۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔

رب حامل فقه غیر فقیہ، ورب حامل فقه
إلی من هو أفقه منه.

بہت سے فقہ کے حامل غیر فقیہ یعنی نا سمجھ ہوتے ہیں۔
اور کچھ ایسے بھی جو فقہ کو ایسے شخص کو منتقل کر دیتے ہیں
جو اس حامل سے بھی زیادہ فقیہ اور سمجھ دار ہوتے
ہیں۔

جناب رسالت مآب ﷺ کا اس فہم کی فضیلت کے بارے میں بھی ارشاد ہے:

﴿من یرد اللہ بہ خیراً یفقہہ فی الدین﴾

(المعجم الصغیر: 810)

جس سے اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ کرنا چاہیں اسے
دین کا صحیح فہم عطا کر دیتے ہیں۔

نیز آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

یأیہا الناس: إنما العلم بالتعلم، والفقه
بالتفقه، ومن یرد اللہ بہ خیراً یفقہہ فی
الدین، وإنما یخشی اللہ من عبادہ العلماء،
ولن تزال أمة من أمتی علی الحق ظاہرین
علی الناس لا یسالون من خالفهم، ولا من
ناوأمهم حتی یأتی أمر اللہ وہم ظاہرون.

(الفقیہ والمتفقہ 1، 79)

لوگو! علم سیکھنے سکھانے کا نام ہے اور فقہ دین کی گہری
سمجھ کا، جس سے اللہ تعالیٰ خیر و بھلائی چاہتے ہوں
اسے پھر دین کا گہرا فہم عطا کر دیتے ہیں، بلاشبہ اللہ
کے بندوں میں علماء ہی ہیں جو اس کا ڈر رکھتے ہیں،
میری امت میں ایک گروہ دیگر لوگوں پر حق کی بنیاد پر
غالب رہے گا جو ان کی مخالفت کرے گا انہیں اس کی
پروا نہیں ہوگی اور نہ ہی ان کی جو ان کے ساتھ دشمنی
کرے گا یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آ جائے گا اور وہ
کا میاب و کامران ہوں گے۔

ایک اور صحیح حدیث میں ہے:

طلب العلم فريضة على كل مسلم۔ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

امام عبداللہ بن المبارکؒ اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: آدمی کے پاس اگر مال نہیں تو اس کے لئے زکوٰۃ کا علم سیکھنا واجب نہیں۔ اور اگر اس کے پاس دو سو درہم آجائیں تو زکوٰۃ کے مسائل کا فہم اس کے لئے از بس ضروری ہے تاکہ اسے علم ہو کہ زکوٰۃ کتنی مقدار میں نکالے، کب نکالے؟ اور کسے دے وغیرہ۔ وہ تاجر حضرات سے اکثر فرمایا کرتے: بھلے لوگو! تجارت سے قبل خرید و فروخت کے شرعی مسائل۔۔ اسلامی فقہ۔۔ کو ضرور سیکھ لو۔ لاعلمی کی وجہ سے کہیں ایسا نہ ہو کہ سود میں پھنستے ہی چلے جاؤ۔

امام ضحاکؒ اس آیت ﴿...بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ﴾ آل عمران: 79 کی تفسیر میں فرمایا کرتے: یہی تو وہ مجالس ہیں جن میں دین کا گہرا علم یعنی فقہ لوگ حاصل کرتے ہیں۔
امام عطاء بن رباحؒ انحراسانی فرمایا کرتے تھے:

مجالس الذکر: ہی مجالس الحلال	ذکر کی مجالس دراصل حلال و حرام کی مجلسیں ہوا کرتی
والحرام کیف تشتري وتبيع، وتصلی	ہیں یعنی تم کیسے خریدو اور کیسے پیچو، کیسے نماز پڑھو اور
وتصوم، وتنكح وتطلق، وتحج وأشباه هذا.	کیسے روزے رکھو، کیسے شادی کرو اور کیسے طلاق دو اور
	کیسے تم حج کرو وغیرہ۔

یہی وہ حلقے ہیں جنہیں جنت کے باغات کہا گیا ہے نہ کہ جھوٹے قصے، کہانیوں اور من گھڑت اعمال کی مجالس کو۔

خصوصیات: فقہ اسلامی کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر دور میں فرد اور معاشرے کی ضرورت پورا کرتی ہے۔ یہ کسی خاص دور میں کسی خاص فہم و فکر کی محتاج نہیں رہی بلکہ مسائل کے حل کے لئے اس نے خود ہی راہیں نکالی ہیں۔ اسی لئے تو یہ تابدار رہنے والی ہے۔ زمانہ ماضی کی طرح مستقبل کے پیش آمدہ حالات و واقعات میں بھی اس کا کردار اہم ہوگا۔ امام مہدی کا ظہور ہو یا سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہو ان کی حیات کا بھی ہر لمحہ اسی سے وابستہ ہے جب کہ باقی فقہیں عنقا ہوئیں اور ہو رہی ہیں۔ اس کا ہر پہلو ہماری زندگی کے ذاتی، اجتماعی اور معاشرتی حالات پر محیط ہے۔

فقہ اسلامی میں جہاں ذاتی زندگی کے بے شمار مسائل و آداب زندگی معلوم ہوتے ہیں۔ وہاں عبادات کی تفصیل بھی موجود ہیں۔ معاملات زندگی پر بھی سیر حاصل مباحث ہیں۔ مثلاً: رشتوں کا تقدس، وراثت کے مسائل، طلاق ہو یا شادی و نکاح، تجارت ہو یا معیشت، قانون ہو یا دستور، نماز ہو یا عبادات کے دیگر پہلو، سبھی کے بارے میں اسلامی فقہ ہماری راہنمائی کرتی ہے۔ اس پر عمل کی شرائط میں اقرار عبودیت، اظہار خشوع اور اتباع رسول کو غیر معمولی حیثیت حاصل ہے۔

یہ فقہی مسائل دلائل سے پر ہیں۔ بغیر دلیل کے کسی فقیہ و محدث نے نہ کوئی فقہی مسئلہ بتایا اور نہ ہی اسے قبول کرنے یا ان کے نام سے مسئلہ بتانے کی اجازت دی۔ قرآن و سنت ہی چونکہ اسلامی فقہ کی اساس ہیں اس لئے ہر فقہی مسئلہ ٹھوس اور صحیح حدیث کی دلیل سے آراستہ ہوگا۔ ان پر عمل کیلئے یا انہیں سمجھنے کیلئے "فقہ" کی ضرورت ہوتی ہے اور فقہی مسئلہ پر عمل کے لئے یا اسے جاننے کے لئے قرآن و سنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ گویا یہ دونوں ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم ہیں۔ فقہ بغیر قرآن و سنت رسولؐ کے سمجھ نہیں آسکتی۔ اور نہ ہی قرآن و سنت بغیر فقہ کے سمجھے جاسکتے ہیں۔ اس لئے قرآن و سنت کے دونوں مآخذ کو اگر سمجھ لیا جائے تو پھر باقی مآخذ جاننا اور پرکھنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس فقہی علم سے مسلمان تمام معاملات میں امتیاز کو پہچان جاتا ہے اور آخرت سنوارنے کے لئے شعوری اور ارتقائی زندگی کو اپنا لائحہ عمل بناتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ قدیم و جدید مسائل کی صورت میں اہل علم سے رجوع کیا جائے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ... فَسْئَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۴۳﴾ النحل: 43۔ اہل علم سے سوال کیا کرو اگر تمہیں علم نہ ہو۔ اس آیت میں اہل علم عام لفظ ہے کوئی مخصوص عالم یا فقیہ اس سے مراد نہیں۔

لفظ فقہ کا معنی و مفہوم:

اہل لغت نے اس لفظ کے معنی ادراک، فہم، فطنت اور علم بیان کئے ہیں۔ مگر اکثر اہل لغت نے فقہ سے مراد فہم مطلق لیا ہے۔ دقیق اور گہرے فہم کا مفہوم ان کے ہاں نہیں ملتا۔

ابن منظور نے لسان العرب میں اس کی تعریف یہ کی ہے:

الفقه: العلم بالشیء والفہم لہ. وغلب علی علم الدین لسیادته و شرفه و فضله علی سائر أنواع العلوم کما غلب النجم علی الشریا.

ابن فارس کہتے ہیں:

کل علم بشیء فہو فقہ، ثم اختص بذلک علم الشریعة فقیل لکل عالم بالحلال والحرام فقیہ.

نحو کے امام، ثعلب، احمد بن یحییٰ نحوی کہتے ہیں: آدمی کی سمجھ کے بارے میں درج ذیل الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں مثلاً جب وہ علم میں کامل ہو جائے تو: فقہ کہا جاتا ہے اور اگر معمولی سمجھ ہو جھڑکتا ہو تو فقہ کہہ دیا کرتے ہیں۔

امام ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں لفظ فقہ کے معنی میں فرق کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: فقہ: قاف کے ضمہ کے ساتھ اگر یہ لفظ ہو تو وہ فقہ و فہم مراد ہے جو آدمی کے مزاج اور طبیعت میں رچ بس جائے۔ فقہ یعنی کسرہ کے ساتھ ہو اس سے مراد سمجھ ہے۔ اور اگر فقہ زبر سے ہو تو مراد فہم میں سبقت لے جانا ہے۔

اہل لغت کی ان متعدد تعبیرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ فقہ کسی خاص فن یا خاص فکر کا نام نہیں بلکہ اپنے متعدد معانی اور مفاہیم کی وجہ سے ہر علم کے فہم کو فقہ کہا جاسکتا ہے۔ جس کے مختلف نام و مراتب ہو سکتے ہیں۔

بعض مستشرقین کی یہ رائے ہے کہ لفظ فقہ رومی زبان کے لفظ (juris) سے ماخوذ ہے۔ یہ رائے درست نہیں۔ اس لئے کہ اولاً یہ لفظ قرآن مجید میں مستعمل ہے جو کسی زبان سے مستعار الفاظ کی بیساکھیوں پر نہیں لکھا گیا بلکہ وہ اللہ کا کلام ہے دوسرا یہ کہ لفظ فقہ اور (juris) کے نطق میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ عربوں کو کیا پڑی تھی کہ لفظ عوب کی وہ توہین کرتے؟

لفظ فقہ، قرآن مجید میں:

قرآن مجید میں لفظ فقہ کا استعمال فہم کے معنی میں ہے:

قَالُوا يَا شُعَيْبُ مَا نَفَقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ... ﴿۹۱﴾ (ہود: 91)

وہ کہنے لگے اے شعیب! بہت سی باتیں جو تم کہتے ہو ہم نہیں سمجھتے۔

اسی طرح یہ ارشاد ہے:

...وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ... (الاسراء: 41)

اور کوئی شے نہیں جو اللہ کی تسبیح نہ کرتی ہو۔ مگر تم انسانو! ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔

موسیٰ علیہ السلام کی دُعا کا ذکر فرمایا:

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِي ۖ يَفْقَهُوا قَوْلِي ۝ (طہ: 27-28)

اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ وہ میری بات سمجھیں۔

لفظ فقہ حدیث میں: احادیث میں بھی اس لفظ کے تقریباً یہی معنی ملتے ہیں۔ مسند احمد میں ہے:

کان کلام النبی ﷺ فصلاً، يفقهه كل أحد، لم يكن يسرد سرداً.

آپ ﷺ کے کلمات بالکل الگ الگ ہوتے تھے جنہیں ہر کوئی سمجھ لیتا تھا۔ گفتگو لگا تار اور پے در پے نہیں ہوا کرتی تھی۔

اہل نجد کا وہ شخص جو بکھرے بالوں کے ساتھ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ صحابہ اُس کے بارے میں کہتے ہیں۔

نسمع دوی صوتہ ولا نفقه ما يقول.

ہم اس کی آواز کی گنگناہٹ تو سنتے تھے مگر سمجھ نہیں پاتے تھے کہ وہ کہہ کیا رہا ہے۔ (صحیح بخاری)

شرع میں: فقہاء و علماء نے اپنے فہم کے مطابق فقہ کی متعدد اصطلاحی تعریفات کی ہیں۔ چند کا ہم ذکر کرتے ہیں:

پہلا معنی: علماء و فقہاء کے اختلاف کو فقہ کہتے ہیں۔ ہشام بن عبد اللہ فرماتے ہیں۔

من لم يعرف اختلاف الفقهاء فليس بفقیه.

جو علماء کے اختلاف کو نہیں جانتا وہ فقیہ ہی نہیں۔

امام قتادہ بن دعامہ فرماتے ہیں:

من لم يعلم الاختلاف لم يشم الفقه بأفقه.

جس نے علماء کے اختلاف کو نہیں جانا اس نے فقہ کو سونگھا ہی نہیں۔

امام مالکؒ سے دریافت کیا گیا۔ کیا علماء کے اختلاف سے اہل الرائے کا اختلاف مراد ہے؟ فرمایا: نہیں بلکہ صحابہ کے اختلاف، ناسخ و منسوخ اور مختلف الحدیث مراد ہیں۔ (جامع بیان العلم: 345)

ایک اور موقع پر ارشاد فرماتے ہیں: فتویٰ دینے کا مجاز صرف وہی شخص ہے جو اختلافی مسائل سے آگاہ ہو۔ الموافقات ۱۶۰۴

دوسرا معنی: فقہ سے مراد فہم قرآن ہے۔ حارث بن یعقوب کہتے ہیں:

إن الفقيه كل الفقيه من فقه في القرآن وعرف مكيدة الشيطان.

اصل فقیہ وہی ہے جو قرآن کو سمجھے اور شیطانی چالوں کو جانے۔

سیدنا ابوالدرداء کا قول ہے:

لن تفقه كل الفقه حتى ترى للقرآن وجوها كثيرة، (جامع بیان العلم: 343)

تم کبھی فقہ نہیں سمجھ سکتے جب تک قرآن کی کسی آیت یا سورۃ کی بہت سی وجوہ نہ دیکھ لو۔

تیسرا معنی: فقہ سے مراد حکمت، اور اللہ تعالیٰ کے دین پر عمل ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ
وَالْحِكْمَةِ... ﴿ (الاحزاب: 34)

امام مالکؒ اس آیت کے بارے میں فرماتے ہیں: حکمت سے مراد سراسر اللہ تعالیٰ کی اطاعت، حکمت کی اتباع اور دین الہی میں تفقہ اور عمل کا نام ہے۔
چوتھا معنی: قرآن و حدیث کا صحیح علم ہے۔ رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

رب حامل فقه غیر فقیہ، ورب حامل فقهہ الی
من ہو أفقہ منه۔
بہت سے فقہ کے حامل غیر فقیہ یعنی نا سمجھ ہوتے ہیں۔
اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو فقہ کو ایسے شخص کو منتقل
کر دیتے ہیں جو اس حامل سے بھی زیادہ فقیہ اور سمجھ
دار ہوتے ہیں۔

امام ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں: فسمی الحدیث فقہا مطلقا وعلماء۔ آپ ﷺ نے خود اپنی حدیث کو صرف فقہ اور علم سے تعبیر کیا ہے۔ جس سے مراد
الفاظ و معانی کا خیال ہے۔
أبو إسحاق الحونئی کہتے ہیں:

العلوم ثلاثة: علم دنیاوی، وعلم دنیاوی
وأخروی، وعلم لا للدنیا ولا للدين، فعلم
الذى للدنیا علم الطب والنجوم وما أشبه
ذلك، والعلم الذى للدنیا والآخرة علم
القرآن والسنن والفقه فيهما، والعلم الذى
ليس للدنیا ولا للآخرة علم الشعر والشغل
به۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں:

ليس الفقه بكثرة المسائل، ولكن الفقه
يؤتیه من يشاء فى خلقه..
(جامع بيان العلم: 344)
یعنی فقہ زیادہ مسائل جاننے کا نام نہیں بلکہ فقہ اللہ کی
عطاء ہے جسے وہ چاہتا ہے اپنی مخلوق میں اسے عطا
کر دیتا ہے۔

ابن عبدالبرؒ نے اپنی کتاب جامع بيان العلم میں فقہ، علم اور رائے سے متعلق بے حد مفید مواد جمع کیا ہے۔ جس سے مزید فقہ کے مفاہیم کو سمجھا جاسکتا ہے۔
پانچواں معنی: نفس کی مفید یا مضر باتوں کا علم، یعنی علم الکلام یا اعتقاد وغیرہ بھی فقہ کہلاتے ہیں۔ یونانی علوم کی اشاعت کے بعد جب متکلمین نے مناظروں
کا آغاز کیا اور تاویلات کی گرم بازاری ہوئی تو علم الکلام (یعنی اعتقاد، وجوب ایمان، اخلاق و تصوف اور اعمال) کو بھی فقہ سے تعبیر کیا گیا۔ الفقہ الأكبر جو
امام ابو حنیفہؒ کی طرف منسوب کتاب ہے۔ اس میں فقہ کا معنی یہ کیا گیا ہے:

الفقه: معرفة النفس مالها وما عليها۔
یعنی نفس کی ذمہ داریوں کے سمجھنے کا نام فقہ ہے۔

یہ تعریف امام محترمؒ کے زمانہ میں بہت ہی مناسب تھی۔ کیونکہ ان کے دور میں فقہ، علوم شرعیہ سے الگ کوئی مستقل علم (Science) نہیں تھا۔ الفقہ

چھٹا معنی: علم دین ہے۔ بہت سی احادیث میں لفظ فقہ بمعنی علم دین مستعمل ہوا ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الناس معادن، خيارهم في الجاهلية خيارهم
لوگ کانوں کی مانند ہوا کرتے ہیں۔ جاہلیت میں ان
فی الإسلام إذا فقهوا. (صحیح بخاری)
کا بہترین انسان اسلام قبول کرنے کے بعد بھی
بہترین شمار ہوگا بشرطیکہ وہ دین کا گہرا فہم پالیں۔

صحیح بخاری (4390) میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد بھی مروی ہے جو آپ ﷺ نے اہل یمن کے بارے میں فرمایا:

أتاكم أهل اليمن أضعف قلوباً وأرق أفئدة،
مسلمانو! تمہارے پاس یمنی آئے ہیں جو بہت نرم
الفقه يمان والحكمة يمانية.
دل اور رقیق القلب لوگ ہیں، فقہ یمنی ہی ہے اور
حکمت بھی یمنی۔

بعض علماء نے دیگر احادیث کو سامنے رکھ کے فقہ سے مراد یہاں حکمت، علم و فہم دین اور سمجھ داری بھی لی ہے۔ جیسا کہ امام بدر الدین العینیؒ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں۔ حدیث میں فقہ سے مراد دین کا گہرا فہم ہے۔

اس مفہوم میں یہ مثال بطور ایک دلیل کے دی جاسکتی ہے کہ امام شافعیؒ کو قرآن مجید میں سے اجماع کی حجیت (producing the necessary proof/authority to validate a rule or concept) چاہئے تھی۔ اس نیت سے انہوں نے قرآن مجید کو تین سو بار بغور پڑھا مگر کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ پھر کوشش فرمائی تو اس بار انہیں قرآن مجید کی ایک آیت میں اجماع کی حجیت کی دلیل سو جھگئی جو سورۃ النساء کی درج ذیل آیت تھی:

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ
الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا
تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَ ثَمَرًا مَصِيرًا ﴿١١٥﴾
جو ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ
کی نافرمانی کرے گا اور اہل ایمان کے راستے کے
علاوہ کی پیروی کرے گا تو ہم بھی جدھر وہ مڑتا ہے
اسے موڑیں گے اور اسے جہنم پہنچا کر ہی چھوڑیں گے
(النساء: 115)

وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

امام شافعیؒ کو دلیل یہ سو جھی کہ اس آیت میں سبیل المؤمنین سے مراد اجماع ہے یعنی اہل ایمان نے کوئی راستہ بالاتفاق اپنایا ہوا ہے مگر کچھ لوگ یا فردوا حداس راستہ یا طریقہ کو چھوڑ کر کوئی اور طریقہ یا راستہ اپنالیتے ہیں وہ گویا اجماع سے ہٹا ہوا راستہ ہے۔ مثلاً عصر کی چار رکعتیں مسلمانوں پر فرض ہیں۔ اب اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ وہ چار رکعت نہیں بلکہ تین یا پانچ رکعتیں پڑھے گا تو یہ اجماع سے ہٹا ہوا راستہ ہے۔ یہ معلوم بھی ہوا کہ اجماع کی دلیل کے لئے نص (Text) کا ہونا ضروری ہے۔ امام شافعیؒ کو اجماع کی دلیل کا سو جھنا ہی فقہ ہے۔

مندرجہ بالا معانی سے یہ نتائج سامنے آتے ہیں کہ فقہ محض مسلکی مسائل یا ایک ہی امام و عالم کی محدود اجتہادی کوششوں کا نام نہیں۔ بلکہ فقہ اختلاف علم و علماء و فقہاء، دینی حکمت، اور اللہ تعالیٰ کے دین پر عمل اور نفس کی مفید یا مضر باتوں کا علم، یعنی علم الکلام یا عقائد وغیرہ سبھی کو محیط ہے۔ قرآن و حدیث کے فہم و علم کا نام بھی فقہ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے امت کے بیشتر علماء کو عطا کیا ہے۔ جس میں حفظ مسائل ہوتا ہے اور اجتہاد و استنباط وغیرہ بھی۔ اسی طرح مذاہب اربعہ ہوں یا خمسہ، جن ائمہ کے نام سے یہ مذاہب ایجاد ہوئے ان کے بانی فقہاء کی علمی، دینی اور اجتہادی کاوشیں بھی فقہ کہلائی جاسکتی ہیں۔ اور دیگر علماء و فقہاء کی بھی جو ان کے بعد آئے اور جنہوں نے اپنے دور کے اٹھتے مسائل کا حل قرآن و حدیث کی فہم و فراست سے پیش کیا۔

مفہوم فقہ میں تغیر: فقہ کا مفہوم و معنی ابتداء میں فقہاء و علماء کے ہاں کیا تھا اور بتدریج اس کا مفہوم کس طرح تغیر پذیر ہوا؟ ذیل میں ہم دو عظیم المرتبت

فقہاء، دانشور اور مفکر حضرات کے اقتباسات نقل کرتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہی ذوق اور اس کے مفہوم میں محدودیت اور بتدریج تبدیلی کی لہر کیسے آئی؟ مسلم الثبوت کے مصنف اپنی کتاب میں فرماتے ہیں:

اعلم أن الفقه في القديم كان متناولا لعلم الحقيقة هي علم الإلهيات وعلم الطريقة وهي مباحث المهلكات والمنجيات وعلم الشريعة الطاهرة، ومن ثم عرفه أبو حنيفة: بمعرفة النفس ما لها وما عليها: وسمى كتابه في العقائد بالفقه الأكبر... ثم لما تصدى قوم بالبحث عن العقائد... ثم حدث في زمان لاحق اختصاص الفقه بالأحكام الظاهرة ومن ثم تری کتب الفقه للمتأخرين خالية من علم الطريقة..

یعنی فقہ کا لفظ ابتداء میں شریعت مطہرہ کے علم پر بولا جاتا تھا۔ جن میں مہلکات اور منجیات سرفہرست تھیں۔ اسی لئے امام ابو حنیفہؒ نے فقہ کی تعریف یہ فرمائی: یہ نفس کی ذمہ داریوں کا نام ہے۔ اور عقائد میں لکھی گئی اپنی کتاب کا نام بھی انہوں نے الفقه الأكبر رکھا۔۔۔ علم کلام کے بعد یہ لفظ تصوف اور اخلاق پر بھی بولا جانے لگا اسی لئے ریا اور حسد کی حرمت کو فقہ کہا گیا ہے۔ مدت تک یہی عرف رہا۔ پھر عرصہ بعد متاخر فقہاء کی کتب میں فقہ الفروع تو آ گیا مگر علم طریقت سے وہ خالی ہو گئیں۔ مسلم

منہیہ: ۵

امام غزالیؒ بھی اس سلسلے میں اپنی منفرد رائے رکھتے ہیں اور جسے خاصا سراہا گیا ہے۔ یہ رائے انہوں نے اپنی معروف کتاب احیاء علوم الدین ۲۴۱/۱ میں دی ہے اور جس کا تذکرہ کاتب چلبی نے کشف الظنون ۹۱/۲ میں اور طاش کبریٰ زادہ نے مفتاح السعادة ۶۱/۲ میں بغیر کسی تنقید کے کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

اعلم أن منشأ التباس العلوم المذمومة بالعلوم الشرعية تحريف الأسماء المحمودة، وتبديلها ونقلها بالأغراض الفاسدة إلى معان غير ما أراد السلف الصالح والقرون الأولى، وهي خمسة ألفاظ: الفقه، والعلم، والتوحيد، والتذكير، والحكمة. فهذه أسماء محمودة والمتصفون بها أرباب المناصب في الدين ولكن تقلب الآن إلى معان مذمومة فصارت القلوب تنفر عن مذمة من يتصف بمعانيها لشيوع إطلاق هذه المعاني عليهم. اللفظ الأول الفقه: فقد تصرفوا فيه بالتخصيص لا بالنقل والتحويل، إذ خصوه بمعرفة الفروع الغريبة في الفتاوى والوقوف على دقائق عللها واستكثار الكلام فيها، فمن كان أشد تعمقا فيها وأكثر اشتغالا بها يقال ... هو الأفقه. لقد كان اسم الفقه في العصر الأول عن علم طريق الآخرة وما يحصل به الإنذار والتخويف. هو هذا الفقه دون تفریع الطلاق والعناق واللعان والسلم والإجارة، فذلك لا يحصل به إنذار ولا تخويف بل التجرد له على الدوام يقسى القلب وينزع الخشية.

یعنی شرعی علوم میں مذموم اور ناپسندیدہ علوم کا اختلاط اور التباس اس لئے ہوا کہ علوم کے اچھے نام جو زمانہ سلف میں بولے جاتے تھے اپنی فاسد اغراض کے لئے بدل دیے گئے اور ان کو ایسے مطالب پر بولا گیا جن پر خیر قرون میں قطعاً اطلاق نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی ائمہ سلف ان الفاظ سے یہ مطالب مراد لیتے تھے۔ یہ پانچ نام ہیں: فقہ، علم، توحید، تذکیر اور حکمت۔ یہ بہت اچھے نام ہیں۔ ان کے جاننے والوں کا دین میں بڑا مقام تھا۔ لیکن اب ان کو مذموم معانی پر بولا جانے لگا ہے۔ اب ان سے اور ان کے جاننے والوں سے دل نفرت کرتا ہے کیونکہ ان ناپسندیدہ معانی پر ان کا اطلاق عام ہو گیا ہے۔ پہلا لفظ فقہ ہے جس کے مفہوم میں نقل اور تحویل کی بجائے ان لوگوں نے تخصیص پیدا کر دی ہے۔ اب فتوؤں میں لفظ فقہ، غیر معروف اور حیرت انگیز فروع پر بولا جاتا ہے۔ اس پر طویل گفتگو اور بال کی کھال اتارنے اور ان کے علل اور وجوہ میں تعمق کا نام فقہ رکھ دیا گیا ہے۔ جو ان میں زیادہ وقت ضائع کرے اسے أفقه کہا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ لفظ خیر القرون میں نفس کے امراض کی پہچان اور علوم آخرت کی معرفت پر بولا جاتا تھا۔ اور آیت قرآنی سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ دین کے فہم سے جو انداز اور خوف پیدا ہوتا ہے اسے فقہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ طلاق، عناق، لعان، سلم، اجارہ وغیرہ مسائل کے جاننے سے نہ انداز ہوتا ہے اور نہ خوف۔ بلکہ ایسے مسائل میں مشغولیت کی وجہ سے دل مزید سخت ہو جاتا ہے۔

فقہ کی ایک جامع تعریف: ہمارے دور کے علماء نے علم فقہ کی تعریف یوں کی ہے۔

علم الفقہ : هو العلم بالأحكام الشرعية الفرعية المتعلقة بأفعال العباد، في عباداتهم، ومعاملاتهم، وعلاقاتهم الأسرية، وجنایاتهم، والعلاقات بين المسلمين بعضهم وبعض، وبينهم وبين غيرهم، في السلم والحرب، وغير ذلك. والحكم على تلك الأفعال بأنها واجبة، أو محرمة، أو مندوبة، أو مكروهة، أو مباحة، وأنها صحيحة، أو فاسدة أو غير ذلك، بناء على الأدلة التفصيلية الواردة في الكتاب والسنة وسائر الأدلة المعتبرة.

علم فقہ، شریعت کے ان فردی احکام کے علم کا نام ہے جن کا تعلق بندوں کے افعال سے ہو مثلاً ان کی عبادات و معاملات، انکے خاندانی تعلقات، دین کے حق میں ان کی زیادتیاں، زمانہ امن و جنگ میں مسلمانوں کے اپنوں اور غیروں سے تعلقات وغیرہ۔ پھر ان افعال کے بارے میں اس حکم کا علم کہ یہ واجب ہیں یا حرام، مندوب ہیں یا مکروہ یا مباح یا یہ کہ وہ صحیح ہیں یا غلط و فاسد وغیرہ۔ اس علم کی اٹھان ان تفصیلی دلائل پر ہی ہوگی جو کتاب و سنت اور دیگر معتبر دلائل سے ماخوذ ہوں۔

چند الفاظ کی وضاحت: درج بالا تعریف میں علم سے مراد ذات، صفات اور افعال کا علم ہے۔ علم دو قسم کے ہوتے ہیں۔ یقینی اور ظنی۔ یقینی علم نصوص کا ہے اور ظنی علم اجتہاد کا۔ احکام شرعیہ: حکم کی جمع احکام ہے اس کی تعریف آگے آرہی ہے۔ شرعیہ سے مراد وہ احکام ہیں جو شرعی ہوں یعنی جو قرآن مجید و سنت رسول ﷺ سے ماخوذ ہوں۔ ورنہ وہ شرعی احکام نہیں کہلائیں گے۔ فقیہ کا یہ فرض ہے کہ اپنے فکرو تامل اور قوت استدلال کے ذریعے احکام اور ان کے دلائل میں اس منطقی ارتباط کو سمجھے جو دونوں میں موجود ہے۔ متاخرین کی یہ تعریف کتاب و سنت میں وارد لفظ فقہ کے مفہوم کی مقابلے میں بہت محدود ہے کیونکہ کتاب و سنت میں لفظ فقہ شریعت و عقیدے دونوں کو شامل ہے جن میں حقوق اللہ کی معرفت، اللہ کی وحدانیت اور اس کا تمام نقائص سے پاک ہونے کا اقرار، اس کی خشیت اور انبیاء و رسل کی معرفت جہاں شامل ہے وہاں اخلاق و آداب کا علم اور سچی بندگی کے لئے محض اللہ تعالیٰ ہی کے لئے قیام وغیرہ بھی شامل ہیں۔

فقہ کا موضوع: مکلف لوگوں کے افعال کی حقیقت کو جاننے کے لئے کتاب و سنت کو اس حد تک سمجھنا ہے کہ جیسے نماز قائم کرنا یا چھوڑنا ہے یا جیسے غصب کرنا یا اس میں اختیار دیا گیا ہے، جیسے کھانا۔ یا یہ حلال ہے اور یہ حرام، فرض ہے یا سنت، مستحب ہے یا مکروہ۔ یہی فقہ کا موضوع ہے۔ ہر مسلک کے فقہاء کرام کے نزدیک فقہ ایک خاص موضوع رکھتا ہے اور اپنے خاص اصول بھی۔ یہی وہ علم ہے جو ہمیں واضح کرتا ہے کہ دن رات میں پانچ نمازیں ہم پر فرض ہیں اور نماز کی شرائط میں اہلیت کا ہونا اور دخول وقت کا ہونا بھی اس میں شامل ہے۔ فقہ ہمیں اس سے بھی آگاہ کرتا ہے کہ اگر نماز میں بات کی جائے یا وضوء ٹوٹ جائے تو نماز جاتی رہتی ہے۔ اسی طرح یہی علم فقہ ہمیں باخبر کرتا ہے کہ خنزیر کا گوشت، اس کی چربی یا اس کا کوئی جزو کھانا حرام ہے وغیرہ وغیرہ۔

چند مسائل فقہ: ذیل میں قرآن و سنت سے ماخوذ چند فقہی مسائل بیان کئے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ فقہ کیا ہے۔ مسائل اور ان کے احکام کس طرح بیان کئے جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ
فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ
وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى
الكَعْبَيْنِ... المائدة: 6

اے اہل ایمان! جب تم نماز پڑھنے کے لئے کھڑے
ہونے کا ارادہ کرو تو اپنے چہروں کو دھولیا کرو اور اپنے
ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھولیا کرو۔ پھر اپنے سر کا مسح کرو
اور اپنے پاؤں ٹخنوں سمیت دھولیا کرو۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ نماز کا آغاز کھڑے ہونے سے ہوتا ہے۔ اس سے قبل وضوء کا کرنا۔ وضوء میں چہرہ دھونا۔ ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھونا۔ سر کا مسح کرنا۔ پاؤں ٹخنوں سمیت دھونا۔ بھی واضح کیا گیا ہے۔

یہ احکامات قرآن مجید میں ہیں۔ مگر کیا ان سے پہلے یا بعد میں یا مختلف صورت حال میں وضوء میں بھی کچھ کرنے یا نہ کرنے کی اجازت ہے؟ اس کی مزید وضاحت ہمیں قرآن مجید کی بجائے حدیث رسول ﷺ سے ملے گی۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے شاگردوں کو رسول اکرم ﷺ کے وضوء کرنے کا وہ عمل بتایا جو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ روایت میں آتا ہے:

أنه دعا بوضوء فتوضأ، فغسل كفيه ثلاث مرات
ثم مضمض واستنثر ثم غسل وجهه ثلاث مرات
ثم غسل يده اليمنى إلى المرافق ثلاث مرات ثم
غسل يده اليسرى مثل ذلك، ثم مسح رأسه ثم
غسل رجله اليمنى إلى الكعبين ثلاث مرات ثم
غسل رجله اليسرى مثل ذلك ثم قال: رأيت
رسول الله ﷺ توضأ نحو وضوئي هذا (مسلم)

سیدنا عثمانؓ نے وضوء کا پانی منگوا یا، پہلے اپنی ہتھیلیاں تین
مرتبہ دھوئیں پھر کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا۔ پھر اپنا منہ
تین مرتبہ دھویا۔ اس کے بعد اپنا دایاں ہاتھ تین مرتبہ
کہنیوں سمیت دھویا اسی طرح بائیں ہاتھ کہنیوں تک تین
مرتبہ دھویا۔ پھر سر کا مسح کیا۔ مسح کے بعد اپنا دایاں پاؤں
تین مرتبہ ٹخنوں تک دھویا اور اسی طرح بائیں پاؤں ٹخنے
تک تین مرتبہ دھویا۔ پھر فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو
اسی طرح وضوء کرتے دیکھا تھا جس طرح تم نے مجھے وضوء
کرتے دیکھا ہے۔

یہ اور اس قسم کی دیگر صحیح احادیث کو سننے کی کتب سے جمع کر کے ان کے الفاظ پر غور کرنے کے بعد وضوء سے متعلق تمام مسائل و احکام کو بآسانی جانا جاسکتا ہے اور اضافی مسائل کو بھی۔ اسی کا نام فقہ ہے یعنی جس میں آپ کے پاس علم بھی آجائے اور صحیح دلائل بھی جو قرآن و سنت سے ماخوذ ہوں۔ اور اگر ضعیف و موضوع روایات کا سہارا لے کر مسائل اور ان کے احکام بیان کئے جائیں تو اولاً شرعی طور پر اس کی اجازت نہیں۔ اور اگر روایات کو بیان کرنا بھی ہے تو شرط یہ ہے کہ روایت کا ضعف وغیرہ بتا دیا جائے۔ بصورت دیگر ان روایات سے ماخوذ تمام مسائل و احکام فقہ نہیں ہوں گے اور نہ شرعاً جائز یا درست۔ مثال کے طور پر:

نماز سے پہلے اپنی زبان میں نیت کے الفاظ پڑھنا۔ وضوء کرتے وقت ہر عضو دھونے سے قبل دعاء پڑھنا۔ وضوء کے دوران گردن کا مسح کرنا۔ چوتھائی سر کا مسح کرنا وغیرہ۔ اسی طرح عورتوں کا نماز میں گھڑی کی طرح بیٹھ کر سجدہ کرنا جو حدیث کی رو سے ایک غیر پسندیدہ عمل ہے۔ یہ سب غیر فقہی، ضعیف و موضوع مسائل ہیں جنہیں فقہ کہنا درست نہیں۔

فقہ، قانون اور شریعہ

فقہ کی تعریف آپ اوپر پڑھ چکے کہ یہ مسلمان علماء و فقہاء کے ذاتی دینی یا مذہبی علم اور فہم کا نام ہے۔ اس اعتبار سے رائج فقہ کی دو قسمیں ہیں:

مذہبی فقہ: جس فقہ کا علم محض اپنے مسلک یا امام یا مجتہد کے علم و فہم پر مبنی ہو اور پھر زندگی اسی مسلک کے مسائل یا امام و مجتہد کے اقوال و اجتہاد کے گرد نہ صرف گھومتی رہے بلکہ اسی کے نام سے معروف کر دی جائے ایسی فقہ مذہبی فقہ کہلاتی ہے جو ظاہر ہے اسلام کا کلی علمی، فقہی اور استدلالی تصور پیش کرنے سے قاصر ہے۔

دینی فقہ: مذہبی فقہ کے برعکس وہ فقہ جس میں مسلکی نہیں بلکہ دین کی آفاقی مصلحت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا گیا ہو وہ خواہ کسی بھی مجتہد، امام یا فقیہ کی ہو مگر اسلام کے بیشتر اصولوں سے ہم آہنگ ہو اور قرآن و سنت رسول ﷺ ہی اس کا استدلال رہا ہو وہ دینی فقہ کہلاتی ہے۔

دونوں میں فرق: دینی فقہ میں ہر وہ اجتہاد جگہ پا گیا جو قرآن و سنت رسول ﷺ کے اصولوں کے عین مطابق تھا۔ اس لئے فقہاء صحابہ، ائمہ اربعہ یا دیگر فقہاء امت میں جس کسی کا سرمایہء افتخار قرآن و سنت رسول ﷺ رہا اس کی فقہ اپنی وسعت، قوت استدلال، اور نصوص سے وابستگی کی وجہ سے ہر دور میں امر ہو گئی اور دین نے اسے اپنے اندر جذب کر کے اسے جگہ دی۔ مگر جس نے شذوذ کی راہ اختیار کی اسے دینی تو نہیں بلکہ ایک انفرادی رائے یا مسلکی فقہ کا نام دے دیا گیا مگر پھر بھی اس کے بارے میں حسن ظن سے یہ کام لیا گیا کہ گو اس کا مخلصانہ عمل قابل ثواب ہے مگر قابل تقلید نہیں۔

قانون (KANUN)

یہ یونانی لفظ ہے جو سریانی زبان کے ذریعے عربی زبان میں آیا۔ بعض اہل لغت نے اسے رومی اور فارسی بھی قرار دیا ہے۔ قانون کا لفظ ابتداءً مسطرۃ کے معنی میں مستعمل ہوا جو لائین کھینچنے کے رولر کو کہتے ہیں۔ ابن منظور افریقی م ۱۱۷۷ھ نے لکھا ہے کہ قانون کا معنی ہے مقیاس کل شیء، یعنی یہ لفظ ہر چیز کا ٹھیک اندازہ کرنے کا آلہ کے لئے مستعمل ہوا۔ جو رفتہ رفتہ وہ عام معنی اختیار کر گیا جو ہر اہم قاعدے کے لئے بولا جاتا ہے۔ جیسے قانون فطرت اور قانون صحت کے کلمات ہیں۔

لفظ قانون کا مفہوم فقہ کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے۔ بہت سی ایسی اشیاء ہیں جن پر فقہ کا اطلاق نہیں ہوتا۔ جیسے حرکت کا قانون، کشش و جذب کا قانون وغیرہ۔ اسی طرح لفظ قانون بعض علوم کی کتابوں کیلئے نام کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جیسے: **القانون**۔ علم طب میں ابن سینا (م ۴۲۸ھ) کی کتاب اور **القانون**۔ علم ہیئت و نجوم میں ابوریحان البیرونی (م ۴۴۰ھ) کی کتاب اور **قانون الرسول**۔ فقہ و کلام میں امام غزالی (م ۵۰۵ھ) کی کتاب وغیرہ۔ گزشتہ چند صدیوں سے فقہ کی بجائے ان احکام کو جو اسلامی ممالک میں نافذ ہیں۔ قوانین کہا جانے لگا۔ جس سے مراد حکومتی قوانین کی دفعات کا مجموعہ ہے۔ جیسے قانون الحزاء العثمانی۔ سلطنت عثمانی کا قانون سزا۔ یا القانون المدنی العراقی۔ عراق کا دیوانی قانون۔ عثمانی خلافت میں یہ لفظ سرکاری احکام کیلئے اکثر استعمال ہوتا تھا۔ جنہیں حکومت خود جاری کرتی تھی۔ تاکہ یہ احکام، شرع اسلامی کے ان احکام سے علیحدہ سمجھے جائیں جو شرع کے معروف دلائل پر قائم ہیں۔ یہ فرق ملحوظ رہے تو حکومت کا قانون اگر شریعت سے متصادم ہو مثلاً سود شرعاً حرام ہے لیکن قانوناً جائز ہے۔ سمجھ آ سکتا ہے۔

لفظ قانون کا ایک اور عام معنی آئین بھی ہے۔ جسے ہم انگریزی میں قانون یا اندھا کالا قانون کہہ دیتے ہیں۔ خاص صورت میں یہ لفظ ہر اس قاعدے کیلئے بولا جاتا ہے جو معاملات عامہ کے قواعد میں سے ہو۔ جیسے کہا جاتا ہے۔ سینٹ نے غلہ کی سمگلنگ روکنے کا قانون منظور کر لیا ہے۔ آج کل یہ لفظ یورپین زبانوں میں صرف قانون کیلئے بولا جاتا ہے۔

فقہی اصولوں کیلئے بھی اس لفظ کا استعمال قدیم سے ہے۔ ابوالقاسم ابن جزئی المالکی (م ۴۱۷ھ) نے فقہ مالکی کے بارے میں ایک کتاب لکھی۔ جس کا نام

انہوں نے القوانين الفقہیہ فی تلخیص المذہب المالکیہ رکھا۔

فقہائے اسلام اپنی اصطلاح میں لفظ قانون کی بجائے شرع یا شریعت کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ جب قانون کا لفظ اس معنی میں استعمال ہو تو اس کی درج ذیل نمایاں خصوصیات ہوجاتی ہیں۔

۱۔ اس کا تعلق دنیاوی معاملات سے ہوجاتا ہے۔ عبادات سے نہیں۔ جبکہ فقہ اسلامی کے قواعد میں دین اور دنیا دونوں سے بیک وقت بحث ہوتی ہے۔

۲۔ ایسے قانون حکومت نافذ کرتی ہے۔

۳۔ جج کے فیصلے کی طرح کسی خاص معاملے یا شخص کے لئے قانون نہیں بنایا جاتا بلکہ بغیر کسی تفریق و خصوصیت کے تمام انسانوں یا انسانوں کے کسی طبقے کے لئے وضع کیا جاتا ہے۔

بعض دفعہ لفظ شریعت، قانون کے معنوں میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ مثلاً: شراعی اسلام، قوانین اسلام کے معنی میں آتا ہے۔ اسی طرح لفظ حکم، قانون شرعی کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ اور حاکم کو شارع کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

قانون سے مراد: قانون سے مراد وہ احکام ہیں جو انتظامیہ کے اعلیٰ ارکان ادنیٰ ارکان کے لئے وضع کرتے ہیں۔ یا انسان کے خارجی افعال کے متعلق وہ عام قاعدہ ہے جس کی تعمیل ملک کی مرکزی حکومت لوگوں سے کراتی ہے۔ SALMOND - اپنی کتاب Jurisprudence (ص 39) میں لکھتا ہے:

قانون اصول و قواعد کا ایسا مجموعہ ہے۔ جسے ملک کی حکومت تسلیم کر کے اس کے

ذریعے عدل و انصاف قائم کرتی ہے یا اس قانون کو ملک کی عدالتیں تسلیم کر کے ان پر

عمل کرتی اور کراتی ہیں۔

قانون کی نشوونما: قانون اس وقت وجود میں آیا جب خاندان اور قبیلہ وجود میں آئے۔ اس وقت خاندان کے سربراہ کا قول ہی پورے خاندان کے لئے

قانون کا درجہ رکھتا تھا۔ اور قبیلے کا قانون ہوا کرتا تھا۔ قانون اسی طرح سوسائٹی کے نشو و ارتقاء کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ ریاست وجود میں آ گئی۔ ابتداً ہوتا یہ تھا کہ ہر خاندان کی عادتیں دوسرے خاندانوں سے مختلف ہوتیں اور ہر قبیلے کی روایات دوسرے قبیلے کی روایات سے جدا ہوتیں۔ مگر جب ریاست وجود میں آ گئی تو عادتوں اور روایات میں ہم آہنگی پیدا ہو گئی۔

قانون ایک بچہ کی مانند کمزور و ناتواں پیدا ہوتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ نشو و نما پکڑ کر طاقتور ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بھرپور شباب کو پہنچ جاتا ہے۔ پھر جس سوسائٹی میں یہ قانون نافذ ہے وہ معاشرہ جس قدر تیزی کے ساتھ ارتقاء پذیر ہے۔ اسی قدر تیزی کے ساتھ یہ قانون بھی ارتقاء پذیر ہوتا ہے۔ قانون ابتداً آج کے قانون سے مختلف تھا۔ وہ ہزاروں سال پر محیط، تغیر و ارتقاء کے تدریجی عمل سے گزر کر اس مقام پر پہنچا ہے جس پر وہ آج موجود ہے۔

سوسائٹی قانون بناتی ہے اور اسے بتدریج اپنی عادات، روایات اور تاریخ کے رنگ میں رنگ لیتی ہے۔ گویا قانون سوسائٹی کے معاملات کی تنظیم کے لئے تو ہوتا ہے مگر سوسائٹی کی راہنمائی کے لئے نہیں ہوتا۔ نتیجہً قانون سوسائٹی کے ارتقاء سے پیچھے رہ جاتا ہے۔ اور اس کی ترقی کے تابع ہوتا ہے۔ ایسا قانون اور اس کے قواعد سوسائٹی کے پیش رو نہیں بلکہ اس کے پیرو ہوتے ہیں۔ یا اس معیار کے ہوتے ہیں جس معیار پر اس وقت سوسائٹی ہوتی ہے۔

شریعت: شریعت، کی نشو و نما قانون کی طرح نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی ایک جماعت، قوم یا ریاست کیلئے وجود میں آتی ہے بلکہ یہ تمام انسانیت کے لئے

ہوتی ہے۔ خواہ وہ عرب ہوں یا عجم، مشرقی ہوں یا مغربی، یا ان کے رسم و رواج کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ خواہ ان کی عادات، روایات اور تاریخ میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔ یہ ایک ایسا عالم گیر قانون ہے جس کے بارے میں ماہرین قانون سوچتے تو رہے ہیں۔ مگر کوئی عالمی قانون اس کے مقابلے میں اب تک وجود میں نہیں لاسکے۔ اس میں ترمیم Modification نہیں ہو سکتی۔ شریعت کی نصوص کی عبارات نئے نئے حالات اور تغیرات میں تنگ داماں

نہیں ہو سکتیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ شریعت کسی ترمیم و تغیر کو قبول نہیں کرتی اس لئے نصوص میں بھی اس قدر عمومیت اور لچک پیدا کر دی گئی ہے کہ کبھی کسی ترمیم یا کسی تبدیلی کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔

مفہوم شریعت: اہل زبان نے اس کے معنی ”واضح راستہ“ یا وہ واضح راستہ جو پگھٹ تک لے جاتا ہو بتائے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ وہ سہل و آسان اور صاف راستہ جس پہ چل کے کوئی گھاٹ پر آئے اور اپنی پیاس بجھائے۔ ملت اور منہاج بھی اس کے لغوی معنی ہیں۔ شاہراہ کو بھی شارع کہا جاتا ہے۔ کہ وہ مقصد و منزل تک پہنچاتی ہے۔

اصطلاحاً اس سے مراد وحی کا وہ آسان اور واضح راستہ ہے جو اللہ نے خود مقرر کیا ہے۔ جس پہ چل کے لوگ اپنی دینی، دنیوی اور اخروی پیاس کو بجھا سکیں۔ قرآن مجید میں اس لفظ کا استعمال اسی معنی میں ہوا ہے۔

...لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَ
مِنْهَا جَاءَ... المائدہ: 48
تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے ایک شریعت اور
ایک راہ عمل متعین کر دی ہے۔

یہ آیت اصل میں اس سوال کا جواب ہے کہ جب تمام انبیاء کرام اور کتابوں کا دین ایک ہے اور سب ایک دوسرے کی تصدیق کرتے آئے ہیں تو پھر شریعت کی تفصیلات میں فرق کیوں ہے؟ جواب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے مختلف قوموں کے لئے مختلف زبانوں اور مختلف حالات میں مختلف ضابطے بنائے۔ کیونکہ پچھلی شریعتوں میں بعض فروعی احکامات ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ ایک شریعت میں بعض چیزیں حرام تھیں تو دوسری میں حلال تھیں۔ بعض میں کسی مسئلے میں شدت تھی تو دوسری میں تخفیف۔ لیکن دین سب کا ایک ہی یعنی توحید پر تھا۔ اس لحاظ سے سب کی دعوت ایک ہی تھی۔ آپ ﷺ نے بھی اس کی وضاحت یوں فرمائی تھی۔

﴿فَنَحْنُ مُعَاشِرُ الْأَنْبِيَاءِ إِخْوَةٌ لِّعَلَّاتٍ، دِينُنَا
وَاحِدٌ﴾
ہم انبیاء کی جماعت علانی بھائی ہیں ہمارا دین ایک
ہے۔ (صحیح بخاری)

علانی بھائی وہ ہوتے ہیں جن کی مائیں تو مختلف ہوں باپ ایک ہی ہو۔ مطلب یہ کہ ان کا دین ایک ہی تھا اور شریعتیں (دستور اور طریقے) مختلف تھیں۔ لیکن شریعت محمدیہ کے بعد اب ساری شریعتیں منسوخ ہو گئی ہیں۔ اب دنیا کے خاتمے تک دین بھی ایک ہے اور شریعت بھی ایک۔ ایک اور مقام پہ ارشاد ربانی ہے:

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأُمْرِ فَاتَّبِعْهَا
وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿الجنابہ: 18﴾
پھر ہم نے آپ کو دین کی ظاہر راہ پر قائم کر دیا۔ سو
آپ اسی پر رہیں اور نادانوں کی خواہشات پہ نہ
چلیں۔

اس لئے شریعت، اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی نازل کردہ ہے۔ اور قانون انسان کی ایجاد ہے۔ انسان کے بس کا روگ ہی نہیں کہ شریعت سازی کر سکے۔ قانون میں انسانی نقص، عجز، ضعف، اور قلت موجود ہے۔ جسے ہمہ وقت ترمیم و تبدیلی سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو کمال کا نہیں نقص کا اظہار ہے۔ یہ اس وقت کمال کو پہنچ سکتا ہے جب انسان خود کمال کو پہنچ جائے۔

شریعت، اللہ کی تخلیق اور آئین الہی کے تفصیلی ضابطوں کا نام ہے۔ جس میں اس کی قدرت، کمال اور عظمت کی جھلک اور اس کے ماضی و مستقبل کے تمام ممکنات پر محیط علم کی روشنی موجود ہے۔ جو تمام مسائل و معاملات کا احاطہ کر گئی ہے۔ اس کا فیصلہ ہے کہ اس شریعت میں کوئی ترمیم و تبدیلی ممکن نہیں۔
...لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ... یونس: 64
اللہ کے کلمات میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

اس لئے حضرت انسان کو خود بدلنا ہوگا نہ کہ شریعت کو۔ چاہے حالات و زمانہ میں کتنی ہی تبدیلی کیوں نہ آجائے۔ جس طرح قوانین قدرت (Natural Laws) جس طرح اٹل ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کی یہ نازل کردہ شریعت بھی تمام لوگوں، گروہوں اور حکومتوں کے لئے ایک مکمل اور ناقابل تغیر قانون ہے۔ شریعت، سوسائٹی کی ایجاد نہیں بلکہ خود سوسائٹی شریعت کی ساخت ہے۔ لفظ شریعت ایک مقدس (Holy) لفظ ہے۔ جس کے ساتھ لفظ اسلامی کی قید درست نہیں۔ کیونکہ شریعت اسلامی ضابطوں کے سوا دنیا میں موجود مذاہب یا نظریات قوانین کے لئے مستعمل ہی نہیں یہ تو خالصتاً اسلامی اصطلاح ہے جو اپنے مفہوم سے ہی پہچانی جاسکتی ہے۔

رسول کریم ﷺ کے حوالہ سے جب مسلمان شریعت کا نام لیتے ہیں تو اس سے کبھی بھی کسی سابقہ نبی کی شریعت مراد نہیں ہوتی۔ حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کی شریعت اپنے عہد میں اسلام تھی۔ آپ ﷺ کے رسول بننے کے بعد اب وہ شریعت نہیں ہے۔ اور نہ ہی خدائی دین۔ بلکہ جو آپ ﷺ لائے وہی شریعت ہے۔ نماز میں قرآن مجید کی بجائے توراۃ یا انجیل کی تلاوت سے نماز نہیں ہوگی خواہ وہ اصولاً کلام الہی ہی ہو۔ قرآن مجید کی موجودگی میں عبادت، ثواب اور اجر کے لئے ان کتب کی تلاوت حرام اور ناجائز ہے اور ایسا کرنا نبی کریم ﷺ کی رسالت میں مداخلت ہے۔ شریعت صرف اس وحی الہی کا نام ہے جو آپ ﷺ پر نازل ہوئی اس وحی کے سوا کوئی وحی اسلام نہیں ہے۔ چنانچہ شریعت دو قسم کے احکام رکھتی ہے:

۱۔ پہلی قسم ان احکام کے جو حالات و واقعات خواہ کیسے ہی ہوں، وہ احکام ناقابل تغیر ہوتے ہیں۔ جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ۔ یہ اپنی موجودہ ہیئت و احکام کے ساتھ بہت مفید ہیں اور اجتماعی ترقی کا زینہ ہیں۔

۲۔ دوسری قسم ان احکام کی ہے جن کا تعلق عام دنیاوی حالات و معاملات سے ہے۔ مثلاً: تعلیم و تربیت، تجارت و صنعت، صلح و جنگ اور تعزیرات وغیرہ۔ چونکہ حالات کبھی یکساں نہیں رہتے اور قابل تغیر ہوتے ہیں اس لئے ان کے بارے میں شریعت نے اٹل اصول نہیں دیے اور نہ ہی جزئی تفصیل دی ہیں بلکہ ان کے لئے عام اصول و قواعد بنادے ہیں تاکہ امت کے لئے ترقی کا راستہ کھلا رہے۔ رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرامؓ، خلفاء راشدینؓ اور اسلاف مختلف حالات میں اپنے فہم و اجتہاد سے ایسے قوانین بناتے رہے جن میں ان کلی اصولوں کی پابندی لازماً رہتی جو شریعت نے مقرر کر دیے ہیں مگر ان کے معانی و مفہوم کی وسعت و ہمہ گیریت سے وہ اپنے گونا گوں حالات میں بھرپور فائدہ اٹھاتے۔

عبرت کا مقام: ہمارا ماضی کتنا درخشاں تھا اور آج ہمارا حال کیا ہے؟ شریعت کے دائرے میں جب تک ہم رہے خوش نصیبی اور برکتیں ہمارا ساتھ دیتی رہیں اور جب سے منہ موڑ اذلت و ادبار نے مستقل سیرا کر لیا۔ مسلمانوں کی تاریخ میں عبرت کا سامان بھی ہے۔ شریعت ہی نے مسلمانوں کو عدم سے وجود بخشا۔ انہیں اقوام عالم میں سرفراز کیا۔ مگر شریعت کو ترک کرنے سے ہر قسم کی ترقی ان سے روٹھ گئی اور زندگی کے ہر میدان میں پسپائی ان کا مقدر بن گئی۔ تقلید مغرب سے گمراہی میں مزید اضافہ ہوا۔ ضعف دوچند ہو گیا۔ ملت اسلامیہ ٹکڑوں ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ بظاہر اکٹھے نظر آتے ہیں مگر دل پر انگدگی اور انتشار کا شکار ہیں۔

شریعت و قانون میں فرق: شریعت اسلامیہ کے قواعد ہمیشہ کے لئے سوسائٹی کے معاملات کو منظم کرتے ہیں۔ اس حیثیت سے تو شریعت قانون سے ہم آہنگ ہے کہ دونوں ہی سوسائٹی کے معاملات کی تنظیم کرتے ہیں۔ مگر شریعت اس حیثیت میں قانون سے مختلف ہے کہ شرعی قواعد دائمی اور ناقابل تغیر ہیں۔ جبکہ قانون نہیں۔ یہ وہ امتیازی خصوصیت ہے جو شریعت اسلامیہ کے سوا کسی اور قانون میں موجود نہیں۔ ان میں باہم کوئی مماثلت نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ دونوں مساوی درجے کی چیزیں ہیں۔ مگر اس خصوصیت کے دو تقاضے ہیں۔ (ماخوذ و ملخص از مقدمہ اسلام کا فوجداری نظام از استاذ محمد عودہ)

۱۔ شریعت اسلامیہ کے قواعد اور اس کی دفعات میں اس قدر عمومیت اور اس قدر چلک ہونی چاہیے کہ یہ قواعد اور دفعات ہر آنے والے دور میں معاشرتی ارتقاء کی ہر صورت میں نوبہ نو بدلتے ہوئے حالات میں اور تمام متنوع ضروریات میں سوسائٹی کے تمام پیش آمدہ مسائل کا حل پیش کریں۔

۲۔ شریعت اسلامیہ کے قواعد اور دفعات میں پہلے ہی سے اس قدر رفعت اور ارتقاء ہونا چاہیے کہ کسی بھی وقت کسی دور میں وہ سوسائٹی کے معیار سے فروتر نہ ہوں اور یہ دونوں محاسن شریعت اسلامیہ میں خوب موجود ہیں۔

محمدؐ لاء: شریعت کے لئے "محمدؐ لاء" کی اصطلاح استعماری دور کی پیداوار ہے۔ جو فی نفسہ شریعت کے وحی الہی اور آئین الہی ہونے کا انکار ہے۔ اور اسی کی دعوت ہے۔ استعمار نے اپنی آسانی کے لئے ایک اصطلاح وضع کر دی جو اس نے اپنے سمجھنے کے لئے بنائی۔ مگر ہمارے ہاں اس کا استعمال ایک غلامی کی یادگار بن گیا ہے۔ ہماری قانونی کتب (law books) کے عنوانات اسی سوچ کے غماز ہیں۔ اس اصطلاح سے استعمار نے یہ مفہوم باور کرایا کہ میں شریعت کو وحی الہی نہیں مانتا بلکہ اسے محمد ﷺ کی خود ساختہ کہتا ہوں اور جو دیگر قوانین کی طرح وقت کے ساتھ ساتھ قابل تغیر بھی ہے۔ جب کہ مسلمان اسے ایک بڑ سمجھتا ہے اور دلائل سے شریعت کی اہمیت، افادیت اور ہمہ گیریت کو نہ صرف دوسرے خود ساختہ قوانین کے مقابلے میں برتر گردانتا ہے بلکہ شریعت و قانون میں بنیادی فرق ثابت کرتا ہے۔

اسلامی فقہ کا مزاج

اسلامی فقہ اور اصول فقہ کا مزاج سمجھنا ہو تو شریعت کے تمام احکامات پر غور کر کے یہ جانا جاسکتا ہے کہ ایسے احکام دیتے وقت کن کن اہم ضرورتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ یہ تین بنیادی باتیں ہیں جو ذیل میں دی جا رہی ہیں:

۱۔ عدم حرج: یہ لحاظ رکھا جائے کہ لوگ شریعت پر عمل میں تنگی تو محسوس نہیں کر رہے۔

۲۔ قلت تکلیف: کم سے کم اعمال ہوں تاکہ لوگ دین کو بآسانی لیں۔

۳۔ تدریج: کسی بھی بد عادت کو چھڑانا ہو تو اس کی تبدیلی کا تدریجی پہلو نظر انداز نہ کیا جائے۔

فقہاء کرام نے قرآن وحدیث کے احکام پر غور و خوض کر کے یہ پہلو اخذ کئے ہیں۔ اسی مزاج کے تحت تمام فقہی مسائل اور اصول اسلامی فقہ بنائے گئے ہیں۔ رہے وہ مسائل جن میں تنگی ہو۔ تکلیف کی کثرت ہو اور جہاں تدریجی پہلو نظر انداز ہو۔ وہ یقیناً غیر فقہی اور غیر اصولی مسائل ہیں جن کا شریعت کے مزاج سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی اسی مزاج کی نشان دہی کرتا ہے:

لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق انما

اللہ کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت فرض نہیں۔

الطاعة في المعروف.

بلاشبہ اطاعت تو معروف میں ہوا کرتی ہے۔

اس کی وضاحت اس مثال سے دی جاسکتی ہے کہ کسی سفر میں مسلمانوں کے اولی الا مرنے ان سے کہا کہ آگ میں کود جاؤ۔ کچھ نے ارادہ بھی کر لیا۔ مگر آپ ﷺ کو جب علم ہوا تو فرمایا: اگر یہ کود جاتے تو ہمیشہ آگ میں ہی رہتے۔

اس واقعہ میں غور طلب بات یہ ہے کہ:

☆۔ ان کا کودنا کیا اپنے امام اور اولی الا مرنے کے فرمان کے ماتحت نہیں تھا۔ اور کیا اس کی بجا آوری وہ اپنے اوپر واجب نہیں سمجھتے تھے؟

☆۔ انہوں نے اپنی سمجھ پر زور کیوں نہ دیا اور اللہ کی نافرمانی پر صرف اولی الامر کے حکم سے تیار ہو گئے؟

☆۔ اطاعت کے حکم کو انہوں نے عام بنا دیا۔ جس میں وہ چیز بھی داخل کر دی جو شارع کی منشا کے خلاف تھی بلکہ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ یہ حرکت دین کے خلاف ہے۔

☆۔ باوجود اس کے انہوں نے اعلیٰ بات یا اعلیٰ پہلو سمجھنے کی کوشش نہ کی اور خود کو ہلاک کرنے اور اپنی جانوں پر عذاب کرنے کی ٹھان لی اور وہ بھی بغیر ثبوت اور دلیل کے کہ یہ اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت بھی ہے یا نہیں؟

لہذا جب معمولی سی غلطی پر اس قدر سخت وعید ہے کہ وہ اگر ایسا کر لیتے تو جہنمی بن جاتے تو پھر ان لوگوں کی سزا کا تصور تو بہت بھیاںک نظر آتا ہے جو کھلے عام ان احکام کے خلاف فتوے دیں یا کسی عمل سے باز رکھیں جو ہادی برحق نے صراحت سے فرمادیئے ہوں۔

یہی دین کا مزاج ہے اور ہر عمل میں کارفرما ہے۔ اس کے بغیر صحیح دین کی اشاعت نہیں ہو سکتی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ بات درست ہے کہ دین آسان ہے مگر لوگوں کو ایک رائے پر جمع کرنا ان کے لئے تنگی و حرج کا پیدا کرنا ہے۔ نیز جب لوگ ایک رائے پر جمع ہو جائیں گے تو وہی چیز شریعت کہلائے گی جو محدود ہوگی۔ جب کہ شریعت کا آسان ہونا قبول کیا جا چکا ہے۔ اس لئے یہ بات قابل قبول نہیں۔ بات تو بظاہر بہت مناسب معلوم ہوتی ہے مگر یہ کہاں لکھا ہے کہ اپنی مرضی سے شریعت میں وسعت کو تلاش کر لیا جائے اور اسے خواہشات کے تابع بنا دیا جائے۔ یا چار افراد رائے دیں اور پھر ہر ایک کی رائے پر سختی سے جمود اختیار کر لیا جائے؟ واقعات بتاتے ہیں کہ انتشار فکر نے اور اس پر مستزاد تعصب نے مسلمانوں کو کیا بنا دیا ہے۔

دوسری طرف ہمارا یہ حال ہے کہ کتاب اللہ کو مشکل کتاب کہہ کر اس کے فہم کے لئے سولہ علوم کی شرط عائد کر دی گئی۔ عام آدمی یہ سوچ کر کہ قرآن تو علماء کے لئے اترا ہے خود قرآن کے استفادہ سے باجست محروم رہا۔ اور کہیں رسالت مآب ﷺ کی احادیث کو بڑا مشکل موضوع قرار دے کر حدیث سے ہی بدکا دیا گیا۔ سیرت رسول ﷺ سے استفادہ کی بجائے اقوال رجال کی طرف لگا دیا گیا جب کہ فقہ اسلامی کی ساری عمارت ہی حدیث نبوی کی بنیاد پر کھڑی ہے۔ کتب حدیث کے مطالعے کا ذوق لوگوں میں آنے لگا اور صحیح فہم سے آشنائی ہونے لگی تو یہ کہہ دیا گیا ہمارے مذہب میں مسئلہ دوسرا ہے۔ اصل فقہی کتب سے چند پیچیدہ مگر چیدہ چیدہ شخصی مسائل شائع کر دئے گئے جنہیں آسان کہہ دیا گیا اور ان کے متون کے تراجم شائع نہ ہو سکے تاکہ قاری ان میں وسعت کو پا کر براہ راست ان سے مستفید ہوتا۔

اس جدید دور میں آج فقہ اسلامی کی تدوین نو کی ضرورت ہے تاکہ تمام مذاہب کے علماء اور ان کے مقلدین کو قریب لا کر نفرت کو کم کیا جاسکے۔ قرآن و سنت کے مقابلے میں قدیم فقہی کتب خود بہت دقیق، مشکل اور انتہائی مختصر ہیں۔ مسلکی غلبہ کی وجہ سے جن کا علمی معیار بھی محدود ہے۔ انہیں سمجھنا ایک عام طالب علم تو کیا فارغ التحصیل عالم کے لئے بھی خاص دشوار ہے۔ ان میں ایسے احکام بکثرت ہیں جن میں ان کی علت ہی بیان نہیں کی گئی۔ ان کتب کا اسلوب ایک نہیں۔ معمولی مسائل میں غیر ضروری طوالت ہے۔ مسائل و ضوئیں پانی کا استعمال، چاہے وہ کنویں کا ہو یا بہتا پانی یا کھڑا، اس پر لمبی مفروضہ بحثیں طالب علم کو کیا بخشی ہیں۔ ایک مصری عالم کا حال دل سنئے:

جامع ازہر میں ہم نے باب وضوء تین ماہ میں پڑھا۔ مگر وضوء کی حقیقت و سہولت سمجھ نہ آئی۔ یہاں تک کہ فقہ السنہ نے آنکھوں پر سے پردہ اٹھایا۔ ہم میں بہتیرے جامعہ ازہر میں بارہ بارہ اور پندرہ پندرہ برس رہتے ہیں۔ اور مذاہب اربعہ میں کسی ایک مذہب کی اکثر و بیشتر کتابیں پڑھ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ فضیلت کی سند بھی مل جاتی ہے۔ لیکن جب آخر میں غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اتنی کتابیں رٹ جانے کے خود اس مذہب کی بھی تحقیق حاصل نہیں ہو پائی۔ دوسرے مذاہب کی تحقیق اور تفسیر و حدیث کا علم تو بہت دور رہا۔ چنانچہ ہم ہمیشہ حیرت و اضطراب میں پڑے رہتے ہیں کہ اختلافی مسائل میں طریق ترجیح تک نہیں جانتے" ؟ (مقدمہ ہدی الرسول ص ۴)

الحمد للہ! آج کی اس طلب صادق کو اہل علم نے محسوس کر لیا ہے جنہوں نے تحقیق و تصفیہ (Research and Scrutiny) کے میدان عمل میں اتر کر مرتب صورت میں فہارس و عناوین کے ساتھ قابل فہم، آسان اور صحیح ترین فقہ اسلامی کا قابل تحسین لٹریچر مہیا کر دیا ہے۔ جسے مختلف اشاعتی ادارے چھاپ کر مارکیٹ میں دستیاب کر رہے ہیں۔

معتدل رویہ :

قرآن و سنت کے وحی الہی ہونے اور ان کے باہم مد و معاون ہونے کا انکار تو کسے نہیں مگر یہ کہنا کہ ان میں باہم اختلاف ہے اور ہو سکتا ہے درست نہیں۔ وجہ شاید ہماری اپنی کم علمی یا عدم صلاحیت ہو سکتی ہے جو قرآن و سنت کے اس بظاہر اختلاف کو سمجھنے سے قاصر رہی۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ جس پر قرآن اترے وہ اس کے خلاف کرے یا کہے۔ اس لئے قرآن و سنت میں کہیں کوئی اختلاف نہیں۔ ہمیں بھی اپنے رویے پر نظر ثانی کرنی چاہئے کہ کہیں یہ عقیدت شخصی تو نہیں جس کے فہم کو یہ حیثیت دی جا رہی ہے۔ فقہاء کرام کے اپنے فتاویٰ و استنباطات میں یہ باہم اختلاف قرآن و سنت کی نسبت زیادہ نظر آتا ہے۔ کہیں سہو ہے تو کہیں غلطی اور کہیں بالکل لاعلمی۔ پہلے ہمیں ان کے بارے میں جو مثبت رائے بنانی ہے بنالیں اور پھر قرآن و سنت کے بارے میں ان سے بہتر سوچ اپنا کر فیصلہ کریں۔

شاید یہ رائے معتدل ہو کہ ان اختلافی مسائل کو اگر ہم فقہاء کرام کی مثبت کاوش، اور مسائل کے ادراک میں توسع کا نام دیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اس کی وجہ اپنے اپنے علاقوں میں متعدد جدید واقعات کا رونما ہونا تھا، یہ صاحب تقویٰ ائمہ اجتہاد ہو یا اختلاف ہمیشہ حق کی طلب و تلاش میں رہتے تھے نہ تو عصبيت و عناد ہی انہیں اجتہادات پر آمادہ کر سکا اور نہ ہی شہرت و جدال کے محرکات اس کے موجب بن سکے۔ اس صورت حال کو سمجھے بغیر ہمارا تعصب اور مسائل میں کسی ایک کے ساتھ بشدت وابستگی ان کے ان اجتہادی اور واقعاتی کارناموں پر پانی پھیرنے والی بات ہوگی۔ جو انہوں نے نہ کبھی چاہا اور نہ ایسی توقع اپنے ماننے والوں سے کی۔ اس لئے ان کی اختلافی آراء کو باہمی اختلاف سے تعبیر نہیں کرنا چاہیے کہ ایسا عمل ایک بہت بڑی غلطی ہوگی اور بے ادبی بھی۔ اسی طرح کسی ایک فقیہ کے اقوال و فتاویٰ کو ہی دین کی حقیقی اور صحیح تعبیر اور اسے ہی فقہ اسلامی سمجھنا بھی نامناسب رویہ ہے۔ گویا کہ قرآن و سنت کے معانی کو ایک ہی فقیہ کے فہم پر محدود کر دیا ہے۔ جس کے نتائج فقہاء کی محبت کی صورت میں یہاں تک سامنے آئے۔ کہ ایسی حدیث کی اہمیت ثانوی ہو گئی جو صحت کے تمام معیارات پر پورا اترتی تھی مگر بلا سند بیان شدہ قول فقیہ تو اتر کا درجہ پا گیا اور یوں منفرد امتیازی مسائل کی اہمیت، سنت رسول ﷺ سے بھی برتر ہو گئی۔

ہمارے ہاں یہ عام خیال ہے کہ مروجہ مسلکی فقہ کو اگر پڑھ لیا جائے تو آدمی کو فقہ آ جاتی ہے اور وہ نہ صرف فقیہ بن جاتا ہے بلکہ وہ فقہی مسائل بتانے اور فتاویٰ لکھنے کا بھی اہل ہو جاتا ہے۔ یہی وہ فقہ کا مطلب ہے جو اہل لغت نے لیا ہے مگر یہ خیال درست نہیں کیونکہ فقہات ایک ایسا ملکہ ہے جو طویل مگر مسلسل عمیق مطالعہ اور تمام ائمہ فقہاء کے تجربہ و علم سے مستفاد فہم کا نام ہے جو محدود علم اور محدود تجربہ سے حاصل نہیں ہوتا۔ مرد فقیہ مسلک ایک تو محدود علم کا نام ہے اور دیگر فقہاء کرام کی فقہات و بصیرت سے لاعلمی کا بھی۔ اس لئے ان مسائل میں مسلکی نمائندگی تو ان فتاویٰ و مسائل سے ہو سکتی ہے مگر اسلامی فقہ کی نہیں کیونکہ اسلامی فقہ کی وسعت میں نہ صرف چاروں فقہاء کرام کی فقہات سماتی ہے بلکہ آج تک فقہات کے جتنے بھی مثبت مظاہر دیکھنے یا سننے میں آئے ہیں وہ بھی اس میں شامل ہیں۔ اسی طرح یہ خیال بھی درست نہیں کہ اگر کوئی حدیث پڑھنا شروع کر دے تو فقہات اس سے رخصت ہو جائے گی۔ کیونکہ حدیث رسول فقہات دینی کی خشت اول ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اجتہاد و تفقہ علم حدیث میں کامل مہارت کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لئے کسی بھی فقیہ کے اجتہادات یا فقہی مسائل میں قابلیت اور مہارت کو دین کے اس بنیادی علم کے مطابق پرکھا جائے گا جس سے دوسرے علوم کے ماہرین کو پرکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے ایسے اجتہادات و فقہی مسائل پر مبنی بعض کتب کا مطالعہ کیا تو وہ اپنے محسوسات قلم بند کئے بغیر نہ رہ سکے۔ ملا علی القاریؒ لکھتے ہیں:

نہایت شرح ہدایہ اور دیگر شارحین ہدایہ کی نقل کردہ روایات حدیث کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ ایک تو وہ محدث نہیں دوسرے وہ روایات کا ماخذ (source) بھی بیان نہیں کرتے کہ کس محدث نے اس روایت کی تخریج کی ہے۔

لا عبارة بنقل النهاية ولا ببقية شراح الهداية ، فإنهم ليسوا من المحدثين ، ولا أسندوا الحديث إلى أحد من المخرجين .
(الأسرار المرفوعة: 356 بیروت)

امام بدرالدین العینی نے البناية میں اور عبدالقادر قرشی نے اپنی شرح العناية فی معرفة أحادیث الهداية میں اور امام زلیعی نے نصب الراية میں اور امام ابن حجر نے الدرایة میں ان کا پایہ بتا دیا ہے کہ کوئی قابل استدلال ہیں اور کوئی ناقابل استدلال۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی مصنف ہدایہ کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں:

یعنی صاحب ہدایہ ایسی احادیث نقل کرتے ہیں جو محدثین کے نزدیک خالی از ضعف نہیں غالباً انہیں علم حدیث سے دلچسپی زیادہ نہیں تھی۔

اگر حدیث آوردہ نزد محدثین خالی از ضعف نہ، غالباً اشتغال وقت آں استاذ در علم حدیث کم تر بودہ است۔
شرح سفر السعادة ص 23، طبع لکھنؤ

مولانا عبدالحق لکھنوی فرماتے ہیں:

کتب فقہ اگرچہ فی نفسہ فروعی مسائل میں قابل اعتبار ہیں اور ان کے مصنفین بھی بلاشبہ معتبر اور اجلہ فقہاء میں سے ہیں مگر ان کی کتب میں منقول احادیث پر کلی اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ اور نہ ہی ان کتابوں میں کسی حدیث کا وجود اس کے ورود و ثبوت کے لئے کافی ہے کیوں کہ بے شمار ایسی احادیث ہیں جو فقہ احناف کی معتبر کتب میں درج ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ موضوع اور گھڑی ہوئی ہیں۔

إن الكتب الفقهية وإن كانت معتبرة في نفسها بحسب المسائل الفرعية، وكان مصنفوها أيضا من المعتبرين والفقهاء الكاملين لكن لا يعتمد على الأحاديث المنقولة فيها اعتمادا كلياً، ولا يجوز بورودها وثبوتها قطعاً بمجرد وقوعها فيها، فكم من أحاديث ذكرت في الكتب المعتبرة وهي موضوعة مختلقة... الخ. مقدمة عمدة الرعاية ص ۱۳ تحت الدراسة الرابعة

مولانا لکھنوی کچھ آگے چل کر فرماتے ہیں:

یعنی فقہاء کرام فقہی مسائل کے ضبط و تحریر سے تو بہرہ ور ہیں لیکن روایات حدیث میں بعض کو کوئی مہارت حاصل نہیں ہے۔

ومن الفقهاء من ليس له حظ إلا ضبط المسائل الفقهية من دون المهارة في الروايات الحديثية.

یعنی فقہی مسائل کو دیگر کتب یا فقہاء سے نقل کرنے میں تو ماہر ہیں مگر احادیث جو بطور دلیل بیان کرتے ہیں ان کی صحت و ضعف سے لاعلم۔ سوال یہ ہے کہ جب فقہی مسائل ہی ضعیف و موضوع احادیث سے بیان کئے اور لکھے جائیں تو ان کا وزن کیا ہوگا؟ کیا انہیں فقہ یا فقہی مسائل کہنا درست ہوگا؟ فقہاء کرام کے بارے میں اس قسم کے ریمارکس کوئی نئی بات نہیں۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ جس فقیہ نے حفظ مسائل، و متون یا ان کی شروح پر اکتفاء ہی کافی سمجھا ہوا یا اپنے مسلک کے مسائل اور علم الخلاف میں مہارت پیدا کرنا ہی اہم سمجھا ہو تو وہ فقیہ تو ہوگا مگر اس فرق کے ساتھ کہ وہ اپنے مسلک کا فقیہ ٹھہرے گا۔ جب کہ

فقاہت کی منصبی شرائط کچھ اور ہیں جو اوپر کے اقتباسات میں علماء نے ضمناً بیان کر دی ہیں۔ یعنی اصل فقہ تو حدیث ہی ہے۔ شخصی استنباطات واجتہادات اگر موافق حدیث ہیں تو قابل قبول ہو سکتے ہیں ورنہ نہیں۔ انہیں رد تو کیا جاسکتا ہے مگر حدیث کو نہیں۔ نیز نص اور اس کے فہم صحیح میں ملاوٹ نہیں ہونی چاہئے۔
فقیہ کسے کہتے ہیں: فقیہ وہ ہوتا ہے جو شریعت کے غالب احکام کا علم واقعتاً رکھتا ہو یا اس نے اپنے آپ کو ادلہ تفصیلیہ کی معرفت سے مالا مال کر رکھا ہو۔ فقاہت کا مقام ایک عالی مقام ہے۔ اس لئے فقیہ کے لئے قرآن و سنت کے ٹھوس علم کے علاوہ یہ ضروری ہے کہ اس میں یہ خوبیاں بھی ہوں۔ وہ صحیح احادیث و روایات کا چناؤ کرے۔ وہ ثقہ اور ضابطہ ہو اور ضعیف و موضوع روایت کی معرفت رکھتے ہوئے ان سے استنباط مسائل نہ کرے۔ اسی طرح اس کا یہ فرض بھی ہے کہ اپنے فکرو تاثرات اور قوت استدلال کے ذریعے احکام اور ان کے دلائل میں اس منطقی ارتباط کو سمجھے جو دونوں میں موجود ہے۔

فقہاء کے درجات: ایک حدیث ہے: رب حامل فقہ أوعی من سامع۔ بہت سے فقہ کے حامل، سامع کی نسبت زیادہ یادداشت رکھنے والے ہوتے ہیں۔ اس حدیث مبارک میں آپ ﷺ نے خود اپنی حدیث کو فقہ قرار دیا۔ اس حدیث سے یہ درجہ بندی بھی معلوم ہوتی ہے کہ فقہاء میں جو سب سے زیادہ صحیح احادیث کو اپنی فقہ واجتہاد کا سہارا بناتے ہیں اور اسے از بر بھی رکھتے ہیں وہی فقہ اسلامی کے سب سے بڑے فقیہ ہیں اور جو صحیح احادیث کی بجائے اپنی عقل خام اور ضعیف و موضوع احادیث کا سہارا لیتے ہیں یا احادیث کو اہمیت نہیں دیتے وہ ظاہر ہے اس معیار کے فقہاء نہیں ہوں گے جو اعلیٰ درجے کے ہیں۔ اس میزان کے لئے یہ حدیث ہمیشہ پیش نظر رہے۔ سیدنا ابو موسیٰ اشعرئؓ روایت کرتے ہیں کہ رسالت مآب ﷺ نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ نے مجھے جس ہدایت اور علم سے مالا مال کیا ہے اس کی مثال اس برکھا کی سی ہے جو زمین پر بر سے۔ اس میں زمین کا جو حصہ اچھا اور پاکیزہ ہے وہ بارش کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور زمین سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے۔ زمین کا کچھ حصہ ایسا بھی ہے جو بجائے جذب کرنے کے پانی کو روک لیتا ہے جس سے بہت مستفید ہوتے ہیں لوگ نہ صرف پانی پیتے ہیں بلکہ اپنے جانوروں اور کھیتی کو بھی سیراب کرتے ہیں۔ زمین کا ایک حصہ ٹیلے دار تھا جو برسات کے پانی کو نہ تو روک سکا اور نہ ہی وہاں کچھ اگ سکا چنانچہ یہ مثال ایسے لوگوں (فقہاء) کے لئے ہے جن میں کچھ تو ایسے ہیں جو اللہ کے دین کو صحیح معنوں میں سمجھتے ہیں اور میرے (نبیؐ) علم سے اللہ بزرگ و برتر انہیں فائدہ پہنچاتے ہیں وہ اسے جانتے بھی ہیں اور عمل بھی کرتے ہیں۔ اور ایسے لوگوں (فقہاء) کے لئے بھی ہے جو میرے (نبیؐ) علم کو سیکھنے اور پانے کے لئے اپنا سر تک نہیں اٹھاتے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ اس ہدایت کو قبول کرتے ہیں جسے دے کر میں بھیجا گیا ہوں۔

إن مثل ما آتانی اللہ من الہدی والعلم، کمثل غیث أصاب أرضاً، کانت منها طائفة طيبة، قبلت الماء وأنبت الکلاً والعشب الکثیر، وکانت منها أجداب أمسکت الماء، فنفع اللہ به الناس، فشربوا منه وسقوا وزرعوا، وطائفة أخرى، إنما هی قیعان لا تمسک ماء، ولا تنبت کلاً، فذلک مثل من فقه فی دین اللہ ونفعه ما بعثنی اللہ به فعلم وعمل. ومثل من لم یرفع بذلک رأساً، ولم یقبل ہدی اللہ الذی أرسلت به. وقال الحسن والقاسم: فعلم وعلم. متفق علیہ.

امام خطیب بغدادیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث میں جناب رسالت مآب ﷺ نے فقہاء کرام اور فقاہت کے مدعی سب حضرات کے مراتب بڑی باریکی سے ارشاد فرما دیے ہیں۔

پہلا درجہ: اچھی اور پاکیزہ زمین سے مراد۔ وہ راست فقہاء کرام ہیں جو روایت (حدیث) میں ضابطہ (Accurate) ہوں۔ اس کے مفاہیم کو بخوبی سمجھتے ہوں اور مختلف فیہ مسائل کو قرآن و حدیث کے دلائل سے آراستہ کرتے ہوں۔

دوسرا درجہ: بنجر اور سخت زمین جو پانی کو جذب نہ کر سکی بلکہ اس نے پانی کو روک لیا اور جس سے مخلوق خدا محفوظ ہوئی۔ اس سے مراد فقہاء کرام کی وہ جماعت ہے جو شرعی مسائل اور احادیث کو سننے کے بعد اچھی طرح اسے محفوظ کر لے اور انہیں یاد بھی رکھے اور بغیر کسی ذاتی فقہی تصرف و تبدیلی کے ان روایات کو دوسروں تک من و عن پہنچا دے۔ اس طرح اس کے پہنچانے میں بہتوں کو فائدہ ہو سکتا ہے وہ اس طرح کہ یہ حدیث رسول ﷺ جسے پہنچائے وہ اس سے بھی زیادہ بہتر طریقے سے نہ صرف اسے یاد رکھے بلکہ بہت سے لوگوں کو دین کی راہ پر بھی لے آئے۔ آخر آپ ﷺ کا یہ ارشاد یہی معنی تو رکھتا ہے:

رب حامل فقه ليس بفقیه. ورب مبلغ أوعى
 بہت سے فقہ کے حامل غیر فقیہ یعنی نا سمجھ ہوتے
 ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو فقہ کو ایسے شخص کو
 منتقل کر دیتے ہیں جو اس حامل سے بھی زیادہ فقیہ
 اور سمجھ دار ہوتے ہیں۔

آپ ﷺ نے اپنی حدیث مبارک میں اپنی ہی حدیث کو فقہ کہا اور اس کے حاملین کو فقیہ فرمایا۔
 تیسرا درجہ: اسی طرح جو فقیہ حدیث تو سنے مگر سن کر نہ اسے یاد رکھ سکے اور نہ ہی اسے ضبط کر سکے وہ نہ پاکیزہ زمین کی طرح ہے اور نہ ہی بنجر زمین کی مانند۔
 بلکہ وہ تو ہر خیر سے محروم ہے۔ ایسے شخص کی مثال ٹیلے کی مثال جیسی ہے جہاں نہ گھاس اگتا ہے اور نہ ہی وہاں پانی رکتا ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے:
 ... هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ... (الزمر: 9) کیا علم والے اور لاعلم لوگ برابر ہو سکتے ہیں؟ اسی طرح یہ ارشاد: ... أَفَمَنْ يَعْلَمُ
 أَنَّمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمَى ... (الرعد: 19) کیا بھلا جو یہ علم رکھتا ہے کہ جو کچھ آپ پر نازل کیا گیا ہے وہ حق اور سچ ہے وہ
 اس شخص کی مانند ہو سکتا ہے جو اندھا ہو؟ اللہ تعالیٰ نے تارکِ علم کو، اس سے دور رہنے والے کو، اسے باوقار نہ سمجھنے اور اسے جھوٹا قرار دینے والے کو کتے کے
 ساتھ تشبیہ دی ہے۔ وَأَتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا ... فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ... (الأعراف: 176-175)۔ ان پر اس شخص کی
 خبر کو پڑھئے جسے ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا تو وہ ان سے کھسک گیا۔ تو اس کی مثال کتے کی مثال کی مانند ہے۔

(الفقیہ والمفسر 1، 179)

فقہ میں اہم چیز کون سی ہے؟

اسلاف امت قرآن و سنت کے فہم کو ہی فقہ سمجھتے اور کہتے رہے ہیں۔ جس میں اہم چیز دینی و دنیوی ہے یعنی فقہ اسلامی میں اہم چیز فرد کی وہ بیداری ہے جو اس
 کے صحیح علم پر مبنی ہو۔ اسی طرح فقیہ کی اپنی قوت استدلال اور اس کا ابتکار ہے جو دوسرے فقیہ سے برتر یا کم زور تر استدلال ہو سکتا ہے۔ اس استدلال کی صحیح
 پہچان کا ملکہ اللہ تعالیٰ جس کو عطا کر دے یہی خیر کثیر ہے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ اور ان کے معاصر یا بعد کے فقہاء کے مابین اس فرق کو واضح طور پر دیکھا جا
 سکتا ہے۔ اس میں کتب حدیث میں مؤلفین کے وہ تراجم ابواب بھی شامل ہیں جو ان کے زمانہ میں دراصل سوالات تھے جن کا جواب انہوں نے حدیث کے
 استدلال سے قبل باب کی صورت میں دے دیا۔ فقہ و تفقہ کا حاصل یہی کچھ ہے جو علماء نے دین کے اصل مآخذ میں غور و خوض کے بعد جمع کیا ہے۔ ذیل
 میں اس کی چند مثالیں دی جاتی ہیں تاکہ اس فقہی بیداری کو باسانی سمجھا جاسکے:

آیت یا لفظ کے فہم میں اختلاف: سورۃ النصر جب آپ ﷺ پر نازل ہوئی تو بیشتر صحابہ کرامؓ اس کے نزول پر بہت خوش ہوئے کہ الحمد للہ اس دین کو
 مزید پھلنے پھولنے کی خوش خبری مل گئی مگر سیدنا صدیق اکبرؓ غمگین ہو گئے۔ کہ اس سورۃ میں تو آپ ﷺ کی وفات کی خبر ہے۔ مگر بیشتر قریشی صحابہ اپنے اپنے فہم
 پر قائم رہے۔ جن کی اصلاح جناب فاروق اعظمؓ نے اپنے دور خلافت میں فرمائی۔ اسی طرح آیت:

... أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولَى الْأَمْرِ
 مِنْكُمْ ط فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى
 اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ
 الْآخِرِ ... (النساء: 59)

اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور حکام
 و علماء کی، پھر اگر تم آپس میں کسی چیز میں اختلاف
 کرنے لگو تو اسے تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف
 لوٹاؤ اگر تم اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہو۔

میں أَطِيعُوا الرَّسُولَ سے کیا مراد ہے؟ اگر رسول زندہ نہ ہو تو کیا صحیح حدیث مراد ہوگی؟ کیا اس میں خبر واحد بھی شامل ہے؟ کیا خبر واحد بھی وحی ہے؟ یا

ظنی؟ اسی طرح اولو الامر کا فہم اور اختلاف، کہ اس سے مراد کون لوگ ہیں اور پھر ان سے اختلاف کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اگر کیا جاسکتا ہے تو کس صورت میں؟ اور اگر نہیں تو کس صورت میں؟

حدیث کے فہم میں اختلاف: حدیث کے فہم میں بھی فقہاء کرام کا اختلاف کتب میں بکثرت ملتا ہے۔ مثلاً امام ابو داؤد نے المراسیل میں ابو العالیہ الریاحی سے روایت کی ہے:

جاء رجل فی بصرہ ضر، فدخل المسجد	ایک آدمی جس کی آنکھ میں تکلیف تھی مسجد میں داخل
ورسول اللہ ﷺ یصلی أصحابہ، فتردی	ہوا۔ جناب رسالت ﷺ اپنے صحابہ کرام کو نماز
فی حفرة كانت فی المسجد، فضحکت	پڑھا رہے تھے۔ وہ آدمی اچانک مسجد کے گڑھے میں
طوائف منهم، فلما قضی رسول اللہ ﷺ	جاگرا۔ صحابہؓ میں سے چند اس کیفیت کو دیکھ کر ہنس
الصلاة، أمر من كان ضحك منهم أن	پڑے۔ جب نبی کریم ﷺ نے نماز مکمل فرمائی تو
یعيدوا الوضوء ویعيدوا الصلاة.	آپ ﷺ نے ہنسنے والوں سے فرمایا کہ وہ اپنا وضو
	اور نماز دونوں لوٹائیں۔

فقہاء کرام اس حدیث کے فہم میں مختلف ہیں کہ آیا اس شخص کا وضو ٹوٹے گا یا نماز بھی جاتی رہے گی؟ بعض فقہاء نے اپنے فہم کے مطابق یہ فتویٰ دیا کہ چونکہ حدیث میں وضو کے ٹوٹنے کی وضاحت ہے اس لئے نماز کے ساتھ اس کا وضو بھی ٹوٹ جائے گا اور یوں نماز دوبارہ لوٹانا ہوگی۔ جب کہ کچھ فقہاء اس مسئلے کے قائل ہوئے کہ وضو توڑنے والی چیزیں تو احادیث میں مذکور ہیں اس لئے اس حدیث میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ان احادیث سے متعارض ہیں۔ لہذا یہی کہا جاسکتا ہے کہ ایسے شخص کی نماز ٹوٹ گئی نہ کہ وضوء۔ جب کہ محدثین اسے مرسل یعنی غیر متصل حدیث قرار دیتے ہیں۔ امام دارقطنی نے اس حدیث مرسل کے چوالیس طرق بیان فرمائے اور کہا کہ سبھی ابو العالیہ الریاحی پر جا کر ہی ختم ہوتے ہیں جو تابعی ہیں اور صحابی کا ذکر کئے بغیر رسول اللہ ﷺ سے حدیث روایت کرتے ہیں اس لئے سند میں کسی صحابی کا سقوط ہے۔ کوئی بھی ایسی حدیث نہیں ملتی جو مرفوع متصل ہو۔ اس کے برعکس انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس مرسل حدیث کے مقابل میں سیدنا جابرؓ کی ایک موقوف روایت ملتی ہے جو صحیح ہے۔ کہ: سیدنا جابرؓ (فتح الباری ۲۸۰/۱) فرماتے ہیں

الضحک فی الصلاة ینقض الصلاة ولا	نماز میں ہنسنے سے نماز تو ٹوٹ جاتی ہے مگر اس سے
ینقض الوضوء	وضوء نہیں ٹوٹتا۔

اجتہاد میں اختلاف: فقہاء کرام اپنے اپنے استنباطات اور اجتہادات میں بھی استدلال کی بنیاد پر مختلف فیہ نظر آتے ہیں۔ امام قدوریؒ نے اپنی معروف کتاب المختصر میں کافی مسائل کی نشاندہی فرمائی ہے جن سے فقہاء کرام کی اجتہادی آراء میں واضح اختلاف نظر آتا ہے۔ مثلاً: باب صفة الصلوة میں لکھتے ہیں:

اگر نمازی تکبیر تحریمہ اللہ اکبر کی بجائے اللہ اجل کہہ دے یا اللہ اعظم کہہ دے، یا الرحمن اکبر کہہ دے تو امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک ایسا کرنے سے اس کی نماز ہو جائے گی۔ مگر امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا ارشاد ہے کہ ایسا کہنا جائز ہی نہیں۔ ہاں اگر نمازی اللہ اکبر کہے یا اللہ الاکبر کہے یا اللہ الکبیر کہے تو جائز ہوگا۔

فإن قال بدلا من التكبير: الله أجل، أو أعظم، أو الرحمن أكبر، أجزأه عند أبي حنيفة ومحمد رحمهما الله تعالى. وقال أبو يوسف رحمه الله تعالى، لا يجوز إلا أن يقول، الله أكبر أو الله الأكبر أو الله الكبير. (ص: 24)

اسی طرح منیة المصلی ص ۶ میں ہے:

اور گردن کا مسح تین انگلیوں کے ظاہری حصے سے جدید پانی لے کر کرے۔ بعض فقہاء کہتے ہیں ایسا کرنا ادب ہے۔

ویمسح الرقبة بظهور الأصابع الثلاث بماء جديد. وقال بعضهم، هو أدب.

اسی پر ایک دوسرے فقیہ فتاویٰ قاضی خان سے نقل کرتے ہوئے یوں حاشیہ آرائی فرماتے ہیں:

وضو میں گردن کا مسح نہ تو ادب میں شامل ہے اور نہ ہی سنت۔

أما مسح الرقبة فليس بأدب ولا سنة.

ایک اور اختلاف رائے یہ بھی سامنے آیا جسے امام قدوری بیان فرماتے ہیں:

عورتوں کے لئے مکروہ ہے کہ وہ خود باجماعت نماز پڑھیں۔ پھر اگر وہ ایسا کر بھی لیں تو عورتوں کی امام عورت، ان کے درمیان چھپ کر کھڑی ہوگی۔۔۔ صف پہلے مرد بنائیں گے، پھر بچے، پھر خنثی (بیچڑے) پھر عورتیں۔۔۔ عورتوں کا مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے کے لئے آنا مکروہ ہے۔ بوڑھی عورت اگر فجر، مغرب اور عشاء کے لئے باجماعت نماز پڑھنے کے لئے آنا چاہے تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ جب کہ امام ابو یوسف اور امام محمد کا کہنا ہے: تمام نمازوں میں بوڑھی عورت مسجد میں نماز باجماعت پڑھنے کے لئے آ سکتی ہے۔

ويكره للنساء أن يصلين وحدهن جماعة، فإن فعلن وقفت الإمامة وسطهن كالعراة.... ويصف الرجال ثم الصبيان ثم الخنثى ثم النساء.... ويكره للنساء حضور الجماعة، ولا بأس بأن تخرج العجوز في الفجر والمغرب والعشاء عند أبي حنيفة رحمه الله تعالى، وقال أبو يوسف ومحمد: يجوز خروج العجوز في سائر الصلوات. (المختصر للقدوري: 29)

آیات و احادیث کے فہم و اختلاف کو آپ نے ملاحظہ کیا۔ اور فقہاء کرام کے اجتہادی اختلاف رائے کو بھی آپ نے دیکھا۔ ان مسائل کی وضاحت میں علماء و فقہاء، متن قرآن و متن حدیث میں الفاظ کی وضاحت، ان کے معانی سے اخذ شدہ نتائج اور مزید مسائل کا انکشاف یا ان کا حل، جب پیش فرماتے ہیں تو یہ سب متن کے علاوہ فروعات کہلاتے ہیں۔ یہ بھی فقہ میں بہت اہم چیزیں ہیں ان کی ابتداء صحابہ کرام سے ہوئی اور بدستور جاری و ساری ہے۔ صحابہ کرام نے ان

مَا خَذَا فَمِمْ آ پ ﷺ سے حاصل کیا۔ ان کا دور واجب، مسنون، مستحب اور مکروہ وغیرہ کی اصطلاحات سے مبرا تھا۔ تفریع و استنباط کا کام گود و صحابہ میں شروع ہو چکا تھا مگر اس کا وہ علمی طریقہ نہیں تھا جو بعد کے ادوار میں علماء نے متعارف کرایا بلکہ صحابہ اور علماء و فقہاء اپنے وجدانی ذوق سے معلوم کر لیا کرتے تھے۔ یہی کاوشیں چند شرائط کے ساتھ اسلامی فقہ کہلائی جاسکتی ہیں۔ جن کا تذکرہ آگے آ رہا ہے۔ قدیم کتب تفسیر میں الجامع لأحكام القرآن کے نام سے جو امام ابن العربیؒ اور ان کے شاگرد امام القرطبیؒ کی الگ الگ تصنیفات ہیں۔ دور حاضر کی تفسیر میں اضواء البیان مؤلف الشیخ الشنقیطیؒ، التفسیر المنیر از وہبہ الزحیلیؒ، ایسر التفاسیر از الشیخ ابوبکر الجزائریؒ اور اردو تفسیر میں تفسیر مظہری از قاضی ثناء اللہ پانی پتی، أحسن البیان از شیخ صلاح الدین یوسفؒ اور کتب حدیث میں صحیح بخاری اور سنن کی کتب، اس اسلامی فقہ کی جان ہیں اور اسی مقصد کے پیش نظر لکھی گئی ہیں تاکہ فقہ اسلامی کا صحیح ذوق متعارف کرایا جاسکے۔

غلط فہمیاں: فقہ کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں اور غلط رجحانات، ہمارے معاشرے میں عام پائے جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے فقہ کو محض فقہاء کرام کا جھگڑا اور اختلاف سمجھا۔ کیونکہ مختلف فقہی مسالک کی کتب میں یہ سب کچھ پڑھنے اور دیکھنے میں آتا ہے۔ اس طرح وہ اس سے یکسر کنارہ کش ہو گئے۔ بعض نے فقہاء کرام کے اقوال و فتاویٰ کو ہی صرف فقہ گردانا اور یوں وہ قرآن مجید و سنت رسول ﷺ سے بے نیاز ہو گئے۔ حالانکہ کسی فقیہ کی تمام فہمیاں کو من و عن قبول نہ کرنا اور بات ہے اور فقہ سے نفرت دوسری بات۔ جبکہ ایک معتدل مسلمان میں پہلی بات تو ہونی چاہئے اور دوسری سے اعلان براءت۔ اس لئے کہ مسلمان جب قیاس کو حجت مانتا ہے تو پھر فقہ سے نفرت کا کیا مطلب؟ ہاں فقہی استنباطات و مسائل میں تنقید ہوتی آئی ہے جس کی گواہی اور نقد کی شہادتیں ہمیں فقہاء اربعہ و مسلک اربعہ کی متون و شروح میں بکثرت ملتی ہیں۔ مذکورہ دونوں گروہوں نے جس افراط و تفریط سے کام لیا ہے اس نے عوام کو بھی قرآن و سنت کے صحیح فہم سے دور کر دیا ہے۔

یاد رکھنے کی بات: ایک ہی شریعت جس کا مصدر (Source) ایک ہو جس کا بھیجے والا رب العالمین ہو اور جو دنیا میں محض اس لئے آئی ہو کہ حیات انسانی سے متعلق جملہ امور و مسائل کا حل پیش کرے کیا اس میں اختلافات کی بھرمار ہوگی؟ دنیا میں نت نئے اور ان گنت حوادث رونما ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ یہ حوادث ایک جیسے نہیں رہتے بلکہ ہر لمحہ ان میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ جو حوادث ناقابل تغیر ہیں شریعت نے ان کی تفصیل و وضاحت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، مثلاً احوال شخصیہ یعنی عقائد و عبادات، موارد، نکاح و وفات جیسے امور میں تو اختلاف نہ ہونے کے برابر ہے۔ مگر جو امور تغیر پذیر ہیں ان کے بارے میں شریعت نے کچھ ایسے عام قواعد متعارف کرائے ہیں جن سے تمام حوادث کے احکام، استنباط کیے جاسکتے ہیں۔ ان استنباطات میں احوال، ماحول کی مناسبت سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ فقہاء کرام کے اختلاف کو بھی اس نظر سے دیکھنا چاہئے۔

علاوہ ازیں دین کی مبادیات اور اصولوں میں علماء دین کے مابین کبھی اختلاف پیدا نہیں ہوا اختلاف جب بھی رونما ہوا تو فروعات دین میں ہوا ہے۔ اور فکر و نظر کا اختلاف ہونا باعث حیرت نہیں بلکہ فطرت کے مطابق عین ممکن ہے۔ انسانوں کا کون سا بنا ہوا ایسا قانون ہے جس میں اتفاق ہو۔ اختلاف کی گنجائش ان میں بھی رہتی ہے۔ اس لئے فروعی مسائل میں جو بظاہر اختلاف ہوا وہ ہمارے مجتہدین کے فکری اختلاف اور نصوص شرعیہ (Qur'anic & Hadith's Text) کو واقعات پر منطبق (Apply) کرنے کی وجہ سے ہوا ہے۔

فقہ اسلامی کے مصادر

تکمیل دین کے بعد یہ غالب امکان تھا کہ مستقبل میں نئے مسائل پیش آئیں گے۔ اس لئے دین اسلام نے ایسے مسائل کا سامنا کرنے اور ان کا مناسب حل بتانے کے لئے کچھ ایسی بنیادیں فراہم کر دیں تاکہ مکلف لوگوں کو مسائل کے احکام کی طرف راہ نمائی کی جاسکے اور ان کا حل ممکن ہو سکے۔ یہ بنیادیں تفصیلی دلائل کہلاتی ہیں۔ دلائل، دلیل کی جمع ہے جس سے مراد ایسی راہ نمائی ہے جس سے عمل کا شرعی حکم معلوم ہو سکے۔ خواہ یہ راہ نمائی قطعی طور پر معلوم ہو سکے یا ظنی طور پر۔ جو قطعی ہے وہاں عقل کی گنجائش نہیں اور جو ظنی ہے وہ عقل سلیم کے لئے اس صورت میں قابل قبول ہے جب وہ اس عقل کے تقاضے پورا کرتی ہو۔ یہ تفصیلی دلائل دو قسم کے ہیں اصلی اور ذیلی۔

۱۔ اصلی (Original Sources) سے مراد قرآن مجید و سنت رسول ﷺ کے مآخذ ہیں۔ تمام ائمہ مجتہدین کا اس پر اتفاق ہے کہ شرعی احکام کے اصل مآخذ یہی دو ہیں۔ جن کے احکام کی پیروی کرنا لازمی ہے۔ جہاں کسی کی فکر یا رائے کی کوئی حیثیت نہیں۔ ایسے احکام کو تبعدی کہتے ہیں۔ ان دونوں کا مصدر چونکہ وحی ہے اس لئے انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ ذیلی (Secondary Sources): یہ وہ مصادر ہیں جو وحی کا درجہ نہیں رکھتے مگر اس کی تائید ضرور کرتے ہیں۔ اور اصلی مآخذ کے تابع ہیں۔ اس بناء پر ان کی حیثیت تسلیم کی گئی ہے۔ یہ اصطلاحات دراصل فقہاء کرام کا ابتکار ہیں جو انہوں نے اپنے اپنے ذوق اور فہم کے مطابق متعارف کروادیں۔ ان میں بعض فقہاء بعض مصادر کو تسلیم نہیں کرتے۔ مگر ان کی غالب اکثریت اجماع اور قیاس کی حیثیت مصدری کو مانتی ہے۔ یہ مصادر: اجماع (Consensus of Opinion) قیاس (Anology) استحسان (Juristic Preference) استصحاب (Presumption of continuity) اقوال صحابہؓ اور ہم سے ماقبل کی شریعت وغیرہ ہیں۔ ذیلی مآخذ کی حیثیت کا تعین اور ان سے احکام کا استخراج بھی قرآن و سنت سے یا ان کے مقاصد سے ٹکراؤ یا عدم ٹکراؤ کی بنیاد پر ہوگا

مثلاً: اگر کوئی یہ کہے کہ حالات اور زمانہ کی تبدیلی سے حدود کے احکام بھی بدلے جاسکتے ہیں جیسا کہ سیدنا عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں چور کا ہاتھ نہیں کاٹا تھا۔ تو آج بھی حالات اور واقعات کا ادراک کر کے چور کے ہاتھ نہیں کاٹے جاسکتے۔ یہ غلط قیاس ہوگا اور شریعت کے مقاصد سے ٹکراؤ ہوگا۔ جب کہ حقیقت حال یہ ہے کہ سیدنا عمرؓ کے دور میں یہ چوری زمانہ قحط میں ہوئی تھی اور محض اپنی یا بچوں کی بھوک مارنے کے لئے کی گئی تھی۔ خلیفہ راشد نے یہ سزا حدیث رسول ﷺ کے مطابق ادرؤا الحدود بالشبہات شرعی حدود و کوشبہات کی بنا پر نافذ نہ کرو۔ یہ ذمہ داری لیتے ہوئے ساقط کر دی تھی کہ بے سہارا لوگوں کی معاشی حالت کو سنو اور حکومت کا فرض ہے۔ شبہ کا فائدہ ملزم کو جانا چاہئے اس لئے کہ گناہ گار کا سزا سے بچ جانا اتنا معیوب نہیں جتنا بے گناہ کا سزا پانا ہے۔

مصادر کا مختصر تعارف

قرآن مجید

یہ خالص عربی زبان میں اللہ تعالیٰ کا معجزانہ کلام ہے اس کی تصنیف نہیں۔ اس کے الفاظ اور معنی دونوں منزل من اللہ ہیں۔ رسول اکرم ﷺ پر اپنے نزول کے بعد ہر دور کے لوگوں کے لئے یہ حجت قاطعہ ہے اس لئے کہ باطل نہ اس کے آگے سے حملہ آور ہو سکتا ہے اور نہ پیچھے سے۔ جناب رسالت مآب ﷺ نے

اسے من وعین امت تک پہنچایا ہے۔ جو تو اتر کے ساتھ امت کے پاس اپنی اصل حالت میں محفوظ ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کچھ اوامروں اور صراحت سے آگے ہیں جن کی اتباع کا مطالبہ مکلف انسانوں سے کیا گیا ہے۔ مثلاً:

اتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ... ﴿الأعراف: 3﴾
تم پیروی کرتے رہو اس کی جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے اور اس کے علاوہ کسی اور کو دوست بنا کر پیروی مت کرو۔

یہ بھی فرمادیا:

...تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا جَ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿البقرة: 229﴾
یہ اللہ کی حدود ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔ جو بھی اللہ کی حدود سے تجاوز کریں گے، وہی ظالم ہوں گے۔

البقرة: 229

یہ بھی ارشاد فرمادیا:

...وَلَا يُشْرِكْ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا ﴿الكهف: 26﴾
وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

الكهف: 26

صحابہ رسول ﷺ نے قرآن مجید اپنے آقائے نامدار ﷺ سے تلاوت اور حفظ یعنی دونوں طریقوں سے سیکھا۔ اس کے معنی و مفہوم کو سمجھا اور اس پر عمل کو بھی جانا۔ ابو عبد الرحمن المسلمی کہتے ہیں: ہمیں سیدنا عثمان بن عفان اور عبد اللہ بن مسعود جیسے لوگوں نے بتایا جو ہمیں قرآن سکھایا کرتے تھے کہ جب ہم رسول اکرم ﷺ سے قرآن سیکھا کرتے تو دس آیات کو جب تک ہم علم و عمل کے ذریعے سیکھ نہ لیتے اس وقت تک ہم اگلی آیت نہیں سیکھتے تھے۔ یعنی ہم نے قرآن مجید تو سیکھا ہی مگر اس کے ساتھ علم و عمل بھی سیکھا۔ مسلمانوں نے قرآن مجید کی ہر دور میں قابل قدر خدمت کی۔ اسے یاد کیا، اسے منتقل کیا، اس کی تفاسیر لکھیں، اس کی آیات حکم کو چنا اور ان پر اپنے اپنے ذوق کے مطابق قلم آزمائی کی۔ کتابت قرآن مجید بغیر کسی تحریف اور تبدیلی کے نسل در نسل باقی رہی۔ اور یوں قرآن مجید کی حقانیت نکھر کر سامنے آئی کہ:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴿الحجر: 9﴾
ہم ہی نے ذکر (قرآن) اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

الحجر: 9

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس میں ایک لفظ یا ایک آیت بھی کم یا زیادہ ہے تو اس سے سارا قرآن مشکوک ہو جاتا ہے۔ یا کہ ایک آیت کی تبدیلی ممکن ہے تو سارے قرآن مجید کی تحریف بھی ممکن ہے۔ اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے وعدے کے خلاف ہے، کہ معاذ اللہ! اللہ تعالیٰ اپنے کلام کی حفاظت نہ کر سکا۔

الفاظ قرآن و شرعی احکام: قرآن مجید میں احکام حلال و حرام کی وضاحت کے لئے کچھ اصول موجود ہیں۔ یہ احکام زیادہ تر مجمل (Ambivalent) ہیں اور مقاصد شریعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جن الفاظ کے ساتھ قرآن مجید میں شرعی احکام مذکور ہیں وہ تین قسم کے ہیں: کچھ الفاظ وہ ہیں جن کا تعلق لغت سے ہے جیسے ارض و سماء، شجر و حجر اور شمس و قمر وغیرہ، ان کا معنی بیان کرنا اہل لغت کا کام ہے نہ کہ شریعت کا کہ شجر کی تعریف کیا ہے: اور سماء کس میٹیریل سے بنا ہے۔ آنکھ سے کیوں نظر آتا ہے وغیرہ۔ ہاں شریعت یہ ضرور بتاتی ہے کہ اگر کوئی پتھر مار کر شیشہ توڑ دے تو اس پر نقصان کی تلافی لازمی ہے۔ نا محرم عورت پر نگاہ بد ڈالے تو گناہ ہے وغیرہ۔

بعض وہ الفاظ ہیں جن کا تعلق لغت کی طرح شریعت سے بھی نہیں بلکہ عرف سے ہے۔ یعنی سوسائٹی میں وہ ایک جانی بوجھی چیز ہیں مثلاً طلاق، نکاح، بیع، ہبہ، وقف، امارت، خلافت وغیرہ۔ شریعت صرف ان الفاظ سے متعلقہ احکام کو بیان کرتی ہے مگر نکاح، طلاق وغیرہ کیا ہیں یہ بتانا عرف کا کام ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ شریعت غیر مسلموں کے ان سب نکاحوں کو جائز سمجھتی ہے جو ان کے عرف کے مطابق ہوں۔ ان کے ہر اس لین دین کو جائز سمجھتی ہے جو ان کے عرف کے مطابق ہوں۔ ان عرفی اصطلاحات کا تعین کرنا شریعت کا کام نہیں۔

تیسرے وہ الفاظ ہیں جو شرعی اصطلاحات ہیں مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، صوم، طواف وغیرہ۔ ان الفاظ کے معانی کا تعین کرنا اور ان الفاظ کی وضاحت کرنا نہ لغت کا کام ہے اور نہ عرف کی ذمہ داری ہے بلکہ یہ کام کرنا صرف شریعت کے دائرہ اختیار میں ہے۔

ان تینوں اقسام کی پہچان کے بغیر یہ امکان ہے کہ شرعی الفاظ کو لغت کی کتابوں سے اور لغت کو شریعت سے اور عرف کو لغت یا شریعت سے کوئی تلاش کرتا پھرے تو یہ غلط تعبیر اور تشریح ہوگی۔ قرآن فہمی کا یہ انداز نہ صرف لاعلمی پر مبنی ہے بلکہ گمراہی کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ مثلاً لفظ خلافت ایک سیاسی عرفی اصطلاح ہے شرعی اصطلاح نہیں ہے۔ سیدنا داؤد و سلیمان علیہما السلام بادشاہ تھے اور خلیفہ بھی۔ جناب رسالت مآب ﷺ نے ان دونوں میں سے کسی لفظ کو اپنے لئے استعمال نہیں فرمایا۔ جناب صدیق اکبر خود کو خلیفہ کہلاتے رہے جب کہ سیدنا عمر فاروقؓ نے کچھ عرصہ اپنے آپ کو خلیفہ کہلوانے کے بعد امیر المومنین کہلوانا پسند فرمایا۔ لہذا یہ لفظ یا ایسے دوسرے الفاظ اس لئے شرعی لفظ نہیں ہو سکتے کہ قرآن مجید میں آگئے ہیں ہاں ان کے ساتھ شرعی احکام وابستہ ہوتے ہیں لفظ کی شرعی حیثیت نہیں ہوتی۔

امت کے ائمہ و مجتہدین کے ہاتھ میں قرآن کا چراغ دے دیا گیا کہ وہ اس کی روشنی سے زمان و مکان میں ہونے والے نئے واقعات کی جزئیات تک کا حکم بتائیں۔ شاید یہی وہ راز ہے جس سے اُمہ کو دوام ملا اور مل سکتا ہے اور شریعت کے اصولوں کا جامع (comprehensive) ہونا ثابت کرتا ہے۔ جہاں کہیں اختلاف اور جدال کا اندیشہ تھا وہاں قرآن مجید نے بعض ضروری تفصیل دے دی ہیں تاکہ اختلاف باقی نہ رہے۔ مثال کے طور پر: عقائد، اور عبادات کے اصول، یا پھر ایسے اسباب کی بنیاد رکھ دی ہے جس میں اختلاف ہونے نہ پائے۔ اور نہ کسی زمان و مکان میں تغیر پذیر ہوں مثلاً: میراث کے مسائل، محرّماتِ ابدیہ کا ذکر اور بعض جرائم کی سزا وغیرہ۔

فہم قرآن کی ضروری شرائط: قرآن مجید صرف کتاب ہدایت ہے۔ جو اسے پڑھتا ہے، یاد کرتا ہے، اس کے مفاہیم پر غور کرتا ہے، اس سے نصیحت حاصل کرتا ہے اور اس سے عبرت بھی پکڑتا ہے اس کے لئے تو قرآن مجید حجت ہے۔ صحیح حدیث میں ہے:

اقْرَؤِ الْقُرْآنَ فَإِنَّهُ يَأْتِي بِكُمُ الْقِيَامَةَ شَفِيعًا
لأَصْحَابِهِ. (صحیح مسلم: 804)
لوگو! قرآن پڑھا کرو کل قیامت کو یہ اپنے پڑھنے والوں کے لئے سفارشی بن کر آئے گا۔

اس لئے قرآن مجید میں تدبیر کرنا ضروری ہے تاکہ دل کے تالے کھل جائیں اور قلوب منور ہوں اور اپنی حدود سے یہ پڑھنے والوں کو آگاہ کر سکے اور ان سے عمل بھی کرا سکے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

كِتَبٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ... ﴿٢٩﴾
یہ عظیم کتاب ہم نے آپ ﷺ کی طرف اس لئے اتاری ہے کہ لوگ اس کی آیات میں غور و فکر کریں۔
ص: 29

یہ بھی فرمایا:

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ﴿٢٩﴾
کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔
محمد: 24

مگر جو قرآن مجید کے مطالعہ سے پہلے کسی اور نظریے، خیال یا عقیدے یا لٹریچر سے متاثر ہے تو اس کے لئے قرآن کتاب ہدایت نہیں ہو سکتی اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ قرآن سے ہدایت لینے کے لئے اپنے ذہن کو ہر قسم کے خیالات، نظریات اور رجحانات سے خالی کرے۔ اور ذہن کو قرآن مجید کے تابع کر دے۔

قرآن کی برکات: قرآن مجید کے بتدریج نزول میں بھی بڑا جمال ہے۔ اور احکام و مواظظ میں اپنا جلال، یہ وہ عظیم کتاب ہے جس سے بڑے بڑے پہاڑ بھی دہل جائیں۔ یہ رب کریم کا احسان عظیم ہے کہ اس نے اپنے پیارے بندوں کے دلوں کے لئے قرآن مجید کو ایک بہار بنا دیا ہے جس سے ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک اور زندگی کو روشنی میسر آتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے

وَهَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوهُ وَالتَّقُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (الانعام: 155)

اور اسی طرح یہ کتاب ہم نے نازل کی ہے، ایک برکت والی کتاب۔ پس تم اس کی پیروی کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو، بعید نہیں کہ تم پر رحم کیا جائے۔

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ بِالْحَقِّ لِنُحْكِمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ وَلَا تَكُنْ لِلْخَائِنِينَ خَصِيمًا (النساء: 105)

اے نبی ﷺ ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تو کہ جو راہ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔ تم بددیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والے نہ بنو، اور اللہ سے درگزر کی درخواست کرو۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

... یہ اللہ بزرگ و برتر کی کتاب ہے جس میں پہلے کی قوموں کا تذکرہ ہے، اور بعد آنے والی خبروں کا بھی، اور جو کچھ ہمارے ارد گرد ہے، یہ فیصلہ کن کتاب ہے، نہ کہ خدا نخواستہ بے ہودہ ہنسی یا دل لگی کی کتاب ...
(سنن ترمذی و دارمی)

جو عقل مند اسے چھوڑے گا اللہ تعالیٰ بھی اسے اپنے آپ سے توڑ دے گا جس نے اسے چھوڑ کر کسی اور سے راہنمائی چاہی تو وہ گمراہ ہو کر رہے گا۔ قرآن مجید ایک بہت متین رسی ہے اور اللہ کی طرف سے واضح نور بھی۔ اس میں دانائی کی باتیں ہیں جو صراطِ مستقیم دکھاتی ہیں۔

اس کی موجودگی میں خواہشات انسان کے قریب نہیں پھکتیں، نہ زبان گنگ ہوتی ہے۔ اور نہ ہی خیالات پر اگندہ ہوتے ہیں۔ اہل علم اس سے کبھی سیراب نہیں ہوتے، اور متقی لوگ اس سے کبھی نہیں اکتاتے۔ یہ نہ ختم ہونے والے عجائبات رکھتی ہے۔ یہ وہی کتاب ہے جسے سننے کے بعد جن بھی پکارا ٹھے: ... إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا ﴿۱﴾ الجن: 1۔ ہم نے بڑا عجیب قرآن سنا ہے۔

درحقیقت جس نے اس کا علم جان لیا وہ سب سے آگے نکل گیا۔ جس نے اس کے مطابق کہا وہ سچا ٹھہرا اور جس نے اس کے مطابق فیصلہ کیا وہ عادل شمار ہوا۔ اور جس نے اس پر عمل کیا وہ عند اللہ مآجور ہوا۔ جس نے اس کی طرف دعوت دی اس نے صراطِ مستقیم کی راہنمائی کر دی۔

سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم

سنت کے مختلف معانی: فقہ اسلامی کا دوسرا اہم مصدر سنت ہے۔ بلکہ بہت سے احکام میں سنت کو پہلا مصدر ہونے کا شرف حاصل ہے۔ علومِ دینیہ میں لفظ سنت ہر ماہر علم اور ہر علم (Science) کے ہاں اپنی اپنی اور الگ الگ تعریف رکھتا ہے۔ جو ذیل میں دی جاتی ہے۔

☆۔ اس لفظ کی نسبت اگر کسی انسان کی طرف ہو تو اس سے مراد وہ طریقہ و عمل ہیں جو اس سے صادر ہوتے ہوں اور وہ انہیں لازم سمجھتا ہو اور ان پر اس کی مداومت ہو۔ ان اعمال کا تعلق خواہ ان کاموں سے ہو جن کی وجہ سے اس کی تعریف کی جاتی ہے یا ان سے ہو جن کی وجہ سے اس کی مذمت کی جاتی ہے۔

☆۔ فقہاء کی اصطلاح میں سنت سے مراد وہ نقلی کام اور عبادات جو رسول اکرم ﷺ سے منقول ہوں یعنی وہ جو فرض نہ ہوں۔ بلکہ مندوب ہوں۔ سنت کا لفظ بدعت کے مقابلے میں بھی فقہاء کرام نے استعمال کیا ہے مثلاً وہ یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص سنت پر ہے یعنی اس کا عمل رسول اکرم ﷺ کے عمل کے مطابق ہے یا یہ کہہ دیتے ہیں کہ فلاں شخص بدعت پر ہے یعنی اس کا عمل آپ ﷺ کے عمل کے خلاف ہے۔ یا طلاق سنت اور طلاق بدعت کے الفاظ۔

☆۔ سنت سے مراد رسول اکرم ﷺ کا قول، فعل اور سکوت ہے اس اعتبار سے سنت، علماء اصول کے ہاں احکام شرعی کا ایک مأخذ ہے۔

☆۔ سنت سے مراد اسلاف میں سے کسی ایک کا یا چند افراد کا وہ طریقہ بھی لیا جاتا ہے جو انہوں نے ذاتی فہم یا ذوق کی بناء پر اختیار کیا ہوا ہو۔ یہ ان کا دراصل اجتہاد ہوتا ہے جو انہوں نے کسی آیت یا حدیث رسول یا حالات کو دیکھ سمجھ کر اپنایا ہوتا ہے اس سے مراد اسلاف کے جزوی اقوال اور فتاویٰ نہیں۔ مثلاً: سنت خلفاء راشدین یا فلاں کی سنت، جیسے الفاظ کہیں کہیں کتب میں مل جاتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ لفظ اور سنت رسول ﷺ ایک معنی نہیں رکھتے۔ سیدنا ابو بکرؓ اجتہادی قول و فعل، رسول اللہ ﷺ کی سنت کے برابر درجہ رکھتا ہو یا کسی بھی خلیفہ راشد کے اجتہادی قول کی اہمیت سنت رسول ﷺ کے برابر ہو۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس بناء پر خلفاء راشدین کی سنت سے مراد ان کا اجتہاد ہے۔

رسول اکرم ﷺ کو قرآن و سنت دونوں اکٹھے دیئے گئے تھے۔ اس لئے دونوں کا مصدر وحی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید اکیلا اپنے احکام کو واضح نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کے ساتھ سنت کا بیان نہ ہو۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے بارے میں خود ارشاد فرمایا:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۖ هُوَ أَلَّا وَحَىٰ
اور یہ رسول اپنی طرف سے بات نہیں کیا کرتا جو کہتا
ہے وہ وحی ہوتی ہے جو اس کی طرف کی جاتی ہے۔ (النجم: 3-4)

اس لئے دونوں مل کر ایک اصل بناتے ہیں جسے نص یا نصوص کہا جاتا ہے۔ شرعی احکام بتانے میں یہ دونوں ایک دوسرے سے مکمل تعاون کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِذْ كُنَّا مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَةِ اللَّهِ
وَالْحِكْمَةِ... (الأحزاب: 34)

اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے: وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ... ﴿الجمعة: ۲﴾۔ اور وہ رسول انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ امام شافعی، یحییٰ بن کثیر اور امام قتادہ کا کہنا ہے: کہ ان آیات میں حکمت سے مراد سنت ہے۔ کیونکہ جو چیز بیت رسول ﷺ میں پڑھی جا رہی ہے وہ یا تو قرآن ہے یا سنت۔ اور رسول ﷺ کتاب کے علاوہ جو کچھ سکھا رہے ہیں وہ سنت ہے۔

فقہ اسلامی میں سنت کا مقام

دین کے صحیح فہم کے لئے یہ شریعت کا اولین مطالبہ ہے کہ سنت رسول ﷺ سے واقفیت بہت ضروری ہے۔ اس بناء پر دین میں سنت کی اہمیت غیر معمولی ہے۔ ذیل کی آیات و احادیث میں اس مطالبے کے چند دلائل دیئے جاتے ہیں۔

۱۔ ہر صورت میں آپ ﷺ کی اطاعت:

آپ ﷺ کی اتباع اور اطاعت کا حکم بھی دیا: فرمایا:

...وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ قَوْمًا نَهَكُم
عَنْهُ فَأَنْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللَّهَ ط ... ﴿الحشر: 7﴾

جو اللہ کا رسول تمہیں دے اسے لے لو اور جس سے تمہیں روکیں اس سے باز رہو اور اللہ کی نافرمانی سے بچو۔

اسی طرح یہ بھی فرمایا:

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ﴿٣٢﴾ (آل عمران: 32)

آپ کہتے اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو پھر اگر وہ منہ موڑیں تو بلاشبہ اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

آپ ﷺ کی مخالفت کرنے سے ہمیں ڈرایا اور فرمایا:

... فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٦٣﴾ (النور: 63)

جو اللہ کے رسول کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں انہیں ڈرنا چاہئے کہ کہیں انہیں کوئی آزمائش نہ گھیر لے یا ان کے پاس کوئی دردناک عذاب نہ آجائے۔

آپ ﷺ کے حکم کے آگے ہماری پسند و ناپسند کو ختم کر دیا اور فرمایا:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُمِئِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ... ﴿٣٦﴾ (الأحزاب: 36)

کسی مومن کے لئے اور نہ کسی مومنہ کے لئے یہ مناسب ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو ان کے پاس اپنے معاملے کا کوئی اختیار ہو۔

ان تمام احکامات کو ایمانیات قرار دیا اور فرمایا:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِي مَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيَسْلَمُوا تَسْلِيمًا ﴿٦٥﴾ (النساء: 65)

تمہارے رب کی قسم! لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ اپنے اختلافات میں آپ ﷺ کو حکم نہ مان لیں پھر آپ کے اس فیصلے کے بارے میں اپنے دل میں کوئی تنگی نہ پائیں اور کلی طور پر اپنے آپ کو جھکا دیں۔

آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ.

تم میں کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے اس کے والد، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں۔

آپ ﷺ ہی ارشاد فرماتے ہیں:

لو كان موسى حيا لما وسعه إلا اتباعي.

اگر موسیٰ علیہ السلام بھی آج زندہ ہوتے تو ان کی نجات بھی میری اطاعت پہ منحصر تھی۔

آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

لا ألفين أحدكم متكئا على أريكته يأتيه الأمر
مما أمرت به أو نهيت عنه فيقول: بيننا وبينكم
القرآن فما وجدنا فيه من حلال استحللناه وما
وجدنا فيه من حرام حرماناه. ألا وإنی أوتيت
القرآن ومثله معه.

(سنن ابی داؤد باب لزوم السنة: 4604)

میں تمہارے کسی شخص کو اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ
مسند پر تکیہ لگائے بیٹھا ہو، اس کے پاس میرے
احکامات میں سے کوئی حکم آتا ہے جس میں میں نے
کوئی حکم دیا ہوتا ہے یا میں نے اس سے روکا ہوتا ہے
تو وہ کہتا ہے: ہمارے اور تمہارے درمیان قرآن ہی
کافی ہے۔ تو جو کچھ ہم اس میں حلال پائیں گے اسے
حلال سمجھیں گے اور جو کچھ حرام پائیں گے اسے حرام
جائیں گے۔ لوگو! ہوشیار رہنا، بلاشبہ مجھے قرآن دیا
گیا ہے اور اس سے ملتی جلتی بات بھی اس کے ساتھ
دی گئی ہے۔

یہ آیات اور حدیث اس شک کی جڑ کاٹ دیتی ہیں کہ سنت رسول ﷺ شرعی دلیل نہیں۔ مومن تو ان آیات کو پڑھنے کے بعد رسول معظم کو نہ صرف دلی احترام دیتا ہے
بلکہ اس کے ایمان میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے کہ آپ ﷺ اللہ کی طرف سے غیر معمولی نمائندے ہیں جن کے بارے میں اتنی شہود سے یہ ساری باتیں کی جا رہی
ہیں کہ اگر رسول ﷺ کو اہمیت نہ دی تو پھر ہر کوئی اپنے ایمان کی خیر منائے۔

مسلمانوں نے انہی آیات کے پیش نظر رسول کریم ﷺ کی ہر بات کو غور سے سنا، یاد کیا اور اسے من و عن اگلی نسل تک منتقل کیا۔ انہوں نے روایت و درایت
(حدیث فہمی) کا وہ معیار قائم کیا جو مذاہب کی تاریخ میں بے مثال ہے۔ امام ابن حزمؒ لکھتے ہیں:

ثقة راوی کی ثقة راوی سے روایت کا ایسا سلسلہ جو
رسول کریم ﷺ تک متصل ہو کر پہنچے یہ ایک ایسا اعزاز
ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ساری ملتوں کو چھوڑ کر
صرف اہل اسلام کو بخشا ہے۔ صحابہ کرامؓ اور ان کے
بعدا تبعین نے اس کا اہتمام خاص یوں کیا کہ جو کچھ
جناب رسالت مآب ﷺ سے سنا اسے انتہائی اخلاص
وامانت سے آگے پہنچا دیا۔ روایت حدیث میں انہوں
نے انتھک کوششیں کیں یہاں تک کہ یہ ذمہ داری ائمہ
حدیث پر آ گئی اور یوں حدیث رسول ﷺ کی
تدوین عمل میں آئی۔

نقل الثقة عن الثقة يبلغ به النبي ﷺ، مع
الاتصال، خص الله به المسلمين دون
سائر الملل فقد حرص الصحابة والتابعون
ومن بعدهم على أداء ما سمعوه من رسول
الله ﷺ بأمانة وإخلاص، وتحروا في النقل
حتى انتهی هذا إلى أئمة رجال الحديث،
ودونت السنة.

سچ ہے اگر ان کی غیر معمولی دقیق علمی سرگرمیاں جاری نہ رہتیں تو کون تھا جو ان احادیث کی اس طرح حفاظت کرتا؟ جب کہ حفاظت دین کے معیارات ہی
مختلف ہوں اور ضعیف و صحیح احادیث کے مابین فرق کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ یہی کامیاب کوششیں ہی تو تھیں جن کی وجہ سے ہر ایک کو غیر محتاط اور پختہ دلیل کے
بغیر استنباط، اجتہاد اور افتاء سے باز رہنا پڑا۔ انہی کوششوں سے ہی یہ ذوق لطیف بھی ایک حقیقت بن کر سامنے آیا کہ مسائل کے استنباط کے لئے یا مسائل کی
تصحیح کے لئے صحیح حدیث ہی کو معیار بنادیا جائے اور بنادیا گیا۔ یوں ضعیف و موضوع حدیث کو صحیح حدیث سے جدا کرنے کے باقاعدہ اصول قائم ہوئے۔

اور کارِ حدیث میں نااہل اور بدنیت لوگوں کا عمل دخل ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ محدثین نے آپ ﷺ کے تمام اقوال و افعال کو احادیثِ رسول ﷺ کے میزان پر تولّا۔ محض ظن و قیاس کی بناء پر انہیں رد نہیں کیا۔ ان کی یہ جہد مسلسل محض اس لئے باقی رہی کہ قرآن مجید کے پیچیدہ مقامات کی وضاحت جو ہادی برحق نے اپنے قول، عمل اور تقریر کے ذریعے فرمادی تھی اور جسے اللہ تعالیٰ نے شریعت کا مصدر اساسی بھی قرار دیا تھا اس کی بخوبی حفاظت کر لی جائے۔

۲۔ سنت کا انکار قرآن کا انکار: سنت رسول ﷺ کا انکار ناممکن ہے۔ اس لئے کہ شریعت کے بیشتر احکام پھر لایعنی ہو جاتے ہیں۔ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ کی تفصیل ہوں یا پھر بیع و شراء کے معاملات کیا انہیں حالات و زمانہ کی تبدیلی کے سپرد کر دیا جائے یا شخصی رائے پر اسی طرح چھوڑ دیا جائے۔ اس شخص کی اپنی حیثیت کا تعین کون کرے؟ اور کیسے کرے؟ اور کیوں کرے؟ سنت رسول ﷺ ایک ایسی حجت ہے جس کے انکار سے قرآن مجید کی بیشتر آیات کا انکار لازم آتا ہے۔ اوپر بیان کردہ آیات میں کیا ہماری مرضی، اختیار، پسندنا پسند، کسی اور کی اتباع وغیرہ کی کوئی گنجائش چھوڑی گئی ہے؟ سنت رسول ﷺ کے یہی احکام، آدمی سے جاہلی زندگی چھڑاتے ہیں جو حقیقی دین داری ہے۔ سنت کی پیروی ہی میں قرآن کی پیروی ہے۔ سنت رسول ﷺ عقائد، شریعت، اخلاق، آداب، اور فضائل و معارف کا بے بہا خزانہ ہے جو دراصل قرآن کے بیشتر مقامات کی تفسیر ہے۔ جناب رسالت مآب ﷺ کے دہن مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ قرآن پر اگر یقین کیا جاسکتا ہے تو اسی دہن مبارک سے نکلے ہوئے آپ ﷺ کے کلمات حدیث پر یقین کیوں نہیں کیا جاسکتا؟ قرآن مجید کی وحی آپ ﷺ پر اترے۔ اسے آپ ﷺ یاد فرمالیں اور آپ یہ فرمائیں کہ یہ وحی ہے جو مجھ پر اتری ہے اسے تو مان لیا جائے اور وہی رسول جب یہ فرمائیں کہ یہ بھی وحی مجھ پر نازل ہوئی جو آپ اپنے الفاظ میں بیان فرمائیں اس کے بارے میں شک ہو؟ اگر وحی کا مطلب صرف کتاب کا نزول ہے تو کتنے انبیاء کرام ہیں جن پر وحی نازل ہوئی مگر بغیر کتاب کے۔ تو کیا حال ہوا ان قوموں کا جنہوں نے اپنے انبیاء کی اس وحی کو نہ مانا؟ آخر مایسطق عن الہوی احادیث صحیحہ کی صفت نہیں تو اور کیا ہے؟

سنت قرآن کی مبین ہے: قرآن مجید میں وارد احکام کی معرفت سنت رسول ﷺ کی معرفت کے بغیر ممکن نہیں جناب رسالت مآب ﷺ نے لوگوں کو نازل کردہ دقیق و اہم دونوں احکام کی مکمل وضاحت فرمادی تھی۔ کھانے پینے، لباس اور مسکن کے بارے میں سمجھا بجا دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کیسے کی جائے؟ معاملات کیسے نمٹائے جائیں؟ باہمی شراکت اور بیع کیسے ہو؟ سب کچھ آپ ﷺ نے بتا دیا تھا۔

جناب سیدنا ابوذر غفاریؓ فرمایا کرتے: رسول اکرم ﷺ نے فوت ہونے سے قبل ہمیں شریعت کا ہر ضروری علم واضح کر دیا تھا یہاں تک کہ ایک پرندہ فضاء میں اپنے پر پھڑپھڑا چکا تو بھی آپ ﷺ نے ہمیں اس سے آگاہ فرمادیا۔ (مسند احمد: 5/153)

صحیح مسلم میں ہے: سلمانؓ فارسی کو کسی (یہودی) نے طعنہ دیتے ہوئے کہا: تمہارے نبی (ﷺ) نے تمہیں ہر شے کے بارے میں بتا دیا ہے یہاں تک کہ پاخانہ پھرنے کے بارے میں بھی؟ سیدنا سلمانؓ نے بڑے اعتماد سے جواب میں فرمایا: بالکل! آپ ﷺ نے تو ہمیں اس بات سے بھی روکا ہے کہ ہم پاخانہ یا پیشاب کرتے وقت قبلہ رو ہو کر بیٹھیں۔ سنت رسول ﷺ کی اس قانونی حیثیت پر آپ ﷺ کی زندگی میں اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد تمام صحابہ کرامؓ کا اس بارے میں اجماع تھا کہ چھوٹے بڑے تمام کاموں میں سنت رسول ﷺ کی پیروی کی جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے قرآن و سنت کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا۔

قرآن و سنت میں تفریق ناجائز: قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے اور شرعی مسائل جاننے کے لئے سنت رسول ﷺ ہی مبین (Expounder) ہوگی۔ اور اس کے مطالب کی شارح بھی۔ چاہے وہ مسئلہ قرآن و سنت میں ہی کیوں نہ مذکور ہو۔ قرآن و سنت کے درمیان اس معنی میں تفریق کرنا کہ اگر ایک مسئلہ حدیث میں ہو اور وہ قرآن کے خلاف ہو یا وہ مسئلہ قرآن میں نہ ملے تو پھر سنت رسول ﷺ سے لیا جائے گا درست نہیں۔ اسلاف کا مسلک یہی رہا ہے کہ جو کچھ نبی کریم ﷺ سے ثابت ہوا اسے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے قبول کر لیا۔ نہ انہوں نے اسے قرآن پر پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی اور نہ ہی سنن مشہورہ پر۔ کیونکہ قرآن و سنت میں اولاً تو تضاد نہیں مزید یہ کہ جس رسول محترم پر قرآن مجید اترا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی سنت قرآن مجید کے خلاف ہو۔ کیا یہ

اختلاف کسی دماغ کا پیدا کردہ تو نہیں؟ مزید یہ کہ سنت رسول ﷺ کا جو تعلق قرآن و حدیث سے ہے وہ شخصی رائے سے نہیں ہے۔ اس لئے یہ ہم پر فرض ہوگا کہ کتاب و سنت سے بیک وقت استفادہ کریں۔ اور انہیں ایک ہی مصدر جانیں۔ بعض لوگوں نے اسلاف کے قول و عمل کو بھی سنت کا مقام دے دیا ہے۔ ایسا اس صورت میں ممکن ہے جب اسلاف کا قول یا عمل صحیح حدیث کے مطابق ہو۔ ورنہ وہ سنت شمار نہیں ہوگا۔

احکام میں قرآن و سنت کا باہمی تعلق: قرآن کے احکام کی مختلف صورتیں علماء نے بیان کی ہیں۔ سنت رسول ﷺ یا تو ان کی مکمل تائید کرتی ہے یا ان کی وضاحت یا پھر وحی کے ذریعے اضافہ۔ ان کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں ہے کہ سنت رسول خدا نخواستہ قرآن مجید سے اختلاف کرتی ہو۔ ان کی تفصیل درج ذیل میں دی جا رہی ہے۔

۱۔ کچھ وہ احکام ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو نص کے ذریعے واضح کر دیے ہیں جیسے زکوٰۃ، نماز، حج، اعلانہ و چھپے فواحش کی حرمت، زنا و شراب کی حرمت اور مردار، خنزیر کا گوشت کھانے کی حرمت، اسی طرح وضوء کے فرض ہونے کا بیان وغیرہ۔ آپ ﷺ کے ارشادات میں انہی کی تائید ملتی ہے۔

۲۔ یہ وہ احکام ہیں جو قرآن مجید میں مجمل آئے ہیں۔ یعنی وہ تفصیل طلب ہیں۔ جنہیں رسول اکرم ﷺ نے اپنے قول اور عمل سے واضح فرمانا تھا چنانچہ آپ ﷺ نے واضح فرمادیا اس لئے کہ از روئے قرآن ایسا کرنا آپ ﷺ کی ذمہ داری ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ...وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ... ﴿النحل: 44﴾ ہم نے آپ کی طرف قرآن اس لئے اتارا ہے کہ آپ ﷺ اسے اچھی طرح واضح فرمادیں۔ جیسے نماز کے اوقات کی تفصیل، نماز کی رکعات، اور دیگر احکام نماز، اموال اور زکوٰۃ کی مقدار، مناسک حج، ذبح، شکار، کس جانور کا گوشت کھایا جائے اور کس کا نہیں؟۔ نکاح کی تفصیل، بیع و شراء، جرائم اور ان کی حدود وغیرہ۔

۳۔ وہ احکام جو آپ ﷺ نے ارشاد فرمائے مگر ان کا تذکرہ قرآن مجید میں نہیں۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کی اطاعت اور اتباع کو فرض قرار دیا ہے۔ اس سنت کی جو پیروی کرے گا وہ گویا کہ آیات الہی کو ماننے کا اقرار کرے گا۔ امام ابن القیم رحمہ اللہ نے اعلام الموقعین: ۲/۳۰۷ میں ان کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ قرآن کے احکام کے ساتھ سنت کے احکام کی وضاحت تین طرح سے آئی ہے:

۱۔ سنت کے احکام قرآن کے احکام کے مکمل طور پر موافق ہوں۔ اس طرح ایک ہی مسئلہ میں قرآن و سنت کا اتفاق ہوگا۔ جیسے نماز روزہ، حج زکوٰۃ کے فرض ہونے کے احکام، جو شرائط اور ارکان کے ذکر کے بغیر ہوں۔

۲۔ جو قرآن مجید نے چاہا سنت میں ان احکام کی وضاحت و تفسیر کر گئی۔ یعنی جہاں قرآن مجید نے مطلق بات کی تو سنت رسول ﷺ نے اسے مقید کر دیا، مجمل کہی تو سنت رسول ﷺ نے اس کی تفصیل بتادی۔ یا قرآن مجید کی بات عام ہے تو سنت رسول ﷺ نے اس کی تخصیص کر دی۔ مثلاً احکام نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، لین دین اور خرید و فروخت کے بارے میں قرآن مجید میں پوری تفصیلات نہیں ہیں۔ سنت رسول ﷺ نے انہیں مکمل تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

۳۔ سنت کے وہ احکام جن میں قرآن مجید خاموش ہے یا سنت رسول ﷺ نے کسی ایسی چیز کو حرام کیا جو جن کے بارے میں قرآن مجید خاموش ہو جیسے پھوپھی بھتیجی یا خالہ بھانجی کو بیک وقت نکاح میں رکھنے کو حرام قرار دیا، شادی شدہ زانی و زانیہ کو سنگسار کرایا، اور دو گواہ نہ مل سکنے کی صورت میں قسم کے ساتھ ایک ہی گواہی قبول کر لی۔ ایسے احکام کسی بھی صورت میں قرآن مجید کے ساتھ نہیں ٹکراتے بلکہ وہ قرآنی احکام پر اضافہ ہیں۔ یہ بھی شریعت ہے جسے ماننا فرض ہے اور نہ ماننا کفر۔ یہ نہ قرآن مجید سے آگے بڑھنے والی بات ہے اور نہ مخالفت کی بلکہ قرآن مجید کے حکم کے عین مطابق ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی اطاعت کرو جو عمل اور ایمان کا نام ہے۔

یاد رکھئے! کسی بھی ضعیف یا موضوع حدیث کو یا احادیث کے ظاہری اختلاف کو بنیاد بنا کر یا قرآن و حدیث میں بظاہر اختلاف کو پا کر یہ اصول بنانا درست

نہیں کہ یہ حدیث قرآن مجید کے خلاف ہے یا قرآن مجید پر اضافہ ہے بلکہ ایسے مواقع پر قرآن مجید و سنت رسول ﷺ کے بارے میں مزید آگاہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ قرآن مجید میں بھی بہت سی آیات ایسی مل جائیں گی جن میں باہم اختلاف ہے اور تضاد بھی۔

نیز خبر واحد بھی ایک علم ہے جسے عہد بہ عہد پوری امت نے روایت کیا ہے اگر یہ علم نہ ہوتی تو اس کا بیان کرنا اور اس کا روایت کرنا ممنوع اور حرام ہوتا۔ لہذا اس علم سے مستفید ہونا اور اس کے مطابق عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ اور از روئے قرآن اسے مسترد کرنا بھی ممنوع ہے۔ ہاں تحقیق کرنا ضروری ہے۔ اگر راوی عادل و ضابط ہے تو اسے قبول کیا جائے گا اور اگر فاسق و فاجر ہے تو تحقیق کے بعد اگر خبر غلط ثابت ہو جائے تو پھر اسے رد کر دینا چاہئے۔ ضروری نہیں کہ فاسق کی ہر خبر غلط ہو۔

کتابت حدیث: رسول اکرم ﷺ نے ابتدا میں قرآن مجید کے ساتھ کچھ اور لکھنے سے منع فرما دیا تھا مگر جب صحابہ کرامؓ اچھی طرح یہ جان گئے کہ قرآن اور حدیث کی کتابت میں فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے تو آپ ﷺ نے اپنی احادیث لکھنے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ خود بھی لکھوائیں۔ آپ ﷺ کے خطوط، جو آج مل گئے ہیں اور جو حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں دونوں کو ملا کر دیکھا جاسکتا ہے کہ حدیث کی کتابت کے ساتھ اس کو یاد کر کے اور اسے زبانی روایت کر کے کس قدر محتاط طریقے سے روایت کیا گیا ہے۔ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ آپ ﷺ کی احادیث تقریباً پچاس صحابہ کرامؓ نے لکھ کر اپنے پاس محفوظ کر لی تھیں۔ مؤطا امام مالکؒ دوسری صدی ہجری کی کتاب حدیث آج بھی ہمارے درمیان موجود ہے۔ سیدنا ابو ہریرہؓ، کے شاگرد رشید کا صحیفہ اور انہی کے معاصر معمر بن راشد کا صحیفہ دونوں طبع ہو چکے ہیں یہ پہلی صدی ہجری کی یادگار ہیں۔

اجماع

جمہور علماء اصول کے نزدیک فقہ اسلامی کا تیسرا مآخذ اجماع ہے اور مرتبے کے لحاظ سے قرآن مجید و حدیث رسول ﷺ کے بعد ہے۔

تعریف:

نفت میں: عربی میں اس کا معنی کسی چیز کے بارے میں متفقہ طور پر پختہ عزم و ارادہ کرنے کے ہیں۔ جیسے أجمع القوم علی هذا الأمر۔ لوگ اس معاملے پر عزم مصمم کے ساتھ متفق ہو گئے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے: فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَاجْمَعُوا أَنْ يَجْعَلُوهُ... جب وہ یوسف کو لے گئے اور سب نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اسے ڈال دیں۔۔۔

اصطلاح میں: جمہور علمائے اصول کے نزدیک اجماع کی تعریف یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی وفات کے بعد امت اسلامیہ کے تمام مسلم مجتہدین وقت کا کسی عملی مسئلہ کے شرعی حل پر اتفاق کر لینا، ایسا اجماع، اجماع مجتہدین کہلاتا ہے۔ یہ اجماع دلیل قطعی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا تعلق ان اجتہادی امور سے ہوتا ہے جہاں باریکیاں ہوں جیسے وراثت میں حقیقی بھائی کو ماں شریک یا باپ شریک بھائی پر مقدم رکھنا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اجماع، مجتہدین کے اتفاق کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کچھ مجتہدین اختلاف کریں تو وہ اجماع نہیں ہوگا۔ ایسی صورت میں نہ وہ حجت ہوگا اور نہ ہی قابل اتباع۔ جب کہ اجماع امت کی تعریف یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی وفات کے بعد پوری امت اسلامیہ کا کسی خاص شرعی حکم پر متفق ہو جانا۔ اس کا تعلق ہر مسلمان کے امور سے ہے۔ جیسے امت کا اجماع پانچ نمازوں پر اور تمام ارکان اسلام پر۔ غیر مجتہدین جو استنباط احکام پر قدرت نہ رکھتے ہوں ان کا کسی مسئلہ پر متفق ہو جانا اجماع نہیں کہلاتا۔ اسی طرح ائمہ اربعہ کا اجماع، اجماع امت نہیں۔ اس لئے کہ خلفائے راشدین کے اتفاق کو اجماع نہیں سمجھا گیا۔ کسی مسئلہ میں ان چاروں ائمہ کا اتفاق غلط بھی ہو سکتا ہے اور کئی مسائل میں ہے۔ مثلاً چاروں ائمہ طلاق ثلاثہ کو مؤثر قرار دیتے ہیں جو کہ کتاب و سنت کے خلاف ہے۔ کئی علماء نے اسے خلاف قرآن مجید و خلاف سنت رسول ﷺ قرار دیا ہے۔ المبسوط میں ہے: إن موقع الثلاث جملة مخالف للعمل بما في الكتاب (حجج ص 5) بیک وقت تین طلاقیں دینے والا قرآن میں دیئے گئے حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اسی طرح امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ بھی بیک وقت تین طلاق دینا

کتاب وسنت کی نافرمانی، شیطان کی اطاعت اور ظلم سمجھتے ہیں۔ اگر چاروں ائمہ کا اتفاق حجت اور اجماع مان لیا جائے تو کس قسم کے فعل کو جائز تسلیم کیا جا رہا ہے اور جو فعل رسول اللہ ﷺ کی سنت کے خلاف ہو اسے اجماع مان لیا جائے؟۔

رسول اکرم ﷺ کی زندگی میں اجماع کی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے کہ آپ ﷺ کی ذات شریعت کا مصدر تھی مزید یہ کہ اگر آپ کی رائے مجتہدین کی رائے سے مل جاتی تو یہ ایک سنت قرار پاتی اور اگر خلاف ہوتی تو شریعت میں اس کی کوئی اہمیت نہ ہوتی۔ اجماع کے شرعاً ہونے کی دلیل امام شافعیؒ کو اللہ نے جو بھائی اس کا ذکر اور پرہو چکا ہے۔

اجماع کا موضوع: اجماع کے لئے ضروری ہے کہ زیر بحث مسئلہ شرعی امور سے متعلق ہو۔ جس کی بنیاد عقیدہ پر ہو یا اس سے ملتی جلتی ہو یا اس سے متفرع ہوتی ہو۔

اجماع کے منعقد ہونے کی شرط: جس مسئلہ پر اجماع کیا جا رہا ہے وہ مسئلہ قرآن مجید وسنت رسول ﷺ میں مذکور نہ ہو۔ یا کسی نص میں ابہام ہو یا وہ نص تاویل کے قابل ہو۔ پھر اجماع کرنے والے مجتہد حضرات ہوں۔ نیز ان کے خیالات وافکار قرآن مجید وسنت رسول ﷺ کے موافق ہوں۔ بدعتی یا بدعت کی طرف بلانے والے حضرات نہ ہوں۔ جنہوں نے اجماع کیا ہو وہ سب کسی مستند دلیل کی بنیاد پر متفق ہوئے ہوں۔ ان صورتوں میں تو اجماع منعقد ہو سکتا ہے ورنہ نہیں۔ اگر اتفاق کے بعد کوئی مجتہد کسی دلیل کے مل جانے سے رجوع کر لیتا ہے اور اس کی رائے بدل جاتی ہے تو ایسی صورت میں وہ اجماع نہیں ہوگا۔

کیا اجماع ہوتا بھی ہے؟ اکثر فقہاء کرام کی رائے یہ ہے کہ اس کے واقع ہونے کا امکان ہے۔ جیسے دور صحابہؓ میں بہت سے مسائل میں اجماع ہوا مثلاً نانی کو چھٹا حصہ دینے پر اجماع یا اگر سگے بہن بھائی نہ ہوں تو باپ کی طرف سے ہونے والے بہن بھائی سگے بہن بھائیوں کی جگہ لے لیں گے یا خنزیر کی چربی کی حرمت پر اجماع اور مانعین زکوٰۃ کے خلاف جنگ پر اجماع یا مسلمان عورت کا نکاح کسی غیر مسلم سے نہیں ہو سکتا یا مفتوحہ اراضی کو مجاہدین کے درمیان اس طرح نہیں بانٹ دیا جائے گا جس طرح دوسرے اموال غنیمت بانٹے جاتے ہیں وغیرہ۔ مگر امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ اجماع کا عہد صحابہؓ کے بعد واقع ہونا انتہائی نادر ہے اور مشکل ہے غیر یقینی ہے۔ کیونکہ جن کا اجماع معتبر تھا وہ مختلف ممالک میں پھیل گئے اور بعد میں کبھی مل نہ سکے۔ یہی حال بعد کے علماء کا ہے۔ ان کی بات دل کو لگتی ہے اس لئے کہ چاروں مسلکوں کی بات تو بہت بڑی ہے کہ وہ کسی مسئلہ پر اجماع کر لیں ہمارے ہاں تو ایک ہی مسلک میں اصول وفروع تک میں اختلاف ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کی رائے یہ ہے: جو شخص اجماع کا دعویٰ کرتا ہے وہ جھوٹا ہے۔ یہی رائے امام ابن حزم، امام ابن تیمیہ اور امام شوکانی رحمہم اللہ کی بھی ہے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: اجماع کا معنی یہ ہے کہ علماء اسلام کسی حکم پر متفق ہو جائیں اور جب کسی حکم پر اجماع ثابت ہو جائے تو اس کی مخالفت جائز نہیں۔ اس لئے کہ پوری امت گمراہی پر متفق نہیں ہو سکتی۔ لیکن بہت سے مسائل ایسے ہیں جن میں اجماع کا دعویٰ کیا جاتا ہے مگر ان میں اجماع ہوتا نہیں ہے۔ بلکہ اس دعویٰ اجماع کے خلاف جو قول ہوتا ہے وہ کتاب وسنت کی رو سے راجح ہوتا ہے۔ اس پر تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ بعض ائمہ جیسا کہ فقہاء اربعہ ہیں ان کے اقوال نہ حجت لازمہ ہیں اور نہ ہی اجماع ہیں۔ بلکہ ان سے یہ ثابت ہے کہ انہوں نے اپنی تقلید سے منع کیا تھا اور یہ حکم دیا تھا کہ ان کے اقوال کو کتاب وسنت (قرآن مجید وسنت رسول ﷺ) کے مقابلے میں چھوڑ دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اکابر ساتھی اور پیروکار ہمیشہ جب ان کو کتاب وسنت سے دلیل مل جاتی تو وہ ان کے اقوال کو چھوڑ دیتے تھے اور کتاب وسنت (قرآن مجید وسنت رسول ﷺ) کی پیروی کرتے تھے۔ اس کی مثال مسافت قصر ہے تین دن یا سولہ فرسخ کی تحدید ایک ضعیف قول ہے۔ اس لئے کئی حنبلی علماء اور دیگر علماء نے یہ کہا کہ سفر کی حد اس سے بھی کم ہو تو نماز قصر کرنا جائز ہے جیسا کہ اہل مکہ نے عرفہ میں اور منیٰ میں نبی ﷺ کے ساتھ نماز قصر کی تھی۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۲۵ ص ۱۰)

اجماع کی اقسام: فقہاء نے دو بیان کی ہیں۔ جن میں پہلی قسم قوی شمار ہوتی ہے جب کہ دوسری قسم کمزور۔

اجماع صریح: مجتہدین کے متفقہ قولی یا عملی اظہار رائے کا نام ہے یعنی ہر مجتہد ملاقات کے وقت اس مجمع علیہ بات کے مطابق بات بھی کرے۔ ایسے اجماع کو ہم خبروں سے یا بالمشافہہ ملاقات سے یا خود دیکھ کر پہچان سکتے ہیں۔

اجماع سکوتی: ایک دو مجتہد علماء کسی مسئلہ کے بارے میں شرعی حکم بیان کریں پھر اس مسئلہ کا سبب اور علم دوسرے علماء کو بھی ہو جائے۔ اور انہی علماء کے زمانہ میں اسے خاصی شہرت بھی مل جائے لیکن دوسرا مجتہد اس پر کوئی اعتراض نہ کرے یا صراحت سے اس کا انکار نہ کرے اور نہ ہی تائید بشرطیکہ اظہار رائے میں اس کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ ایسا اجماع، اجماع سکوتی کہلاتا ہے۔ کچھ ائمہ کرام اسے اجماع کی بجائے حجت کا نام دیتے ہیں۔

قیاس

لغوی معنی: عربی زبان میں قیاس کا لفظ عام طور پر دو چیزوں کے برابر کرنے کے لئے بولتے ہیں مثلاً قست هذه الورقة بهذه الورقة میں نے اس ورق کو دوسرے کے ساتھ برابر کیا۔ یا علم فلان لا يقاس بعلم فلان فلاں کا علم فلاں شخص کے برابر کہاں؟ یا ایک چیز کو دوسری چیز سے ناپنے یا مقدار معلوم کرنے کو کہتے ہیں۔ جیسے قست القماش بالمیتر میں نے کپڑے کو میٹر سے ناپا۔ یا قیاس بین ہاتین الورقتین میں نے ایک ورق کا دوسرے سے مقابلہ کیا۔

اصطلاحی معنی: علماء اصول کی اصطلاح میں اس کی تعریف درج ذیل ہے:

هو حمل فرع على أصل في حكم بجامع
یعنی کسی مسئلہ کا قرآن و سنت میں کوئی حکم موجود نہ ہو اس کو کسی
دوسرے حکم کے ساتھ جو قرآن یا سنت میں موجود ہو معلوم کیا
جائے جب کہ ان دونوں کے درمیان مشترک علت پائی
جائے۔

جیسے، ہیروئن، چرس وغیرہ کا شراب پر قیاس کرنا۔ کتاب اللہ میں شراب کی حرمت کا حکم موجود ہے اب شراب کی علت نشہ ہے ہیروئن، چرس، وغیرہ میں بھی یہ علت پائی جاتی ہے اس علت میں اشتراک کی وجہ سے یہی حکم ہیروئن، چرس کو بھی شامل ہوگا۔ مجتہد کا کام صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ حکم کی علت کو پہچانتا ہے اور پھر اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ مقیس اور مقیس علیہ دونوں علت میں مشترک ہیں پھر دونوں کے بارے میں حکم کی وضاحت کر دیتا ہے۔

قیاس کے ارکان:

قیاس کی تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ قیاس کے چار ارکان ہیں۔ جو یہ ہیں۔ اصل، فرع، حکم اور علت۔

۱۔ اصل: اسے مقیس علیہ یا مشبہ بہ یا منصوص مسئلہ بھی کہتے ہیں۔ کسی مسئلہ کے بارے میں کوئی حکم جس نص سے ثابت ہو اس نص کو اصل کہتے ہیں۔ یعنی وہ جگہ جہاں حکم پایا جاتا ہے جیسے اوپر دی گئی مثال میں شراب (نمر) ہے۔

۲۔ فرع: اسے مقیس یا مشبہ یا غیر منصوص مسئلہ بھی کہتے ہیں۔ وہ مسئلہ جسے اصل پر قیاس کر کے اس کا حکم معلوم کرنا ہوتا ہے مگر نص سے کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا قیاس کے طریقہ کار پر عمل کر کے اصل میں جو حکم موجود ہو اس کا اطلاق اس پر کیا جاتا ہے۔

۳۔ حکم: اسے حکم شرعی بھی کہتے ہیں۔ جس سے مراد وہ شرعی حکم ہے جو اصل میں آیا ہے۔ اور جسے فرع میں ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے۔ جیسے شراب کی حرمت ہے۔ قیاس سے فرع میں جو حکم ثابت ہوتا ہے وہ دی ہوئی مثال میں چرس کی حرمت ہے۔ جو قیاس کا نتیجہ ہے۔ قیاس کا رکن نہیں۔

۴۔ علت: قیاس کا اہم ترین رکن ہے۔ جس سے مراد اصل اور فرع کے درمیان مشترک وصف کا پایا جانا ہے۔ یہی تو وصف ہے جس کی وجہ سے فرع کو اصل

کا حکم ملتا ہے۔ اگر یہی وصف یا اس سے مشابہ وصف نئے واقعہ میں موجود ہو تو اسے بھی اصل کے مشابہ سمجھا جائے گا۔ جیسے چرس میں نشہ کا وصف جو شراب اور چرس دونوں میں پایا جاتا ہے۔

قیاس کی شرائط: قیاس اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک اس میں یہ اہم شرطیں موجود نہ ہوں۔

۱۔ اصل حکم شرعی ہونے کی لغوی۔ کیونکہ لغات میں قیاس نہیں ہوا کرتا۔

۲۔ اصل ثابت ہو منسوخ نہ ہو۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ کسی موقع و مناسبت سے ایک حکم دیا گیا پھر اس مناسبت کے ختم ہونے کے بعد دوسرا حکم آ گیا اب یہ اصل ثابت نہیں ہے اس لئے کہ اب موقع محل اور ہے اس لئے سابق حکم پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہوگا۔

۳۔ اصل کا حکم کتاب و سنت کی نص سے ثابت ہو یا وہ مجمع علیہ ہو۔

۴۔ حکم اصل کی علت فرع میں پائی جائے اور کسی قسم کا کوئی فارق نہ ہو یا کوئی مانع نہ ہو جو اسے حکم اصل سے الگ کر دے یا اس کے حکم سے ملنے نہ دے۔ اگر علت صرف اصل میں ہی منحصر ہو یا اصل تک ہی محدود ہو اور کسی دوسری چیز میں اس کا وجود ممکن نہ ہو تو اس پر قیاس کرنا منع ہے۔ کیونکہ قیاس کے لئے یہ ضروری ہے کہ حکم کی علت میں فرع اور اصل دونوں شریک ہوں۔

۵۔ قیاس کی ان حدود و شرائط کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہوگا یعنی نص میں حکم کی علت تلاش کرنا ہوگی۔ مگر جہاں حکم کی علت نہ ہو وہاں مجتہد کو یہ علت از خود تلاش کرنا پڑتی ہے۔ یہی وہ قیاس کی قسم ہے جس میں مجتہد اور فقیہ سے بکثرت خطا ہوتی ہے۔ وہ اسے حکم کی علت سمجھتا ہے جب کہ وہ اس حکم کی علت ہوتی ہی نہیں ہے۔ مثلاً: جنگ جمل میں فتح کے بعد سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے بعض حامیوں نے (جو بعد میں خوارج کہلائے) خون پر جان اور مال کو قیاس کیا اور کہا: جب مخالفین کا خون بہانا حلال ہے تو ان کا مال بطور غنیمت اور ان کی جانیں بطور غلام اور لونڈیاں بنانا بھی ہمارے لئے حلال ہیں۔ یہ فاسد قیاس جب سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے سنا تو فرمایا: ٹھیک ہے سب سے پہلے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر قرعہ ڈالو وہ کس کے حصہ میں آتی ہیں۔ انہوں نے کہا معاذ اللہ! وہ تو ہماری ماں ہیں۔ امیر المومنین نے یہ بات اس لئے فرمائی کہ جب ماں کو لونڈی بنانا جائز نہیں تو مال غنیمت سمجھ کر ان کا مال لینا بھی جائز نہیں۔ اس طرح سیدنا علیؑ نے خوارج کے فاسد قیاس کے مقابلہ میں صحیح قیاس سے استدلال کیا اور ان کے قیاس کو رد کر دیا۔ یہی وہ احتیاط ہے جو مجتہد کو قیاس کرتے وقت ملحوظ رکھنا ہوگی ورنہ فرضی مسائل کے ڈھیر لگ جائیں گے جو اسلامی شریعت کو بدنام کرنے کا باعث بن سکتے ہیں۔

امام ابن القیمؒ فرماتے ہیں: ایسی علتوں کا سہارا لینا جن سے خدا نخواستہ صحیح حدیث رد ہو جائے شدت پسندی ہے۔ اگر سنن رسول ﷺ کو ان علتوں کے سبب ترک کرنا شروع کر دیا جائے تو صحیح احادیث و سنن کا تقدس پا مال ہو جائے گا۔ شرح سنن ابی داؤد لابن القیم مع عون المعبود ج ۱۰ ص ۳۴

یہ اصول شاید اس لئے بنایا گیا ہے کہ اگر غیر فقیہ صحابی کی روایت، قیاس کے خلاف ہو تو قیاس پر عمل در آمد اولیٰ ہوگا۔ مگر حدیث مصراۃ جو سیدنا ابو ہریرہؓ نے روایت کی ہے وہی تو سیدنا ابن مسعودؓ نے روایت کی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کون ان میں غیر فقیہ ٹھہرا؟۔

اسی طرح فرضی مسائل کا بعض حیلوں سے یوں قیاس کرنا کہ اگر اسلامی احکام کی زد میں فلاں فلاں مسئلے آجائیں تو ان سے کیسے خلاصی حاصل کریں۔ یہ اور ان سے ملتے جلتے قیاس فاسد ہوں گے اور شریعت کا استہزاء بھی۔

حجیت قیاس: جمہور علماء کے نزدیک قیاس اصول فقہ کا ایک اہم ستون ہے۔ اسے دلیل و حجت تسلیم کیا جانا چاہئے کیونکہ قرآن مجید و سنت رسول ﷺ، اقوال صحابہ سے اس کے دلائل ملتے ہیں۔ مثلاً:

قرآنی دلائل:

...فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِيَ الْأَبْصَارِ ﴿٢٠﴾ الحشر: ۲۰

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ﴿٢١﴾ يس: ۲۱

اللَّهُ الَّذِي أَنْزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَالْمِيزَانَط ... ﴿الشورى: 17﴾

میزان سے مراد وہ چیز جس سے معاملات کا وزن کیا جاتا ہے اور پھر ان کے درمیان اندازہ کیا جاتا ہے۔

... كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ... ﴿الأنبياء: 104﴾ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے اعادہ کو اس کی ابتداء سے تشبیہ دی ہے۔

وَاللَّهُ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فُسْفَنُهُ إِلَى بَلَدٍ مَيِّتٍ فَأَحْيَيْنَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا كَذَلِكَ النُّشُورُ ﴿فاطر: 9﴾

یہ سب آیات قیاس اور قیاس میں موجود ارکان اور شرائط کو پورا کر رہی ہیں۔ جو قیاس کے حجت ہونے اور اس کے جواز کا اشارہ دیتی ہیں۔

حدیثی دلائل:

آپ ﷺ کا جہیز عورت کو جس نے اپنی والدہ مرحومہ کی منت حج کے بارے میں پوچھا تھا کہ وہ حج کئے بغیر فوت ہوگئی۔ کیا میں اس کی طرف سے حج کر لوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بالکل حج کرو۔ بھلا بتاؤ! اگر تمہاری والدہ پر قرض ہوتا تو کیا تم اسے ادا کرتی؟ یہ تو پھر اللہ کا قرض ہے اور اللہ زیادہ حق دار ہے کہ اس کا قرض ادا کیا جائے۔ (صحیح بخاری، کتاب الصوم: ۲۱۰)

اسی طرح:

ایک آدمی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کے عرض کرتا ہے۔ میری بیوی نے سیاہ رنگ کا بچہ جنا ہے۔ میں اسے اپنا بچہ نہیں مان سکتا۔ آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: کیا تمہارے پاس کچھ اونٹ ہیں؟ اس نے عرض کی: جی ہاں! ہیں۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ان کا رنگ کیا ہے؟ اس نے کہا: سرخ۔ آپ ﷺ نے پھر فرمایا: کیا ان میں بھورے رنگ کا بھی کوئی اونٹ ہے؟ اس نے کہا: جی وہ بھی ہے۔ فرمایا: وہ کہاں سے آیا؟ اس نے کہا: شاید کوئی رگ ابھری ہوگی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر تمہارے ہاں جو بچہ ہوا ہے شاید یہ بھی کوئی رگ ابھری ہے۔ (صحیح بخاری، کتاب الطلاق، باب إذا عرض بئنی الولد: 227)

اقوال صحابہ: صحابہ کرامؓ نے سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کو نماز میں ان کی امامت پر قیاس کیا۔ مانعین زکوٰۃ کو تارکین صلاۃ پر قیاس کیا۔ شراب پینے پر کیا حد ہو؟ اسے حد قذف پر قیاس کیا کہ یہ بھی بہتان لگانے کے مترادف ہے۔ سیدنا فاروق اعظمؓ نے سیدنا ابوموسیٰ اشعریؓ کو قضاء کے بارے میں خط لکھا: پھر اگر کوئی ایسا معاملہ آپ کو پیش آئے جس کا حکم قرآن مجید و سنت رسول ﷺ میں نہ ملے تو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کیجئے پھر قیاس الأمور عندک پھر معاملات کو ایک دوسرے پر قیاس کیجئے اور ایک جیسے معاملات پہچانئے۔ (اعلام الموقعین ۸۶۱، اخبار القضاۃ ۷۰/۱)

ظاہر ہے صحابہ کرام کے یہ وہ قیاسات ہیں جہاں کتاب و سنت (قرآن مجید و سنت رسول ﷺ) میں کوئی نص نہیں۔ اس لئے جہاں نص نہ ہو، یا اجماع نہ ہو اور نہ ہی کسی صحابی کا قول ہو، وہاں قیاس کو اختیار کرنا اور اسے حجت ماننا ضروری ہے امام شافعیؒ نے سب سے پہلے قیاس پر گفتگو فرمائی اور اسے اجتہاد کے ہم معنی قرار دیا ہے۔

قیاس کیوں؟ وجوہات اور اسباب

قیاس علم و تحقیق کا نام ہے اور احکام شریعت کی پہچان کا راستہ بھی۔ نصوص یا اجماع کی عدم موجودگی میں اسے ہمارے فقہاء کرامؓ نے اس طرح اپنایا ہے جیسے پانی کی عدم موجودگی میں تیمم کیا جاتا ہے۔ قیاس کرنے کا اہل ایسا عالم ہوتا ہے جو کتاب اللہ کے احکام جاننے کے علاوہ قرآن کے فرائض و آداب، نسخ و منسوخ اور قرآن مجید کے عام و خاص کا ماہر ہو۔ سنت رسول ﷺ کے علم کے بعد سلف کے اقوال، اور ان کے اجماع و اختلاف اور عربی زبان کے علم سے بھی آراستہ ہو۔ مزید اس کی عقل سلیم اسے مشتبہات سے بھی آگاہ کر سکے۔ ایسا منصف ہو کہ یہ جان لے کہ اس نے یہ قیاس کیوں کیا؟ کہاں سے کیا؟ اور اگر

قیاس کے دوران فلاں فلاں دلیل وغیرہ کو ترک کیا تو کیوں کیا؟۔

قیاس ایک ایسی چیز ہونی چاہئے جس کا فطرت تقاضا کرتی ہو اور لوگوں کی ضرورت اس کو دعوت دیتی ہو۔ شریعت کے احکام دینے کا مقصد بندوں کی مصلحتیں پوری کرنا ہے اسی کو شرعی ضرورت کہتے ہیں۔ قیاس کو اختیار کرنے سے یہ غرض پوری ہو جاتی ہے۔ کیونکہ قیاس کا مطلب ہی یہ ہے کہ کسی معین واقعہ کے بارے میں قرآن یا سنت میں جو حکم موجود ہے اس کے مشابہ دیگر واقعات میں اگر علت مشترک نظر آتی ہو تو وہی حکم ان واقعات کے لئے بھی ہوگا۔

کتاب و سنت کی نصوص محدود ہیں اور مسائل و حوادث لامحدود۔ جن کا احاطہ اگر نصوص کرتیں تو شریعت ایک ضخیم شکل میں ہوتی۔ اس لئے نصوص میں جو علتیں اور مخفی مقاصد ہیں یا جن مقاصد کی طرف اسے اشارہ ملتا ہے یا ان سے استنباط ہو سکتا ہے۔ ان پر ایک فقیہ غور کرتا ہے یا کسی واقعہ کے بارے میں منصوص حکم موجود ہے اس کا اطلاق اسی جیسے واقعے میں جہاں علت مشترک پائی جاتی ہو وہاں قیاس کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کوئی نیا واقعہ یا صورت حال پیش آ جائے جو اس سے پہلے نہ تھی اور اس بارے میں کوئی منصوص حکم بھی نہیں تو قیاس کے ذریعے سے ایسے واقعات کے حکم کے لئے شریعت کا دامن تنگ نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف اور حکمت کا تقاضا ہے کہ شریعت کا وہ متعین طریقہ جو احکام کے بارے میں ہے یہ قیاس بھی اسی کے مطابق ہو۔ اس لئے شریعت کا یہ قاعدہ ہے کہ اگر ایک چیز حرام ہے تو اس کی نظیر بھی حرام ہوگی وہ مباح نہیں ہوگی۔ اور اگر ایک چیز مباح ہے تو اس کی نظیر بھی مباح ہوگی حرام نہیں ہوگی۔ اس لئے قیاس فقہ اسلامی کا ایک مأخذ ہے۔ اس سے استغناء نہیں برتا جاسکتا۔ صحیح قیاس عقلاً، قانوناً اور شرعاً عمل کا متقاضی ہے اور قابل ثواب و عبادت بھی۔

اجتہاد

لغوی معنی: اجتہاد کا مادہ ج ہ ہے یعنی جہد۔ جس کا معنی کوشش کرنا ہے۔ امام شوکانی فرماتے ہیں:

الإجتہاد فی اللغة مأخوذ من المشقة
والطاقة.
لغت میں اجتہاد کا لفظ جہد سے بنا ہے جس کا مطلب
کسی کام کے سرانجام دینے میں حتی الامکان کوشش
کرنا اور سخت محنت کرنا ہے۔

اصطلاحی معنی: علماء اصول نے اپنی اصطلاح میں اس کا معنی یہ کیا ہے:

بذل الوسع فی نیل حکم شرعی عملی
بطریق الاستنباط.
کسی عملی شرعی حکم کے استنباط کے لئے پوری
صلاحیت صرف کرنا اجتہاد کہلاتا ہے۔

اس اصطلاحی تعریف سے مندرجہ ذیل چھ نکات واضح ہوتے ہیں:

چھ نکات:

- ۱۔ اجتہاد کے لئے مجتہد کی معمولی نہیں بلکہ سخت محنت درکار ہوتی ہے ایسی کہ اس کی ہمت و طاقت سے باہر ہو جائے۔
- ۲۔ جو شخص شرعی حکم معلوم کرنے کی استعداد رکھتا ہو یعنی اسے قرآن مجید و سنت رسول ﷺ اور اس کے لوازمات کا پہلے سے علم ہو وہ اجتہاد کر سکتا ہے اس استعداد سے محروم، مجتہد نہیں کہلائے گا۔ اور اس کا اجتہاد ناقابل قبول ہوگا۔
- ۳۔ مسئلہ کی نوعیت شرعی ہو۔ مگر جن مسائل کا تعلق لغت، سیاست اور دیگر دنیوی معاملات سے ہو ان میں جدوجہد کرنے والے کو مجتہد نہیں کہا جاسکتا۔
- ۴۔ اجتہاد کے لئے ضروری ہے کہ زیر غور مسئلہ کا تعلق عملی مسائل سے ہو اور اس کی واقفیت سے غرض ہو۔ محض مشق نہ ہو۔ اسی طرح نظریاتی مسائل مثلاً: توحید و رسالت اور آخرت وغیرہ میں اجتہاد نہیں ہو سکتا۔

۵۔ جو مسئلہ کتاب و سنت اور اجماع سے ثابت ہو وہ اجتہادی مسئلہ نہیں اور نہ ہی اسے اجتہادی مسئلہ بنایا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ایسے مسائل قطعی طور پر ثابت ہیں جیسے نماز ادا کرنے، روزہ رکھنے، خالہ بھانجی یا پھوپھی بھتیجی کو بیک وقت نکاح میں نہ رکھنے، سچ بولنے، شادی شدہ زانی یا زانیہ کو سنگسار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جو شخص یہ شرعی احکام بیان کرتا ہے وہ مجتہد نہیں ہے اور نہ ہی یہ مسائل اجتہادی مسائل کہلائے جاسکتے ہیں مثلاً یہ کہنا کہ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ نماز فرض ہے یا یہ کہنا کہ امام شافعیؒ کا مذہب یہ کہ روزہ فرض ہے۔ وغیرہ۔ کیونکہ یہ مسائل تو نصوص میں موجود ہیں انہی کا نافرمانی ضروری ہے اس لئے جہاں نص ہو وہاں اجتہاد کرنا جائز نہیں۔

۶۔ اجتہاد کا تعلق صرف ان مسائل سے ہے جن کے بارے میں کوئی شرعی نص موجود نہ ہو یا نص اپنی دلالت میں ظنی ہو چاہے وہ قرآن کی کوئی آیت ہو یا خبر واحد۔ ایسی صورت میں مجتہد کا کام یہ ہوگا کہ وہ خبر واحد کے لئے محدثین کی طے شدہ شرائط کے مطابق، روایت اور اس کی راویوں پر غور کر کے یہ بتائے کہ وہ روایت کس درجہ میں صحیح ہے یا غیر صحیح ہے۔ تاکہ ظن سے نکل کر ثبوت میں آیا جائے۔ کیونکہ اجتہاد بھی قرآن کے ذریعے انجام پاتا ہے۔ اس لئے مجتہد کو یہ راہیں تلاش کرنا ہوں گی محض متن حدیث کو دیکھ کر رائے اور اجتہاد سے اس کے صحیح اور غیر صحیح ہونے کا فیصلہ کرنا درست نہیں ہوگا۔ اگرچہ بعض فقہاء اسے کافی سمجھتے ہیں اور اسے اجتہاد قرار دے دیتے ہیں مگر علمی، تحقیقی اور دیانتداری کے اعتبار سے ایسا اجتہاد، اجتہاد نہیں ہو سکتا۔ یا مجتہد قرآنی آیت میں لفظ کی ظنی دلالت پر غور کر کے اس کے معنی کو متعین کرے اور ایک دلالت کو دوسری دلالت پر ترجیح دینے کی کوشش کرے۔ یہی دونوں مقامات ایسے ہیں جن سے احکام مستنبط کرنے میں فقہاء کے درمیان اختلافات رونما ہوتے ہیں ایسے مواقع پر کہا جاتا ہے کہ اس مسئلے میں امام ابوحنیفہؒ کا مذہب یہ ہے اور امام مالکؒ یا امام شافعیؒ کا مذہب یہ ہے۔ اس معنی میں چاروں فقہ کو مذاہب اربعہ کہا جاتا ہے اور یہاں مذہب کا معنی اجتہاد ہے کہ فلاں امام کا یہ اجتہاد ہے۔

اجتہاد کی اہمیت: اسلام کے مکمل دین اور مکمل ضابطہ حیات ہونے سے مراد قرآن و سنت اور اجتہاد ہونا ہے۔ اجتہاد کو اگر اسلام سے خارج کر دیا جائے تو اسلام ایک نامکمل ضابطہ حیات قرار پاتا ہے۔ اجتہاد کی اس قدر اہمیت اس لئے ہے کہ قرآن و سنت کی نصوص میں احکام کی تعداد محدود ہے۔ جب کہ مسائل کی تعداد غیر محدود ہے۔ علاقائی اور عصری مسائل اس پر مستزاد ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ غیر منصوص مسائل میں اجتہاد کیا جائے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے اس وقت بھی اجتہاد کی حوصلہ افزائی فرمائی جب قرآن نازل ہو رہا تھا۔ جناب رسالت مآب ﷺ نے خود کئی مسائل میں اجتہاد فرمایا تا کہ امت کو اجتہاد کی شرائط اور سبیل بتا کر اس کا دروازہ کھلا رکھا جائے۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء سابقین علیہم السلام بھی اجتہاد سے کام لیا کرتے تھے۔ اسلام نے اجتہاد کی ترغیب دی۔ اس لئے شریعت میں کوئی ایسی چیز نہیں آئی جو اجتہاد کو کسی جگہ یا کسی زمانہ میں موقوف یا مقید کرتی ہو۔ بلکہ شریعت کی نگاہ میں اجتہاد ایسی چیز ہے جو ہر زمانہ میں ممکن ہے۔ عصر حاضر میں جو سہولتیں میسر ہو چکی ہیں یہ پہلے زمانہ کے مجتہدین کو کہاں میسر تھیں۔ شاید اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

لا يزال طائفة من أمتي منصورين على الحق
میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا یہاں
تک کہ قیامت آجائے گی۔
حتى تقوم الساعة.

اس لئے حنابلہ، ظاہریہ اور محدثین کے نزدیک اجتہاد کا دروازہ تا قیامت کھلا ہے۔ اجتہاد کی شریعت میں اجازت ہے مگر یہ اجازت نا اہل لوگوں سے بچنے کے لئے چند سخت شرائط کے تابع ہے۔ تاکہ وحی اور اجتہاد میں نمایاں فرق برقرار رہے اور یہ دونوں آپس میں خلط ملط نہ ہو جائیں۔

اجتہاد اور تفقہ: صحیح بخاری میں یہ حدیث ہے: من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين. (اللہ تعالیٰ جس سے بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں اسے دین میں فقیہ بنا دیتے ہیں)۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: یہ حدیث ثابت کرتی ہے کہ آپ ﷺ نے یہ چاہا ہے کہ جو دین میں تفقہ حاصل نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دین میں تفقہ حاصل کرنا فرض ہے اور دین میں تفقہ حاصل کرنے کا معنی یہ ہے کہ شرعی احکام کو سمعی دلائل سے معلوم کرنا۔ جو سمعی دلائل سے آگاہ نہیں ہے وہ دین میں فقیہ نہیں ہے۔

سمعی دلائل سے مراد قرآن مجید و سنت رسول ﷺ سے احکام معلوم کرنے کا وہ طریقہ ہے۔ جس میں ذوق، عقل سلیم، فاسد قیاس، وہم و ظن اور باطل رائے کی گنجائش نہ ہو اسی طرح مختلف حیلوں اور غیر معقول اعذار سے سمعی دلائل کو بھی رد کرنے کا نام فقہ نہیں ہے۔

امام ابن تیمیہؒ اپنے فتاویٰ میں ارشاد فرماتے ہیں:

والاجتهاد ليس هو أمر واحد لا يقبل التجزى والانقسام بل قد يكون الرجل مجتهدا في فن أو باب أو مسألة دون فن وباب ومسألة، وكل أحد فاجتهاده بحسب وسعه...

والاجتہاد کوئی ایسا کلیہ نہیں ہے جو تقسیم اور تجزی کو قبول نہ کرے۔

یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص کسی فن، باب یا مسئلہ میں مجتہد نہ ہو۔ ہر شخص کا اجتہاد اس کی طاقت کے مطابق ہے۔ فتاویٰ ج ۲۰ ص ۲۱۲

یعنی یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص ہر فن مولا ہو یا اسے دیگر فنون کی بھی لازماً مہارت ہو بلکہ ہر کوئی اپنے اپنے فن میں مجتہد بن سکتا ہے۔ ایک ماہر لسانیات ہو سکتا ہے تو دوسرا ماہر اقتصادیات، ایک علم الفرائض میں مجتہد بن سکتا ہے تو دوسرا عبادات میں۔ اکثر مجتہدین ایسے ہی مجتہد ہیں۔ ہمارے ہاں ایک ہی مسلک میں عبادات میں فتویٰ ایک مجتہد کا ہے، قضاء میں کسی اور مجتہد کا قابل ترجیح ہے اور سیر (سیرۃ کی جمع) میں کسی اور کا۔ بہر حال مجتہد کے لئے اتنا جاننا ضروری ہے کہ جس فن، باب اور مسئلہ میں وہ اجتہاد کرنا چاہتا ہے اس فن، باب اور مسئلہ میں اس کے سامنے سمعی دلائل کون سے ہیں۔ باقی مجتہد کے لئے دو تین درجن شرائط حقیقت میں غیر متعلقہ ہیں جو شاید اس لئے ہیں کہ مسلمان خوف زدہ رہیں اور مذاہب اربعہ کی قید سے نجات نہ پاسکیں۔

اجتہاد کی شرائط:

جو شخص اجتہاد کا راستہ اپنانا چاہتا ہے وہ یہ یاد رکھے کہ اجتہاد چونکہ فہم و فراست اور ذہانت کے استعمال کا نام ہے اور اس میں غلطی کا امکان بھی ہے۔ اس لئے اجتہاد کرنے والے کے لئے یہ ضروری ہے کہ:

- ۱۔ اسکی نیت اور اس کا عقیدہ صحیح ہو اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے علاوہ کسی شخصیت یا گروہ کے بے جا تعصب میں مبتلا نہ ہو۔
- ۲۔ وہ اپنے اجتہاد کی ذمہ داری خود قبول کرے۔ اپنے اجتہاد کو اللہ تعالیٰ و رسول ﷺ کی طرف منسوب نہ کرے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ و رسول ﷺ کی طرف غلط بات کو منسوب کرنا شرعاً حرام ہے۔ یہ قطعاً جائز نہ ہوگا کہ اجتہاد، مجتہد کا ہو اور اسے اللہ تعالیٰ و رسول ﷺ کا حکم قرار دے دے۔ ایسا کہنا گویا خود کو معصوم کہلوانا ہے۔ قرآن مجید وحدیث کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام جیسی برگزیدہ ہستیاں بھی کئی بار اجتہادی خطا سے دوچار ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان سے یہ غلطی نہ ہوتی مگر اللہ تعالیٰ نے از خود یہ غلطی کروائی تاکہ دنیا یہ سمجھ لے کہ نبی بشر ہوتا ہے کوئی مافوق الفطرت مخلوق نہیں اور نہ ہی خدائی اختیارات رکھتا ہے دوسرا یہ کہ نبی سے اجتہادی غلطی ہو سکتی ہے تو امتی تو بالاً ولی خطا کر سکتے ہیں۔ جب نبی کی خطا اللہ تعالیٰ کی بات نہیں ہے تو غیر نبی کی اجتہادی خطا کو اللہ تعالیٰ کی بات کہنا بالاً ولی حرام ہے۔ ہماری اس ساری گفتگو کی دلیل ملاحظہ کیجئے:

سیدنا نوح علیہ السلام نے اہل سے مراد نسبی اہل سمجھا تو ان کی خطا پر اللہ تعالیٰ نے انہیں مطلع کرتے ہوئے فرمایا:

إِنِّي آعِظُكَ أَنْ تَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿٤٦﴾ ہود: 46 میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ یہ باتیں نادانوں کی سی ہیں یعنی ایسی باتیں نہ کریں۔

سیدنا داؤد علیہ السلام کے اس فیصلہ پر کہ بچہ بڑی عمر والی خاتون کو دے دیا جائے جناب سیدنا سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ بچہ کاٹ کر دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر عورت کو ایک ایک حصہ دے دیا جائے جس پر بڑی عمر والی عورت بخوشی راضی ہو گئی مگر چھوٹی عمر والی خاتون نے کہا یہ بچہ میرا نہیں ہے یہ بڑی کا ہے اسے کاٹو مت بلکہ بڑی کو ہی دے دو۔ سیدنا سلیمان علیہ السلام نے وہ بچہ چھوٹی کو ہی دے دیا۔ چونکہ سیدنا داؤد علیہ السلام کے فیصلے کی اساس بڑی عمر والا ہونا تھا جو کہ درست نہیں تھی اس لئے ان کا اجتہاد درست نہیں تھا اور فہم نہ سلیمان ہی قابل تسلیم ٹھہرا۔

اُساری بدر کے معاملے میں سیدنا ابوبکرؓ کا مشورہ معاف کرنے کا تھا اور سیدنا عمرؓ کا قتل کرنے کا۔ مگر رسول اکرم ﷺ نے مشورہ صدیق کو پسند فرما کر ان قیدیوں سے فدیہ لیا اور رہا کر دیا۔ آیات جو بعد میں اتریں ان سے واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ اور جناب صدیق اکبرؓ کی رائے بنی برضاء الہی نہ تھی۔ قرآن نے اس کی نشان دہی کر دی۔

ان واقعات واجتہادات سے یہ معلوم ہوا کہ:

☆۔ اگر اجتہادی خطا کا ازالہ ممکن ہو تو اس کا ازالہ فوراً کرنا لازمی ہے جیسا کہ سیدنا سلیمان علیہ السلام نے کیا۔ اور اگر اجتہادی خطا کا ازالہ ممکن نہ ہو تو پھر وہ اجتہاد نافذ العمل رہے گا جیسا کہ جنگ بدر کے قیدیوں کے معاملہ میں ہوا۔ عدالت بھی اپنے فیصلہ کی اجتہادی غلطی معلوم ہونے پر اپنا فیصلہ واپس لے سکتی ہے۔

☆۔ سیدنا داؤد علیہ السلام کی موجودگی میں سیدنا سلیمان علیہ السلام نے اجتہاد کیا اور جناب رسول اکرم ﷺ کی موجودگی میں شیخین محترمین نے اجتہاد کیا۔ سیدنا سلیمان علیہ السلام اور جناب عمرؓ کا اجتہاد درست تھا جب کہ دونوں دوسروں کی نسبت چھوٹے تھے۔ داؤد علیہ السلام والد اور سلیمان علیہ السلام ان کے بیٹے تھے علم میں داؤد علیہ السلام اپنے بیٹے سے بڑھ کر تھے مگر جزوی فہم میں سلیمان علیہ السلام اپنے والد سے بڑھ گئے۔ رسول اللہ ﷺ ہر لحاظ سے سیدنا عمرؓ سے بڑھ کر تھے اور ابوبکرؓ بھی۔ مگر اجتہادی معاملہ میں چھوٹے لوگوں کی رائے بنی بر صواب ثابت ہوئی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ضروری نہیں کہ بڑے امام کی رائے بھی بڑی ہو اور صرف نام کو اہمیت دیتے ہوئے ان کے مقابل کسی چھوٹے کی رائے کو نظر انداز کر دیا جائے۔

☆۔ امام ابو حنیفہؒ مجموعی فہم میں قاضی ابو یوسفؒ سے برتر ہیں اسی طرح امام شافعیؒ اپنے شاگرد امام مزنیؒ سے۔ مگر ہر ایک کے فقہی مسائل کو دیکھا جائے تو بیشتر مسائل میں ان شاگردوں کا فہم اپنے اساتذہ کے فہم سے زیادہ صائب نظر آتا ہے۔ مثلاً قاضی ابو یوسفؒ اپنی کتاب الخراج میں لکھتے ہیں:

مال غنیمت کی تقسیم میں امام محترم جناب ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ جو مجاہد گھوڑے پر سوار ہوا سے دو حصے ملیں گے ایک اس مجاہد کا اور دوسرا اس کے گھوڑے کا۔ اس کے بعد قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گھڑ سوار کو تین حصے دیئے۔ ایک حصہ مجاہد کا اور دو حصے گھوڑے کے۔ امام ابو حنیفہؒ نے یہ حدیث سن کر مسترد کر دی اور فرمایا: لا أفضل بهيمة على رجل مسلم۔ میں کسی چوپائے کو مسلمان مرد پر فضیلت اور برتری نہیں دے سکتا۔ قاضی ابو یوسفؒ لکھتے ہیں: خود ہمارے شیخ محترم نے بھی تو چوپائے اور مجاہد کو برابر کا درجہ دے دیا ہے۔

☆۔ بعینہ امام شافعیؒ نے اپنے شیخ محترم امام مالکؒ کے کئی مسائل کی تغلیط کی ہے۔ یہ جزوی فہم کا اختلاف ہے جو فقہی کتب میں جا بجا آیا ہے۔ اور بعض اوقات مجموعی فہم پر اہمیت حاصل کر لیتا ہے۔ اور اسے ماننا پڑتا ہے۔ مزید یہ کہ ائمہ کرام میں سے کسی نے اپنے اجتہاد کو شریعت قرار نہیں دیا ہے کیونکہ کوئی مجتہد نہیں جانتا کہ اس کی اجتہادی رائے عین اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہے یا کہ نہیں ہے۔ ان کے اقوال اس بارے میں شاہد ہیں۔

☆۔ اس لئے فقہ حنفی، فقہ شافعی، فقہ مالکی، فقہ حنبلی اور فقہ جعفری کی اسی معنی میں کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے کہ وہ عین شریعت ہے۔ اسلامی شریعت کی خوبی یہ ہے کہ اس میں تضاد نہیں جب کہ فقہی اجتہادات میں تضادات نہ صرف قوی ہیں بلکہ اصولی ہیں۔ ایک چیز اگر فقہ حنفی میں حرام ہے تو فقہ شافعی میں وہ حلال ہے۔ فقہ حنفی میں ایک عمل نکاح ہے یا زنا، تو فقہ شافعی میں وہ زنا ہے یا نکاح۔ اگر ان اجتہادات کو شریعت مانا جائے تو خدا نخواستہ شریعت تضادات کا مجموعہ ہوئی جو بالکل غلط ہے۔ یہ ناممکنات میں سے ہے کہ شریعت مطہرہ میں ایک چیز بیک وقت حلال بھی ہو اور حرام بھی۔ نکاح بھی ہو اور زنا بھی۔ لہذا یہ فقہی مذاہب مختلف آراء کا مجموعہ ہیں۔ شریعت نہیں۔

دیگر شرائط اجتہاد:

۳۔ مجتہد کو عربی زبان کا اتنا علم ہو کہ وہ عبارات، الفاظ اور کلام میں وارد مختلف اسالیب کو سمجھ سکتا ہو۔ کیونکہ قرآن مجید جو اس شریعت کا اصل اصول ہے، اور سنت رسول ﷺ جو اس قرآن کی شارح، مبین اور تفسیر و تشریح کرتی ہے وہ بھی عربی زبان میں ہے۔

۴۔ اسے کتاب وسنت کی نصوص جیسے آیات احکام وغیرہ اور ان کی ناسخ ومنسوخ کا اتنا علم ہو کہ ان سے احکام کو اخذ کر سکتا ہو۔ اگر کوئی مسئلہ درپیش آ جائے تو وہ اس سے متعلق قرآن مجید میں جتنی آیات اور سنت رسول ﷺ میں جتنی احادیث ہیں ان سب کو اپنے ذہن میں تازہ کر سکتا ہو۔ اگر اسے قرآن مجید وسنت رسول ﷺ کا اتنا علم نہ ہو تو وہ مجتہد نہیں ہو سکتا اور نہ اسے اجتہاد کرنا چاہئے۔

۵۔ صحیح اور ضعیف حدیث کی پہچان کا اسے علم ہو جیسے اسناد کی معرفت اور علم رجال وغیرہ۔

۶۔ اسے اجماع اور مواقع اجماع کا علم ہو مبادا کہ وہ کسی ایسے مسئلہ میں فتویٰ دے بیٹھے جس پر پہلے اجماع موجود ہو۔

۷۔ اسے صحابہ کرامؓ، تابعینؓ اور بعد کے فقہاء کے مابین مسائل میں اختلاف، اس کے اسباب اور دلائل کا علم ہوتا کہ وہ ان میں صحیح کو غیر صحیح سے اور کتاب وسنت (قرآن مجید وسنت رسول ﷺ) سے قریب تر کو غیر قریب سے الگ پہچان سکے۔

۸۔ اسے اصول فقہ اور ان کے مابین اختلاف کا اور شریعت کے مآخذ سے احکام کو صحیح طور پر اخذ کرنے کے طریقے کا علم ہو۔

۹۔ اسے شریعت کے مقاصد، اس کے احکام کی علتوں اور ان کے پیچھے کارفرما حکمتوں کا علم ہو اور وہ یہ جان سکتا ہو کہ لوگوں کے مفادات میں سے کون سے شریعت کی نگاہ میں معتبر ہیں اور کون سے غیر معتبر؟

اجتہاد کا اجر: صحیح حدیث ہے:

مجتہد کسی حال میں اجر سے محروم نہیں رہتا۔ اگر اس کا اجتہاد درست ہے تو اسے دوا جریلیں گے ایک اس پر کہ اس نے اجتہاد کیا اور دوسرا اس پر کہ اس کا اجتہاد صحیح ہوا۔ اور اگر اس کا اجتہاد غلط ہوا تو اسے اجتہاد کرنے کا ایک اجر پھر بھی ملے گا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ اگر مجتہد کو غلطی کرنے پر کوئی اجر نہ ملتا تو کوئی شخص اس اندیشہ سے کبھی اجتہاد نہ کرتا کہ اس کا وقت بغیر کسی اجر کے یونہی ضائع جائے گا اور گناہ گار بھی ہوگا۔

اختلاف ہو تو حق ایک کے ساتھ ہوگا: بعض فقہاء کہتے ہیں اجتہاد کرنے والوں کے جتنے اقوال ہیں وہ سب درست اور صحیح ہیں۔ ان کا استدلال یہ حدیث ہے: أصحابی کالنجوم بأیہم اقتدیتم اہتدیتم۔ میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے تم جس کی بھی پیروی کرو گے ہدایت پا جاؤ گے۔ یہ حدیث محدثین کے نزدیک موضوع اور من گھڑت ہے اور عقلی طور پر بھی ناقابل تسلیم بھی۔ کیونکہ اگر اختلاف رحمت ہوتا تو پھر اتفاق ایک زحمت ہی ٹھہرتا۔ اس بارے میں صحیح مسلک امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اور دیگر جمہور فقہاء کا ہے اور وہ یہ کہ مختلف اقوال میں سے حق صرف ایک قول میں ہے۔ جو اگرچہ ہمارے لئے غیر متعین ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں متعین ہے کیونکہ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک چیز کسی شخص کے لئے بیک وقت حلال بھی ہو اور حرام بھی۔ صحابہ کرامؓ اختلافی مسائل میں ایک دوسرے کی غلطی واضح کیا کرتے تھے اور ایک دوسرے پر اعتراض بھی کیا کرتے تھے۔ اگر ہر مجتہد کا اجتہاد صحیح اور برحق ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کو غلط ٹھہراتے اور آپس میں اعتراضات کرتے۔

امام لکھنویؒ کا فیصلہ: اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کہ مسلم علماء فقہاء کے ہاں ہر دور میں اجتہاد ہوا ہے۔ ان اجتہادی کوششوں میں آپس میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ بعد کے ادوار میں بھی ایسا ہو رہا ہے۔ اس لئے فتویٰ دینے میں فقہاء کے مختلف اقوال اجتہادات مفتی کے سامنے آ جائیں تو ایسی صورت میں مفتی کو کیا کرنا چاہیے؟ مولانا عبدالحی لکھنویؒ امام الکلام میں فرماتے ہیں:

جو نظر انصاف رکھتا ہے اور کتب فقہ و اصول کے سمندروں میں غوطہ زن ہوتا ہے وہ یقیناً جان لے گا کہ بیشتر فروعی و اصولی مسائل میں علماء کا اختلاف ہے۔ لہذا محدثین کرام کا نکتہ نظر ہی اوروں کے نقطہ نظر سے قوی تر ہوتا ہے۔ میں جب بھی اختلافی مسائل سے گزرتا ہوں تو مجھے محدثین کا فیصلہ ہی انصاف کے قریب ترین نظر آتا ہے۔ بخدا ان کا کیا کہنا، اللہ ہی ان کو جزا دے گا۔ وہ کیوں نہ دے یہی تو سچے وارث نبی ہیں اور شریعت کے کھرے نمائندے۔ اللہ ہمارا حشر ان کے ساتھ کرے اور ان کی محبت و سیرت پر ہی ہمیں دنیا سے اٹھائے۔

﴿من نظر بنظر الانصاف وغاص في بحار الفقه والأصول متجنباً عن الاعتساف، يعلم علماً يقينياً أن أكثر المسائل الفرعية والأصلية التي اختلف العلماء فيها. فمذهب المحدثين فيها أقوى من مذاهب غيرهم وإنني كلما أسير في شعب الاختلاف أجد قول المحدثين فيه قريباً من الانصاف، فليله درهم عليه شكرهم. كيف لا! وهم ورثة النبي صلى الله عليه وسلم ونواب شريعته صدقاً، حشرنا الله في زمرةهم، وأمانتنا على جبههم وسيرتهم﴾

تدوین فقہ اور اس کے مراحل

زمانہ رسالت میں: رسول اکرم ﷺ کا زمانہ، زمانہ وحی تھا۔ شرعی احکام آپ ﷺ پر نازل ہوتے۔ جنہیں آپ ﷺ صحابہ کرام تک پہنچا دیتے۔ صحابہ کرام کیلئے بھی شریعت کا مصدر Source یہی قرآن مجید و سنت رسول ﷺ تھے۔ انہیں فقہی مسائل کی تمام باریکیوں کا علم بارگاہ رسالت سے معلوم ہو جایا کرتا تھا۔ کیونکہ وہ بیشتر معمول بہا مسائل کو جاننے کیلئے جہاں آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں سوال کرتے، وہاں بغور سنتے اور بہت باریک بینی سے اسے ملاحظہ بھی کرتے تھے۔

آپ ﷺ کے زمانہ میں یہی فقہ تھی۔ مگر ظاہر ہے مدون نہ تھی۔ ان دنوں شرعی احکام میں صحابہ و تابعین میں وہ بحث و تمحیص نہیں تھی جو بعد کے ادوار میں فقہاء کرام کی امکانی جدوجہد کا نتیجہ بنی۔ جن میں ارکان اسلام اور اس کی فروعات کو چند شروط و قواعد کے ساتھ اصطلاحی نام دیئے گئے۔ تاکہ ان کی اہمیت واضح ہو۔

صحابہ کرامؓ نے نبی کریم ﷺ کو وضوء کرتے، نماز پڑھتے، حج کرتے، روزہ رکھتے اور معاملہ کرتے دیکھا۔ اور آپ ﷺ سے ہر ایک کی اہمیت بھی جانی۔ اور اسے وہ حیثیت دی جو ایک باعمل، خدا ترس اور حُب رسول ﷺ سے سرشار کوئی بھی مومن دے سکتا ہے۔ اور اس کے بہتر نتائج **بالحاح** رب کریم سے چاہتا ہے۔

آپ ﷺ سے انہوں نے سنا: ویلٌ للأعقاب من النار (م) خشک ایڑیوں کیلئے آگ کا عذاب ہے۔ یہ بھی آپ ﷺ نے فرمایا: ارجع فأحسن وضوءک۔ واپس جاؤ اچھی طرح وضوء کرو۔ (أبو داؤد) نماز کے بارے میں آپ ﷺ سے یہ سنا: صلّوا کما رایتُمونی أصلی۔ نماز اس طرح پڑھو جیسے مجھے پڑھتا دیکھو۔ حج کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا: خذوا عني مناسککم۔ مجھ سے اپنے لئے مناسک حج سیکھ لو۔

یہ سب ارشادات اپنی جگہ بلاشبہ اہم ہیں۔ مگر صحابہ کرامؓ نے ان تمام عبادات وغیرہ کو بغیر یہ سوچے اور بغیر یہ سنے کہ یہ رکن ہے۔ یہ فرض ہے۔ یہ مستحب ہے یا یہ ادب ہے۔ آپ ﷺ کو بغور دیکھتے گئے۔ اور دل و جان سے ان پر عمل کرتے گئے۔ ان کے بارے میں سوال شاذ و نادر ہی کیا کرتے۔

آپ ﷺ نے نہ تو صحابہؓ کو بتایا کہ وضوء کے چار فرض ہیں یا چھ۔ اور نہ ہی یہ کہ جہری نماز میں سورہ فاتحہ سے قبل بسم اللہ اونچی آواز سے پڑھنا فرض ہے یا سنت۔ مگر بلاشبہ آپ ﷺ کے ادا شدہ الفاظ اور کیفیت سے صحابہ کرامؓ اس مسئلہ کی اہمیت کو باسانی سمجھ جاتے تھے۔

آپ ﷺ کے دور میں سنت کا علم نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے احکام میں صحابہ کرامؓ نے اجتہادات بھی کئے۔ مگر آپ ﷺ نے نہ انہیں ڈانٹا اور نہ ہی ایسا کرنے کو غلط کہا۔ اس لئے اچانک ایسا معاملہ پیش آنے پر جبکہ وہ آپ ﷺ سے دور ہوں یا آپ ﷺ بذات خود کہیں اور ہوں۔ تو انہیں اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آتا تھا۔ کہ وہ سوچیں اور مسئلے کا حل نکالیں۔

نماز عصر بنو قریظہ میں جا کر پڑھنے کا معاملہ ہوا یا یمن میں تین شخصوں کا ایک لڑکے کے بارے میں دعویٰ دار ہونے کا مقدمہ اور قرعہ سے حضرت علیؓ کا فیصلہ دینا اور باقیوں کو تہائی تہائی دیت ادا کرنے کا کہنا۔ آپ ﷺ کو جب اس فیصلے کا علم ہوا تو آپ ﷺ خوب ہنسے یہاں تک کہ مسوڑھے تک نظر آنے لگے۔

سعد بن معاذ نے بنو قریظہ کے بارے میں اپنے اجتہاد سے فیصلہ کیا جسے آپ ﷺ نے پسند فرما کے کہا: تو نے ان کے بارے میں ٹھیک وہی حکم کیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ساتوں آسمانوں کے اوپر فرمایا تھا۔

مجسّر مدلجی نے قیاس و قیافہ کر کے جب زیدؓ و اسامہؓ کے قدم دیکھ کر کہا کہ آپس میں ایک ہیں یہ دونوں باپ بیٹا ہیں۔ تو حضور اکرم ﷺ اس قدر خوش ہوئے کہ چہرہ مبارک کی رگیں چمکنے لگیں۔ جو اس قیاس کی صحت اور صحیح مطابقت کی وجہ سے تھی۔ بظاہر حضرت زیدؓ سفید رنگ کے تھے اور اسامہؓ سیاہ رنگ کے۔

لیکن قیافہ شناس نے فرع کو اصل سے اور نظیر کو نظیر سے ملا دیا۔ اس لئے فیصلوں میں سیاہی اور سفیدی کا فرق غیر مؤثر ہوتا ہے۔

آپ ﷺ کی یہ رضامندی تب ہی ہوتی تھی جب لوگ واپس آ کر معاملے کی وضاحت کر دیتے۔ غلط ہوتا تو اسے درست فرما دیتے ورنہ رضامندی ظاہر فرماتے۔

زمانہ صحابہ میں: آپ ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کرام کا Source بھی کتاب و سنت (قرآن مجید و سنت رسول ﷺ) ہی رہا۔ حالات جیسے بھی بنتے گئے صحابہ کرام انہیں کتاب اللہ تعالیٰ و سنت رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں دیکھتے گئے۔ اگر ان پیش آمدہ مسائل کا حل مل جاتا تو درست ورنہ وہ سوچتے اور اجتہاد کے ذریعے اس کا حل تلاش کرتے۔ یہی ان کا طریقہ کار رہا کہ مسائل کے حل کے لئے سب سے مقدم قرآن مجید، پھر احادیث رسول رسول ﷺ ان کے سامنے ہوا کرتی تھیں۔ مثلاً:

■..... آپ ﷺ کی وفات پر یہ مسئلہ کھڑا ہوا کہ آپ ﷺ کو کہاں دفنایا جائے؟

■..... آپ ﷺ فوت بھی ہوئے ہیں یا نہیں؟

■..... آپ ﷺ کے بعد خلیفہ کون ہو؟

■..... لشکر اسامہ کو روانہ کیا جائے یا نہیں؟

■..... رسول اللہ ﷺ کی میراث اور اس کی تقسیم کا معاملہ۔

■..... منکرین زکوٰۃ کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟

■..... جمع قرآن۔

اس ضمن میں صحابہ کرام کی مختلف آراء نے فہم کے اختلاف کو ظاہر کیا۔ چنانچہ مسائل کے حل کیلئے انہوں نے ایسے اصولوں پر اتفاق کیا۔ جن کی مستقبل میں زمانہ اور حالات کی تبدیلی کے باوجود اساسی وابدی حیثیت برقرار رہے۔ مثلاً یہ اصول:

..... جو مسائل قرآن مجید و سنت رسول ﷺ میں واضح ہیں انہیں من وعن لیا جائے اور اپنی رائے کا دخل نہ دیا جائے۔

..... کسی بھی پیش آمدہ مسئلہ کے حل کیلئے اولاً قرآن مجید و سنت رسول ﷺ دیکھا جائے اگر اس میں مل جائے تو خیر ورنہ

..... حدیث رسول ﷺ میں اسے تلاش کیا جائے۔ اگر حدیث مبارکہ میں وضاحت ہو تو درست بصورت دیگر

..... صحابہ کرام کی متفقہ رائے و اجتہاد پر نظر کی جائے ورنہ

..... اجتہاد کیا جائے۔

یہی دستور خلافت راشدہ کے دور کا رہا۔ اور تقریباً باقی صحابہ کرام کا بھی۔

یہ اصول بھی دیکھنے میں آیا کہ اگر صحابہ کرام میں سے کسی کا اجتہاد دورائے بعد میں معلوم ہونے والی حدیث رسول ﷺ کے خلاف ہوتا۔ تو وہ اپنے اجتہاد و رائے کو واپس لے لیتا۔ جیسے حج تمتع کی ممانعت کا آرڈیننس یا بیک وقت دی گئی طلاق ثلاثہ کے بارے میں آرڈیننس۔

فقہ اسلامی کی یہی وہ اساس تھی جو صحابہ کرام کے دور میں فراہم کر دی گئی تھی۔ بعد میں فقہاء و علماء امت نے بھی اسی کی بنیاد پر فقہ کی عمارت کھڑی کی۔

زمانہ تابعین و مابعد میں: اس طرح تابعین و تبع تابعین اور ان کے بعد کے عصور میں کچھ فقہاء امت ایسے سامنے آئے جنہوں نے اپنی فقہی بصیرت اور فہم کی بنیاد پر اسلامی فقہ کی روشنی میں پیش آمدہ مسائل کا حل نکالنے کی درج ذیل کوششیں کیں:

① اصول بنائے۔

② قرآن مجید و سنت رسول ﷺ کی نصوص کو اصطلاحات کی شکل دی۔

③ اقوال صحابہ اور ان کے فتاویٰ سے مدد لی۔

④ جدید اصطلاحات کو متعارف کرایا۔

⑤ فروعات پر کام ہوا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان فقہاء کی فقہی حیثیت مسلمہ تھی۔ مگر مسائل کی جدت، تنوع اور حالات کی تبدیلی کے پیش نظر ان فقہاء کے تلامذہ نے بھی اپنے اپنے دور میں اپنے پیش رو فقہاء کی اجتہادی آراء کے مقابلے میں اپنے اختلافی نوٹ لکھے۔ اور بیان کئے۔ اس فقہی توسع نے مسائل کی سمیل نکالی۔ اور بے جا سختی و تنگ نظری کو خیر باد کہا۔ جن فقہاء کا مزاج حدیث و سنت رسول ﷺ کی طرف زیادہ مائل رہا ان کا دیگر فقہاء کے نکتہ نظر سے اختلاف باقی رہا۔

قرون اولیٰ میں علماء و فقہاء کا رجحان زیادہ تر نصوص ہی کی طرف رہا۔ عام مجتہدانہ کوششیں بھی براہ راست کتاب و سنت سے ماخوذ ہوتی تھیں۔ اور تمام عدالتی، معاشرتی، معاشی، خانگی معاملات کے فیصلہ جات انہی مذکورہ بالا اصولوں کے مطابق ہی ہوتے رہے۔ ان تمام مسائل پر شرعی دلائل کی روشنی میں غور ہوتا اور باہم اختلاف و غلطی کے امکان کے باوجود تمام اساتذہ، شاگرد، حج حضرات خوب غور و خوض کے بعد ایک دوسرے کی رائے کو قبول فرماتے اور یوں وقت کے مسائل کو حل کر لیا جاتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ اپنی رائے پر قائم رہتے لیکن حسن ظن اور دینی محبت کے تعلقات بدستور قائم رہتے۔ اور یوں قرآن مجید و سنت کی فقہی بصیرت اس دور کے فقہاء کی کثیر تعداد کو حاصل رہی۔ یہ مجتہدانہ فکر ان نیک، پاک باز ائمہ اجتہاد کے بعد مختصر عرصہ رہی جس کا اندازہ حضرت شاہ ولی اللہ نے چوتھی صدی ہجری کے آخر تک کا لگایا ہے۔

خیر القرون کے آخری دور میں غیر مسلموں کی فلسفیانہ کتب مسلم علماء کے ہاتھ لگیں۔ تو ان کے تراجم ظاہر ہونے کے بعد مسلم معاشرہ میں بہت سا فکری اختلاف در آیا۔ اجنبی نظریات اور غیروں سے اختلاف نے مسلم علماء کے رجحانات کو عقلی و فکری طور پر تقسیم کر دیا۔ اس طرح علماء و فقہاء کے درمیان شریعت سے مستفید ہونے کے دو نظریات دیکھنے میں آئے۔

① پہلا نظریہ یہ بنا کہ قرآن مجید و سنت رسول ﷺ کے بیشتر مسائل عقل سے قریب تر ہیں۔ مزید استدلال کی گنجائش ان میں ہے۔ مگر اس گنجائش میں نصوص کو بدلا یا چھوڑا نہیں جاسکتا۔ نصوص کو بہر حال عقل پر ترجیح ہوگی۔ دوسرے معنوں میں استدلال کو نصوص کے تابع رکھا جائے گا۔ یہ لوگ اہل حدیث کہلائے جن کی کوشش یہ رہی کہ قرآن کریم کے ساتھ ساتھ صرف صحیح احادیث کو ہی فقہی مسائل کے استنباط کے لئے چنا جائے اور عمل کے لئے بھی انہی کا انتخاب کیا جائے تاکہ لوگوں کا جناب رسالت مآب ﷺ سے تعلق ایمان، محبت اور اطاعت میں صحیح انتخاب پڑی ہو۔ اور یوں مستقبل میں بھی در آمدفتنوں سے محفوظ رہیں۔ اس سلسلے میں ان کے ہاں یہ پک بھی دیکھنے میں آئی کہ صحیح احادیث کی عدم موجودگی میں ضعیف حدیث پر عمل کرنا اور اس سے استدلال کرنا قیاس یا ذاتی رائے کی نسبت احسن ہے۔

② جب کہ دوسرے نظریے کے قائل یہ کہتے کہ عقلی استدلال کی بہت گنجائش تو ہے مگر ایک صاحب رائے کی فہم و بصیرت کو نصوص کے فہم پر چھوڑا جاسکتا ہے وہ جو سمجھے اس کی اقتداء کی جاسکتی ہے۔ اس لئے کہ اس کی رائے ایک وقیع رائے بھی ہو سکتی ہے۔ اس ضمن میں کوئی فقیہ یا عالم، قرآن و سنت سے بھی استدلال لینا از بس ضروری سمجھتا تھا مگر قرآنی آیات سے استدلال کی صورت میں جو شواہد پیش کرتا یا تو وہ زیادہ تر عقلی ہوتے یا پھر ضعیف احادیث ہوا کرتی تھیں۔ یہ گروہ کوئی کہلایا۔

آغاز دور جمود: اس دوسرے نظریے کو اتفاق کی بات ہے قبولیت عام ہوئی اور یوں جمود کے ایک ایسے دور کا آغاز ہوا جس کی وجہ سے امت اسلامیہ آج تک سنبھل نہ سکی۔ اور پستی و پسماندگی اس کا مقدر بن گئی۔ تحقیق کو بتدریج معیوب سمجھا جانے لگا۔ احساس کمتری ایسا سودیا گیا کہ اجتہاد کا ملکہ پانا آسان نہیں بلکہ اس کے لئے جو کڑی شرائط رکھی گئیں وہ کوئی غیر انسانی مخلوق کی صفات تو قرار دی جاسکتی ہیں انسانی نہیں۔ سبق دیا گیا کہ موجودہ حالات میں اجتہاد کرنا ایک دشوار گزار کام ہے اس لئے اس کے دروازے اب بند ہیں۔

یہ ایک المیہ ہے کہ تحقیق کے دروازے مسلمانوں نے جب سے بند کیے غیروں نے اس کی جگہ لے لی اور اسے اپنا شعار بنالیا۔ ترقی کی انتہاؤں کو جہاں وہ پہنچ گئے وہاں ہماری پستی کی بھی انتہاء ہے کہ ابھی تک یہ علمی بحثیں ہیں کہ کنویں میں اگر چوہا گر جائے تو کتنے ڈول نکالنا ہوں گے، تالاب میں اگر ناپا کی گر جائے تو اس کے پانی کو نجس قرار دینے کے لئے تالاب کا سائز اور تالاب کے پانی کی مقدار اتنی اتنی ہونی چاہئے وغیرہ۔ ہماری علمی و فقہی آماجگاہوں میں یہی بحثیں ہوتی ہیں۔ وہ فقہ جس پر ہمارے اسلاف نازاں تھے اسی کے ہی خواہوں نے چوتھی صدی ہجری میں دلائل تفصیلیہ سے استدلال لینا بتدریج روک دیا۔ اور اپنی کم ہمتی، سستی، لاعلمی، کند ذہنی، اور علمی بے ذوقی کی بناء پر اس بھلے کام کو انتہائی کٹھن و دشوار گزار قرار دے کر آنے والے روشن دماغوں کو دوسروں کے حوالے کر دیا۔ دینی علوم سے متنفر کر کے دنیاوی علوم کی طرف انہیں پھیر دیا جس نے یہ منظر ہمیں دکھائے کہ کوئی بھی ذہین نوجوان دینی علوم کی طرف رخ نہ کر سکا۔ حتیٰ کہ علماء دین کی اپنی اولاد بھی اس علم میں اپنے لئے کوئی کشش نہ پاسکی۔ اب دماغ ہمارے استعمال ہوتے ہیں اور غیر اپنا کام ہم سے لیتے ہیں اور یوں ہماری اچھی نسلیں، بہترین دماغ دوسروں کے دست نگر ہو گئے۔ اجتہاد کے دروازے بند ہونے کے درج ذیل عوامل تھے:

☆ وہ کتب جنہیں متون (Texts) و شروح (Exegies) کا درجہ دیا گیا انہی پر ہی اکتفاء کرتے ہوئے انہیں قبول کر لیا گیا۔

☆ اصل دلائل کی طرف توجہ بہت کم دی گئی۔

☆ جو منقول تھا اسی پر اکتفاء کیا گیا۔

☆ استدلال و استنباط کی راہ ترک کر دی گئی۔ اس کی بجائے اسلاف کی مستبط فروع کو کافی سمجھا گیا۔

☆ کسی امام یا فقیہ نے کسی آیت یا حدیث کی جزوی تعبیر پیش کی تو اسے ہی شریعت سمجھ لیا گیا۔ اور اسے ہی فقہ اسلامی کہا گیا۔

جب کہ یہ شخصی فقہ ہے۔

☆ دلائل اصلیہ یعنی قرآن مجید و سنت رسول ﷺ اور اجماع و قیاس سے مستفید ہونا صرف مجتہد کا وظیفہ قرار دیا گیا۔

☆ چند فقہاء کی رائے کو اجماع کا نام دے دیا گیا۔

یہ دور فقہ تقلید کا نام پا گیا۔ اس لئے کہ فقہت اب فروع کو سمجھنے، پڑھنے اور پڑھانے تک محدود ہو گئی۔ اس مختصر تجربے کے بعد اب ہم فقہ اسلامی کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہیں۔

فقہ اسلامی کی مختصر تاریخ:

اسلام بلاشبہ ایک ترقی پذیر دین ہے زندہ مسائل کا حل پیش کرنا اس کی خصوصیات میں سے ہے۔ اس کے مآخذ میں جتنی تیسیر (facilitation) ویسر اور flexibility ہے وہ شاید انسان کی محدود سوچ میں نہیں سما سکتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نزول وحی ضرورت کے مطابق اس طرح ہوئی کہ وقتی مسئلے کا حل بتایا گیا۔ یہی دین کا مزاج ہے کہ وہ اپنا تعارف ایک ثابت، ٹھوس مگر ترقی پذیر دین کی حیثیت سے کراتا گیا اور اسی پر صحابہؓ و تابعینؓ وغیرہ کی اٹھان ہوئی۔ اس لئے تاریخی اعتبار سے فقہ اسلامی کے عموماً دو ادوار نظر آتے ہیں۔ ترقی پذیر دور اور جمود کا دور۔ ترقی پذیر دور کے تین مراحل ہیں جن میں زمانہ رسالت، دور صحابہ اور دور تابعین و تبع تابعین شامل ہیں۔ جمود کا دور ایک طویل دور ہے جو ان ازمنہ ثلاثہ کے بعد سے تاحال جاری و ساری ہے۔ ان کا مختصر تذکرہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

۱۔ زمانہ رسالت میں فقہ: اس دور میں اصلی مصادر ہی مسلمانوں کے حرز جاں تھے۔ مسلمان آپ ﷺ کی اطاعت کے جذبے سے سرشار تھے اللہ تعالیٰ نے دین کے فہم کے ساتھ انہیں جذبہ اطاعت سے نوازا تھا۔ یہی کچھ انہوں نے آپ ﷺ کی صحبت میں رہ کر سیکھا تھا۔ وہ Receptive تھے۔ ایمان کے بعد انہوں نے معرفت اور ذہنی ارتقاء کا سفر شروع کیا۔ آپ ﷺ جو فرماتے بس اس پر عمل کر لیا کرتے۔ یہی ان کی فقہ تھی جو انہیں اہل علم کی صف میں شامل کر گئی۔ قرآنی آیات اور تعلیمات نبوی سے وہ جان چکے تھے کہ اللہ تعالیٰ کو ہم سے کیا مطلوب ہے اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لئے ہمیں کس کی اطاعت

و محبت کرنی چاہئے۔

۲۔ دور صحابہ میں فقہ: انہوں نے دین کے اصل جلال اور جمال کو دیکھا بھی اور پایا بھی۔ صحابہ کرامؓ نے اللہ تعالیٰ کی اس امانت کو نور نبوت سے حاصل کیا اور اپنا عہد ختم ہونے سے پہلے پہلے بلا کم و کاست پورے کا پورا اگلی نسل کو منتقل کر دیا۔ سیرت طیبہ کا علم ہو یا حدیث رسول ﷺ کا، اگر کسی صحابی کو نہیں تھا تو اس کا علم دوسرے صحابہ کو ہوتا تھا اور یہی حال بعد کی نسلوں کا تھا، ہے اور رہے گا۔ صحابہ قرآن مجید و سنت رسول ﷺ ہی کے پابند تھے۔ یہی دونوں چیزیں ان کے عہد میں فقہ و شریعت کا کورس اور Source تھیں۔ کسی بھی فقہی مسئلہ کا علم نہ ہوتا تو قرآن سے تلاش کرتے ورنہ حدیث رسول ﷺ سے۔ بصورت دیگر وہ اجتہاد کرتے۔ یہی ان کے اصول تھے اور اس پر سختی سے عامل تھے۔ کوئی غلط فہمی کا شکار ہوتا تو اس کی اصلاح کے لئے فوراً حدیث رسول ﷺ پیش کر دیا کرتے۔ جدہ کی میراث کا مسئلہ ہو یا استنذان کا، طاعون زدہ علاقہ میں جانا ہو یا نکلنا، یہ سب فقہی مسائل تھے اور دیکھا دلیل کی طرف جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے حیات رسول ﷺ میں

هذا قضائي من لم يرض بقضاء رسول الله

جو رسول اللہ ﷺ کے فیصلے سے خوش نہیں تو پھر عمر کا

فیصلہ یہی ہے

کہا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی تائید ساتویں آسمان سے کر دی اور منافق کا خون ضائع قرار دیا اور یوں :

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَى مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَإِلَى

اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو

الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ

اللہ نے اتاری ہے اور اس کے رسول کی طرف، تو تم

صُدُّوْا ﴿النِّسَاء: 61﴾ دیکھتے ہو کہ منافق آپ سے پرے بھاگتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کے اجتہاد کو درست قرار دیا کہ رسول ﷺ کے فیصلے یا اس کی نص (Text) کے ہوتے ہوئے کسی اور کی بات، فیصلہ یا مسئلہ نہیں مانا جاسکتا۔

ابن عمرؓ نے

أمر أبي يتبع أم قول رسول الله ﷺ

کیا میرے باپ کی بات مانی جائے گی یا جناب

رسالت مآب ﷺ کی۔

کہہ کر باور کر دیا کہ فقہ میں اصل مقام قرآن مجید کے بعد رسول اکرم ﷺ کا ہے نہ کہ رجال کا۔ فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت ص ۶۳۰ میں ہے:

أجمع الصحابة على أن من استفتى أبا بكر

یعنی صحابہ کرامؓ کا اس بات پر اجماع ہے کہ جو شخص

وعمر أمير المؤمنين، فله أن يستفتي

ابو بکرؓ اور عمرؓ سے فتویٰ پوچھے وہ ابو ہریرہؓ اور معاذ بن

أباهريرة ومعاذ بن جبل وغيرهما ويعمل

جبلؓ اور ان کے سوا دیگر حضرات سے بھی بغیر کسی

بقولهم بغیر نکیر۔

ہچکچاہٹ کے فتویٰ پوچھ کر عمل کر سکتا ہے کسی کو اس

سے انکار نہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ الإنصاف ص ۵۹ میں فرماتے ہیں:

قال ابن الهمام في آخر التحرير: كانوا

ابن الہمام نے التحریر کے آخر میں لکھا ہے: کہ

يستفتون مرة واحدة، ومرة غير،

اسلاف کبھی کسی سے فتوے پوچھتے اور کبھی کسی سے۔

غير ملتزمين مفتيا واحدا.

ایک مفتی کو انہوں نے لازمی نہیں پکڑا ہوا تھا۔

جن مسائل میں احادیث صحیحہ موجود تھیں اور ان میں بظاہر باہم کوئی تعارض نہیں تھا ان کے مطابق فتویٰ دینا صحابہؓ کے لئے آسان کام تھا۔ مشکل وہاں تھی

جہاں سرے سے حدیث رسول ﷺ ہی موجود نہ تھی۔ ایسے مسائل کی تدوین کا پہلا طریقہ استنباط اور اجتہاد تھا۔ اس میدان میں صرف سیدنا عمر، سیدنا علی، سیدنا ابن عباس اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہم ہی خاص طور پر ممتاز تھے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں:

وَأَمَّا غَيْرُ هَؤُلَاءِ الْأَرْبَعَةِ فَكَانُوا يَرُونَ دَلَالَهٖ،
وَلَكِنْ مَا كَانُوا يُمَيِّزُونَ الرُّكْنَ وَالشَّرْطَ مِنْ
الْأَدَابِ وَالسَّنَنِ، وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ قَوْلٌ عِنْدَ
تَعَارُضِ الْأَخْبَارِ وَتَقَابُلِ الدَّلَائِلِ إِلَّا قَلِيلًا
كَابْنِ عُمَرَ وَعَائِشَةَ وَزَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ رَضِيَ اللَّهُ
عَنْهُمْ.

ان چار کے علاوہ دیگر صحابہ بھی حدیث کے مطلب کو
ضرور سمجھتے تھے لیکن وہ ارکان، شروط، آداب اور سنن
میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے۔ جن روایات میں تعارض
ہوتا یا متضاد دلائل پائے جاتے ان میں بہت کم گفتگو
فرماتے تھے۔ جیسے ابن عمر، عائشہ، زید بن ثابت
رضی اللہ عنہم۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ جو مسائل پیش آتے ان کے متعلق غور و فکر کئی کئی دن کرتے رہتے تا آنکہ وہ حل ہو جاتے۔ بہت سے مسائل باہمی مشورہ سے حل کر لیتے
اس طریقہ کی ابتداء سیدنا ابوبکرؓ نے کی اور جناب فاروق اعظمؓ نے اسے پروان چڑھایا۔

۳۔ زمانہ تابعین میں فقہ: اسلامی سلطنت کا پھیلاؤ جب ہوا تو درس و تدریس کی صورت میں علمی حلقے، جابجا قائم ہو گئے۔ یوں علماء کی ایک بڑی کھیپ سامنے
آگئی جن کی حیثیت علم و مرتبے اور تقویٰ و اجتہاد میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھی۔ اُن دنوں مسائل کے حل کے لئے علمی مکالمات ہوئے، تحریریں
سامنے آئیں اور یوں ہر عالم کا اپنا اپنا علم و اجتہاد ظاہر ہوا مگر یہ سب کچھ وسعت دینی کے لئے ہوا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں:

وَكَذَلِكَ تَابَعُوهُمْ أَيْضًا يَرْجِعُونَ إِلَى
الْكِتَابِ وَالسُّنَنِ، فَإِنْ لَمْ يَجِدُوا نَظْرًا مَا
أَجْمَعَ عَلَيْهِ الصَّحَابَةُ، فَإِنْ لَمْ يَجِدُوا
اجْتِهَدُوا، وَاخْتَارَ بَعْضُهُمْ قَوْلَ صَحَابِيٍّ فَرَأَوْهُ
الْأَفْضَى فِي دِينِ اللَّهِ تَعَالَى.

یہی تابعین کی حالت تھی وہ بھی فقہی مسائل میں
کتاب و سنت کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ اگر وہ
کوئی مسئلہ کتاب و سنت میں نہ پاتے تو اس بات کو
دیکھتے جس پر صحابہؓ کا اجماع ہے۔ اگر اجماع بھی نہ
پاتے تو اپنے طور پر اجتہاد کرتے۔ بعض تابعین تو
صحابی کے اس قول کو لے لیتے جسے وہ اللہ کے دین
تعالیٰ کے لئے قوی تر سمجھتے۔

خیر القرون کا علم اور اختلاف:

صدیق اکبر کا علم: سید الانبیاء ﷺ نے جو علم چھوڑا اس کے بارے میں اگر کوئی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ سارا علم میرے پاس ہے اور استنباط مسائل یا اجتہاد میرے
لئے ممکن ہے۔ تو اس کے سب سے زیادہ مستحق صحابہ کرامؓ تھے۔ جو آپ ﷺ کے ساتھ سفر و حضر میں رہے۔ جنہوں نے آپ ﷺ کے ارشادات کو بغور سنا۔
آپ ﷺ کے اعمال کو بغور دیکھا۔ مگر ان میں سے ایک نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہی کسی کے بارے میں یہ مبالغہ آرائی انہوں نے کی۔ ان صحابہ کرامؓ میں
بھی اگر علمی اعتبار سے تفریق کی جائے تو جناب ابوبکر صدیقؓ سب سے زیادہ مستحق تھے جو دعویٰ کرتے کہ رسول اللہ ﷺ کا سارا علم میرے پاس ہے۔ یا صحابہ
کرامؓ ہی دعویٰ کرتے کہ سیدنا صدیق اکبرؓ ہی آپ ﷺ کا سارا علم جمع کئے ہوئے ہیں۔ مگر نہ خلیفہ الرسول ابوبکرؓ نے کبھی یہ دعویٰ کیا اور نہ ہی صحابہ کرامؓ میں
سے کسی نے یہ مبالغہ آرائی کی۔ مثال کے طور پر خلافت صدیقی میں ایک دادی نے خلیفہ الرسول سے میراث کا حصہ مانگا تو فرمایا:

اللہ تعالیٰ کی کتاب میں تو تمہارا کوئی حصہ مذکور نہیں۔ میرے علم کی حد تک سنت رسول ﷺ میں بھی اس کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ ہاں میں لوگوں سے اس معاملہ

میں مزید دریافت کروں گا۔ چنانچہ سیدنا ابوبکرؓ نے جب جناب مغیرہ بن شعبہ اور جناب محمد بن سلمہ سے یہ مسئلہ دریافت کیا تو انہوں نے شہادت دی کہ جناب رسالت مآب ﷺ نے دادی کو ایک چوتھائی حصہ میراث دلوائی تھی۔ یوں سیدنا ابوبکرؓ نے دادی کو حصہ دیا۔ ایک اور صحابی رسول سیدنا عمران بن حصینؓ نے یہی علم دوسروں کو دے دیا تھا۔ (ابوداؤد، ترمذی) تاہم سیدنا ابوبکرؓ، جو سفر و حضر بلکہ بچپن سے لیکر جوانی اور جوانی سے لیکر بڑھاپے تک تقریباً تمام اوقات آپ ﷺ کے رفیق خاص رہے۔ حتیٰ کہ رات کے وقت بھی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اور راتوں کو بیدار رہ کر مسلمانوں کے حالات پر غور و فکر کرتے رہے۔ آپ ﷺ ان کے بارے میں اکثر یوں فرماتے: میں، ابوبکرؓ اور عمرؓ آئے۔ میں، ابوبکرؓ اور عمرؓ داخل ہوئے۔ میں، ابوبکرؓ اور عمرؓ باہر نکلے۔ مگر اس دائمی رفاقت کے باوجود حضور ﷺ کی فرمائی ہوئی اس سنت سے ناواقف تھے۔

فاروق اعظم کا علم: تقریباً یہی حال سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا بھی تھا۔ انہیں دروازے پر تین بار آواز دے کر لوٹ جانے والی حدیث معلوم نہ تھی آخر انہیں ابو موسیٰ اشعرؓ سے معلوم ہوئی۔ نیز انہیں دیت جنین کا مسئلہ معلوم نہ تھا وہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے معلوم ہوا۔ اسی طرح انگلیوں کی دیت والی حدیث معلوم نہ ہونے کی وجہ سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انگوٹھے اور اس کے پاس والی انگلی کی دیت میں پچیس اونٹ کا حکم جاری کر دیا۔ آخر دوسرے صحابہ کرامؓ کے ذریعے انہیں علم ہوا کہ آپ ﷺ نے ہر انگلی پر دس دس اونٹ دیت مقرر فرمائی تھی۔ یوں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو اپنا حکم واپس لینا پڑا۔ مجوس سے جزیہ لینا ہے یا نہیں؟ سیدنا عبدالرحمن بن عوفؓ سے انہیں اس کی خبر ملی۔

دیت زوج میں عورت میراث پاسکتی ہے یا نہیں؟ ضحاکؓ بن سفیان رضی اللہ عنہ نے اپنے دیہات سے انہیں لکھ کر بھیجا کہ رسالت مآب ﷺ نے میراث دلائی ہے۔ انہوں نے اسے مانا۔ کیا انبیاء علیہم السلام کے نام پر نام رکھے جاسکتے ہیں؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اس سے منع فرمایا کرتے تھے۔ سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ سے جب اس کے جواز کا علم ہوا تو رجوع کر لیا۔ نماز میں شک پڑنے پر نمازی کیا کرے؟ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے جب حدیث بتائی تو علم ہوا۔ یہی صحابی تھے جنہوں نے طاعون کی حدیث سنا کہ سیدنا عمرؓ گوشتام کے سفر سے روکا۔

عثمان ذوالنورین کا علم: امیر المومنین سیدنا عثمانؓ بن عفان رضی اللہ عنہ کو متوفی عنہا زوجہا کے محل عدت کی حدیث معلوم نہ تھی۔ جو فریعیہ بنت مالک رضی اللہ عنہا نے بتائی۔ امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو انبیاء کے مال میں وراثت جاری نہ ہونے کی حدیث معلوم نہ تھی۔ وہ اس سے بھی لاعلم تھے کہ آگ سے عذاب دینے کی ممانعت بھی شریعت میں موجود ہے؟۔

دیگر صحابہ کا علم: سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو لیجئے۔ ان کے پاس بلاشبہ سنت رسول ﷺ کا خاصا علم تھا۔ مگر تھے وہ بھی انسان۔ کچھ مسائل سنت رسول ﷺ ایسے تھے جو صحابہ کرامؓ کے مابین متفق تھے مگر وہ بھول گئے یا ان تک حدیث نہیں پہنچی۔ یا انہیں نسخ کا علم نہیں ہو سکا اور وہ الگ نکتہ نظر رکھتے تھے۔ مشہور حنفی محقق امام زیلعیؒ نے نصب الراية میں ان کے چند ایسے مسائل کی تفصیل دی ہے۔ مثلاً:

..... معوذتین کو وہ قرآن مجید کا حصہ نہیں سمجھتے تھے۔

..... رکوع میں دونوں ہاتھوں کو ملا کر دونوں گھٹنوں کے درمیان دے دیتے تھے۔ جسے تطبیق کہتے ہیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی اس کی اجازت دیتے تھے۔ حالانکہ یہ پہلے تھا پھر منسوخ ہو گیا۔ مگر ان دونوں کو معلوم نہ ہو سکا۔

..... سجدہ میں اپنی کہنیاں بھی زمین پر رکھتے تھے۔

..... آپ ﷺ نے آیت "وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ" کس طرح پڑھی۔ ابن مسعودؓ اسے بھول گئے تھے۔

..... رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین یعنی دونوں ہاتھوں کو کان اور مونڈھے کے درمیان تک اٹھانا نہیں جانتے تھے۔

..... انہیں اس عورت کے مہر کے بارے میں حدیث معلوم نہ تھی جس کا خاوند حق مہر مقرر کئے بغیر فوت ہو گیا۔ عرصہ بعد سیدنا معقلؓ بن یسار سے یہ مسئلہ انہیں معلوم ہوا۔

.....جنہی کے لئے تیمم کرنے کی اجازت، شریعت میں موجود ہے مگر ابن مسعود رضی اللہ عنہ اس حدیث سے بھی ناواقف تھے۔

.....سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کو رسول اکرم ﷺ کی نماز ظہر وعصر میں قراءت کرنے کی حدیث کا علم نہیں تھا۔

.....محافظ حدیث رسول ﷺ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو مسح خفین کی حدیث سے لاعلمی تھی۔ کیا روزہ دار حالت جنابت میں صبح کر سکتا ہے یا نہیں؟ یہ مسئلہ بھی انہیں معلوم نہیں تھا۔

.....ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو کھڑے ہو کر پیشاب کرنے والی حدیث معلوم نہیں تھی۔ اسی طرح مسح خفین والی بھی۔

نصوص جب ان صحابہؓ تک نہ پہنچ سکیں تو جس بات کے وہ قائل ہوئے برابر وہ اسی کے قائل رہے۔ ان کو نص پہنچی ہی نہیں یا خیال میں نہیں آئی۔ یا یہ بھی کہ وہ ایک حکم کے قائل رہے اور انہیں ناسخ معلوم ہی نہ ہو سکا۔ مثلاً:

.....محبت سنت رسول ﷺ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما موزوں کے مسح میں وقت مقرر کرنے (توقیت) کے قائل نہیں تھے بلکہ اجازت دیتے تھے کہ جب تک چاہے آدمی مسح کرتا رہے۔ اس مسئلے میں جو احادیث تھیں وہ ان تک نہ پہنچیں۔ وہ خواتین کو غسل کے وقت بال کھولنے کا حکم دیا کرتے حالانکہ ام المؤمنین سیدہ ام سلمہؓ کی حدیث میں جو اجازت دی گئی وہ ان کو نہ پہنچی۔

..... ممتاز صحابیہ سیدہ ہند رضی اللہ عنہا کو مستحاضہ والی حدیث کا علم نہیں تھا وہ استحاضہ میں نماز ہی نہیں پڑھتی تھیں۔

.....سیدنا ابن عمر اور سیدنا

عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم دونوں دریا کے پانی سے جواز طہارت کے قائل نہ تھے۔

.....سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نیند کو ناقض وضو نہ سمجھتے تھے خواہ سونے والا جیسے اور جس قدر سوتا رہے مگر اس کا وضو نہیں جاتا۔

.....وہ برتن جن میں شراب پی جاتی تھی حرمت خمر کے بعد ان کا استعمال ممنوع تھا۔ بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ مگر حضرات صحابہؓ میں ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما دونوں منع ہی سمجھتے رہے۔ انہیں ناسخ کا علم نہ ہو سکا۔

.....قربانی کا گوشت تین دن سے زائد رکھنا آپ ﷺ نے ممنوع قرار دیا تھا۔ حالات کے بہتر ہونے کے بعد آپ نے اجازت مرحمت فرمادی۔ جناب علی و ابن عمر رضی اللہ عنہما اسے ممنوع ہی سمجھتے رہے۔ انہیں ناسخ نہ پہنچ سکا۔

.....اسی طرح نکاح منع آپ ﷺ نے حرام فرما کر منسوخ کر دیا۔ بہت سے صحابہؓ کو اس کے منسوخ ہونے کی اطلاع ہی نہ ہو سکی وہ اسے جائز ہی کہتے رہے۔ جن یہ سب معلومات فقہی کتب میں بے شمار ایسی مثالوں کے ساتھ موجود ہیں۔ بعض علماء نے ان کی کچھ نہ کچھ تاویل کی ہیں مگر اس سے انکار نہیں کہ ان مقدس ہستیوں کو حدیث رسول ﷺ نہیں پہنچ سکی۔ جس کی وجہ سے ان میں یہ اختلاف رائے ہوا۔ علم اور اس کا آزادانہ اظہار ان کے جذبہ اطاعت رسول ﷺ کو کم نہ کر سکا اور نہ ہی صحیح بات کی قبولیت میں کوئی ہچکچاہٹ۔ ان کا ایک اصول یہ تھا کہ مسئلے کی وضاحت جب حدیث رسول ﷺ سے ہو جائے تو پھر بلا تامل اسے قبول کر لینا چاہئے۔ وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کے مزاج اور گھٹی میں تسلیم و اطاعت کا جذبہ ہمہ وقت زندہ ہوتا تھا۔ آج ہمارے جو حالات ہیں ان کا تقاضا یہی ہے کہ یہ تقاضا بھی لکھی جائیں۔

ائمہ فقہاء کا علم: غرضیکہ سیدنا ابو بکرؓ و دیگر صحابہؓ کرامؓ جو اکثر و بیشتر آپ ﷺ کے ساتھ رہے، ان کے علم کا جب یہ حال تھا کہ وہ رسول اکرم ﷺ کے ساتھ رہتے ہوئے اور علم کی محبت رکھتے ہوئے آپ کی کم و بیش احادیث اور سنتوں کو نہیں جانتے تھے یا لا علم رہے تو بعد والے علماء و ائمہ کا کیا حال ہوگا؟ اس لئے جس طرح ہم سیدنا ابو بکرؓ و دیگر صحابہؓ کرامؓ کے بارے میں یہ مبالغہ آرائی نہیں کر سکتے کہ وہ جناب رسالت مآب رسول اکرم ﷺ کی تمام احادیث وغیرہ کا علم رکھتے تھے اسی طرح امت کے کسی امام، عالم، مجتہد کے بارے میں بھی یہ مبالغہ آرائی انتہائی نامناسب ہوگی۔ کہ فلاں امام وغیرہ کے پاس شریعت کا سارا علم تھا۔ کیونکہ بہت سے فقہی مسائل ایسے ہیں جن کی دلیل ان ائمہ حضرات کو نہ مل سکی، یا وہ بے خبر رہے یا لا علم تھے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض اہم دینی معاملات میں

ان ائمہ کبار سے ایک مسئلہ بھی منقول نہیں۔

چوتھا باب:

فقہاء اربعہ

اسلامی تاریخ کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کی علمی سرگرمیوں نے بے شمار مجتہدین و ائمہ پیدا کئے جن کے علم سے آج بھی دنیا مستفید ہو رہی ہے۔ امامت کا یہ بلند و بالا مقام جس سے ہمارے یہ ممتاز ائمہ سرفراز ہوئے انہیں ان کے علم و تقویٰ اور دین پر عمل و محنت کی وجہ سے ملا۔ امت محمدیہ بحمد اللہ ایسے فقہاء و مجتہدین کی فہرست سے خوش قسمت ہے جنہوں نے مشکل حالات میں افراد امت کی صحیح راہنمائی فرمائی۔ مگر چار ائمہ کرام کو خصوصی طور پر جو مقام و مرتبہ ملا وہ امت اسلامیہ کے لئے ایک عظیم الشان اعزاز ہے۔ ان کی یا ان کے شاگردوں کی کاوشوں نے ان ائمہ کرام کی شہرت کو چار چاند لگائے جن کی معتدل محبت ان کے عقیدت مندوں اور بھی خواہوں کے دلوں میں ہمیشہ کے لئے سما گئی۔ ان کے علمی و اجتہادی کارنامے، اصول و ضوابط، تفریع و تخریج، حاشیہ پر حاشیہ، فقہاء کے مختلف مدارج کا قیام مثلاً: مجتہد مطلق، مجتہد مذہب، مفتی مذہب، مرجع مذہب اور مقلد مذہب وغیرہ کی اصطلاحات، قیود و شروط و رموز غرضیکہ فقہی سرگرمی کا کوئی پہلو نہیں جو ہر عقیدت مند نے اجاگر نہ کیا ہو۔ رحمۃ اللہ علیہم رحمۃ واسعة۔ مگر یہ واضح رہے کہ فقہ و استنباط میں ان ائمہ کرام کے اپنے اپنے مناج و اصول ہیں بعض میں یہ کسی سے متفق ہیں اور کسی سے مختلف۔ اس لئے کہ شریعت کا سارا علم ان میں سے ہر ایک کے پاس نہیں تھا۔ ان ائمہ کرام کے مختصر حالات زندگی درج ذیل ہیں:-

امام ابوحنیفہؒ (۸۰ تا ۱۵۰ھ)

سب سے بڑے امام یعنی امام اعظم گردانے اور فقہ حنفی کے بانی کہے جاتے ہیں۔ آپ کا نام نعمان بن ثابت ہے۔ کوفہ میں ۸۰ھ کو پیدا ہوئے۔ بچپن کے حالات کا علم نہیں ہو سکا۔ شروع شروع میں ریشم کا کاروبار کرتے رہے مگر فقیہ و قاضی امام شعمیؒ کے توجہ دلانے پر علم کے حصول میں خوب منہمک ہوئے اس وقت کوئی صحابی رسول ﷺ زندہ نہ تھے جن سے یہ استفادہ کر سکتے۔ علم کی خواہش اور اپنی ذہنی قابلیت سے علم کلام کی جانب توجہ فرمائی مگر اسے بے نتیجہ سمجھ کر علم فقہ کے میدان میں قدم رکھا اس وقت آپ کی عمر تیس سال تھی۔

استاذہ: مشہور فقیہ حماد بن ابی سلیمان (م۔ ۱۲۰ھ) سے فقہ کی تکمیل کی اور جلد ہی فقہی دنیا میں نام پیدا کر لیا۔ امام ابراہیم نخعیؒ (م۔ ۹۵ھ) جو تابعی ہیں حماد کے استاد تھے۔ امام ابوحنیفہؒ..... بقول امام شاہ ولی اللہ دہلوی..... امام ابراہیم نخعیؒ کے علم و فضل اور فقہی کمالات کے معترف اور مداح تھے اور انہی سے زیادہ متاثر بھی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں: کہ امام محترمؒ کی طرف منسوب فقہی مذہب کا اصل مأخذ امام ابراہیم نخعیؒ اور ان کے معاصرین کے افکار ہیں۔ امام صاحب تخریج کی تمام صورتوں کی ممکنہ باریکیوں کو بخوبی جانتے تھے، فروع کی طرف بھی آپ کا کامل رجحان تھا۔ امام مالکؒ سے عمر میں گوبڑے تھے لیکن ان کے حلقہ درس میں بیٹھ کر ان سے بھی کچھ احادیث سنیں۔ امام جعفر صادقؒ کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ محب اہل بیت تھے اور اس سلسلہ میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ فن فقہ کے شاعر تھے۔

ایک نکتہ: امام محترم کی ذات علم کا ایک پہاڑ، امام وقت اور فقہات کے منصب جلیلہ کے مقام پر فائز تھے۔ تقریباً تمام ائمہ فقہاء نے امام عالی مقام کو فقہاء کا سرخیل تسلیم کیا ہے۔ مگر ایک سوال کا جواب ہمیں اس وقت تک معلوم نہیں ہو سکتا جب تک ہم امام محترمؒ کے شاگردوں کی فقہی کاوشوں اور اصولوں کو نہ پڑھ لیں۔ سوال یہ ہے کہ امام محترمؒ کی نہ کوئی کتاب ہے اور نہ ہی ان کے تفسیر و حدیث اور فقہ و اصول فقہ میں کوئی علمی اقوال الا ماشاء اللہ، حتیٰ کہ شاہ ولی اللہ محدثؒ کے بقول کہ:

آں یک شخصے است کہ رؤس محدثین مثل احمد،
وبخاری، ومسلم، وترمدی، وابوداؤد، ونسائی، وابن ماجہ،
ودارمی یک حدیث ازوے در کتابہائے خود روایت
نکرده اند۔ ورسم روایت حدیث ازوے بطریق
ثقات جاری نشد۔ الحنفی ۶۔

امام محترم ہی واحد شخصیت ہیں جن سے بڑے بڑے
ائمہ حدیث جیسے امام احمد، امام بخاری، امام مسلم، امام
ترمذی، امام ابوداؤد، امام نسائی، امام ابن ماجہ اور امام
دارمی رحمہم اللہ میں سے کسی نے اپنی کتاب میں ایک
حدیث بھی روایت نہیں کی اور نہ ہی روایت حدیث کے
میدان میں ان کوئی ثقہ سند چل سکی۔

پھر امام محترم کا یہ فقہی مقام اس قدر عظیم کیوں؟ اس کا جواب یہی ہے کہ امام محترم سے سنی ہوئی فروعات کو ان کے لائق شاگرد یا ان کے شاگردان محترم نے از
بر کیا جنہیں بعد میں سامنے رکھ کر اصول وضع کیے اور فروعات نکالتے رہے اور ان کی نسبت امام محترم کی طرف اس حسن ظن پر کرتے رہے کہ اگر امام محترم بھی
آج زندہ ہوتے تو ان کا جواب بھی یہی ہوتا۔

تلازمہ: آپ کے شاگردوں میں قابل ترین شاگرد امام ابویوسفؒ تھے جو بعد میں ہارون الرشید کے زمانہ میں چیف جسٹس بھی رہے انہوں نے اپنے استاد محترم
کے نہ صرف افکار و خیالات و علمی کمالات کو ہر اہم فیصلہ و مقام پر ترجیح دی بلکہ اسے قلمبند کر کے بام عروج تک پہنچایا۔ اور یوں ایک قول زبان زد عام ہوا :
لولا أبو یوسف لما ذکر أبو حنیفہ۔ اگر امام ابویوسفؒ نہ ہوتے تو امام ابوحنیفہؒ کبھی نہ آتے۔ (وفیات الأعیان) ایک اور قابل قدر شاگرد امام محمد بن
الحسن الشیبانی تھے۔ جنہوں نے گوامام محترم کے ساتھ بہت تھوڑا وقت گزارا کیونکہ جب امام محترم فوت ہوئے تو ان کی عمر پندرہ سال تھی۔ مگر اپنے شیخ محترم کے
فقہی واجتہادی فروعات سے سونی صد متفق اور ان کی وضاحت کے لئے ضخیم کتب کے مصنف تھے۔ امام ابوحنیفہؒ کے حالات زندگی پر ایک جامع وبے لاگ
تبصرہ امام خطیب بغدادیؒ (م ۴۶۲ھ) نے اپنی مشہور کتاب تاریخ بغداد میں غالباً سب سے پہلے لکھا ہے جو ایک قدیم ترین مصدر ہے۔ باقی سب انہیں کے
خوشہ چیں ہیں یا ناقہ و مداح۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ حجتہ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں:

آپ کے معروف شاگرد امام ابویوسفؒ اور امام محمد بن الحسن الشیبانی ہیں۔ ان دونوں نے امام مرحوم کے مسائل کو اس توضیح و تفصیل سے لکھا اور ہر مسئلہ پر
استدلال و برہان کے ایسے حاشیے اضافہ کئے کہ انہی کا رواج عام ہو گیا اور اصل مأخذ سے لوگ بے پروا ہو گئے۔ امام ہمام کی کوئی اپنی تالیف نہیں۔
فقہ حنفی کے اصول: ان اصولوں کو خود امام محترم نے یوں بیان فرمایا ہے۔

أأخذ بكتاب الله إذا وجدته، فما لم أجده
فيه أخذت بسنة رسول الله ﷺ والآثار
الصالح عنه التي فشت في أیدی الثقات،
فإذا لم أجده في كتاب الله ولا سنة رسول
الله ﷺ أخذت بقول أصحابه من شئت،
وأدع قول من شئت، ثم لا أخرج عن قولهم
إلى قول غيرهم، فإذا انتهى الأمر إلى
إبراهيم والشعبي وابن المسيب والحسن
وعطاء فلي أن أجتهد كما اجتهدوا.

میں سب سے پہلے کتاب اللہ کو لیتا ہوں اگر اس میں
مسئلہ نہ ملے تو پھر سنت رسول ﷺ سے لیتا ہوں۔ اور
ان آثار صحیحہ پر عمل کرتا ہوں جو ثقہ راویوں کی روایت
سے شائع و ذائع ہیں۔ اگر سنت نبوی سے بھی نہ ملے تو
صحابہ کرام کے اقوال میں سے کسی ایک کے قول کو
لے لیتا ہوں۔ لیکن جب معاملہ ابراہیم شععی، ابن
المسیب، حسن، عطاء تک پہنچتا ہے تو میرا بھی حق بنتا
ہے کہ میں بھی اجتہاد کروں جس طرح انہوں نے کیا
۔ الانشاء لابن عبد البر ۱۴۲۔

ابن عبد البرؒ اس روایت کی سند میں گو کلام ہے مگر اس سے معلوم یہی ہوتا ہے کہ امام محترم کے اصول، معاصر اصولوں سے مختلف نہ تھے ہاں فہم اپنا اپنا تھا۔ اسی

طرح دیگر بہت سے اصول بھی ہیں جنہیں امام بزدویؒ نے اور محبت اللہ بن عبد الشکور (م ۱۱۱۹ھ) نے مسلم الثبوت میں بیان کئے ہیں۔ جو بالاختصار ذیل میں دیئے جاتے ہیں:

۱۔ کتاب اللہ: سب سے اولین حیثیت قرآن مجید کی ہے۔ فقہی استنباط اگر قرآن پاک سے ہو سکتا ہے تو سر آنکھوں پہ ورنہ سنت رسول ﷺ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

۲۔ سنت رسول اللہ: سنت رسول ﷺ دوسرے نمبر پر ہے۔ جس میں بطور خاص خبر واحد کی قبولیت کے لئے چند ذیلی شرائط ہیں:

I۔ خبر واحد کو سب سے پہلے عموماً قرآن مجید اور ظواہر پر پیش کیا جائے گا اگر اس سے قرآن مجید کے کسی عام یا ظاہر کی مخالفت ہوتی ہو تو قرآن مجید کو لیا جائے گا اور اس خبر (حدیث) کو رد کر دیا جائے گا کیونکہ قرآن مجید قطعی الثبوت ہے اور اس کے ظواہر و عموماً بھی قطعی الدلالہ ہیں۔ اور یہ قرآن مجید پر اضافہ ہیں۔ اور اس لئے اس کی ناسخ ہیں۔ اور قرآن مجید کا نسخ اخبار آحاد سے نہیں ہو سکتا۔

II۔ خبر واحد اس صورت میں بھی قبول کی جاسکتی ہے جب وہ اپنی اصل کے اعتبار سے خبر واحد ہی ہو لیکن پھر اتنی پھیل جائے کہ اسے اتنے لوگوں نے نقل کیا ہو جن کے جھوٹ بولنے پر اتفاق کا گمان نہ کیا جاسکتا ہو اور ان سے مراد صحابہؓ و تابعینؓ کے بعد دوسری صدی کے لوگ ہیں۔ ائمہ نے اگر انہیں اختیار کیا ہو تو ان کا مرتبہ بلند ہو جاتا ہے اور سنت مشہورہ قرار پاتی ہے۔ کبھی کبھی مشہور کا اطلاق ان روایات پر بھی ہوتا ہے جو مطلق طور پر لوگوں کی زبانوں پر مشہور ہو گئی ہو۔ اس صورت میں وہ تواتر کی دو اقسام میں سے ایک قسم ہوگی جس سے علم طمانینت بھی حاصل ہوتا ہے اور بعض کے نزدیک علم یقین بھی۔

III۔ حدیث کو اس وقت تک قبول نہ کیا جائے اگر اس کا راوی غیر فقیہ ہو اور وہ قیاس کے خلاف ہو۔

iv۔ وہ خبر واحد ایسی نہ ہو جس کا تعلق بلوائے عامہ سے ہو یعنی وہ کسی ایسے مشہور واقعہ کے بارے میں ہو جو سب کے سامنے ہوا ہو پھر بھی لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے اسے روایت نہ کیا ہو۔

۳۔ اجماع: احناف نے اسے تیسرے درجے میں بیان کیا ہے۔ لیکن کبھی اس کی حیثیت خبر واحد سے خواہ صحیح ہی کیوں نہ ہو بڑھ جاتی ہے۔

۴۔ قیاس: ان چار مآخذ کے علاوہ کچھ ذیلی مآخذ بھی فقہ حنفی میں شامل ہیں جن میں استحسان اور حیل بھی ہیں۔ ان حیلوں کو المخرج من المضایق کہا جاتا ہے۔ یعنی تنگی کی صورت میں اس مسئلے سے نکلنے کی کون کون سی راہیں اور حیلے ہیں۔

فقہ حنفی کی مشہور کتب:

اقسام و تعارف: فقہ حنفی کی وہ کتب جو اساسی حیثیت رکھتی ہیں ان کی دو اقسام ہیں۔ متون اور شروح۔ متون بہت مختصر ہیں۔ ان میں جو اقوال درج ہیں وہ امام ابو حنیفہؒ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے ہیں۔ انہی اقوال یا کتب کو ظاہر الروایہ کہتے ہیں۔ ان میں امام ابو یوسفؒ کی گراں قدر کتاب الخراج ہے جس میں محصولات اور حکومت کے امور مالیات پر بحث کی گئی ہے۔ اور امام محمدؒ کی کتب المبسوط، الجامع الكبير، الجامع الصغير، السير الكبير، السير الصغير اور الزيادات ہیں۔ یہ سب متون امام محمدؒ کی کتب سے ماخوذ ہیں۔ دوسری کتب، شروح کی کہلاتی ہیں جن میں کتب متون کی شرح لکھی گئی ہے۔ یہ کتب متون سے بعد کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس لئے کہ ان میں متاخر مشائخ کے اپنے اقوال و اختیارات ہیں جن کے موافق انہوں نے فتوے دیے۔ کتب ظاہر الروایہ کو بہت عرصہ بعد ایک حنفی فقیہ حاکم الشہید نے اپنی معروف کتاب الکافی میں یکجا کر دیا ہے جو اہل فن کے لئے ایک قیمتی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

امام محمدؒ کی دوسری کتب کا نام مسائل النوادر ہے انہیں غیر ثقہ راویوں نے روایت کیا ہے۔ ان میں امالی محمد، کیسانیات، جرجانیات، کتاب المخرج فی الحیل اور زیادة الزیادة شامل ہیں۔

دیگر متقدمین کے متون جو معتبر خیال کئے جاتے ہیں ان میں علامہ طحاوی، امام کرنی و حاکم شہید محمد بن محمد المروزی (م ۳۳۴) کی مختصرات ہیں۔ اسی طرح متاخرین سے امام قدوری کی المختصر فقہ حنفی کا مقبول ترین متن ہے۔ پھر البدایہ، النقایہ، المختار ہے۔ ہدایہ، المختصر اور بدایہ المنتہی کی شرح ہے۔ تاج الشریعہ محمود بن احمد (م ۷۰۰ھ) کی الوقایہ کا متن ہدایہ سے منتخب شدہ ہے۔ جس کی شرح ان کے پوتے نے لکھی جو مشہور درسی کتاب ہے۔ اسی طرح کنز الدقائق کا متن بھی بہت زیادہ مقبول و مشہور ہے۔ ان متون نے چونکہ ظاہر الروایہ کتب اور معتدات احوال کو نقل کیا ہے اس لئے یہ معتبر متون شمار کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح علامہ الشام ابن عابدین (۱۲۵۲ھ) کا حاشیہ ہے۔ جس کا نام رد المختار علی الدر المختار ہے جو حنفی مذہب کی تمام تر تحقیقات اور ترجیحات کا خلاصہ ہے۔ فتاویٰ میں فتاویٰ عالمگیری کو ہندوپاک میں جو مقام مل سکا دنیا کے دوسرے خطوں میں اسے وہ مقبولیت اور علمی حیثیت نہ مل سکی۔

نمایاں خدوخال:

☆۔ فقہ حنفی کے بارے میں علماء احناف کی آراء :

پہلی رائے: امام محترم سے منسوب یہ فقہ اگرچہ عام طور پر فقہ حنفی کہلاتی ہے لیکن درحقیقت وہ چار شخصوں یعنی امام ابوحنیفہ، امام زفر بن ہذیل (۱۱۰-۱۵۸)، قاضی ابو یوسف اور امام محمد بن حسن الشیبانی (۱۳۲-۱۸۹) کی آراء کا مجموعہ ہیں۔ قاضی ابو یوسف، و امام محمد نے بہت سے مسائل میں امام ابوحنیفہ کی رائے سے اختلاف کیا ہے۔ فقہائے احناف نے بہت سی روایات نقل کی ہیں کہ ان صاحبوں کو اعتراف تھا کہ ہم نے جو اقوال امام ابوحنیفہ کے خلاف کہے وہ بھی امام ابوحنیفہ ہی کے اقوال ہیں کیوں کہ بعض مسئلوں میں امام ابوحنیفہ نے متعدد اور مختلف آراء ظاہر کی تھیں۔

دوسری رائے: یہ ان فقہاء کا حسن ظن ہے، قاضی ابو یوسف اور امام محمد اجتہاد مطلق کا درجہ رکھتے تھے اور انہیں اختلاف کا پورا حق حاصل تھا۔ اسلام ترقی پذیر اس وقت تک رہا جب تک لوگ باوجود حسن عقیدت کے اپنے بزرگوں، اور اساتذہ کی رائے سے اختلاف کرتے تھے اور خیالات کی ترقی محدود نہ تھی۔ یہ لوگ ہر سابقہ حکم اور فیصلہ کو بعد کے فیصلہ اور حکم کی روشنی میں پڑھتے، سمجھتے اور اس پر عمل کیا کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک قانون کی تعبیر و تشریح کا یہ وہ اصول ہے جس کو نہ صرف اسلامی قانون بلکہ آج بھی دنیا کے سارے ہی قوانین تسلیم کرتے ہیں۔ محدثین کا کہنا ہے کہ ان چاروں میں امام ابو یوسف سب سے زیادہ متبع حدیث ہیں۔

تیسری رائے: فقہ حنفی کے احکام و مسائل اولہ شرعیہ سے ان اصول اور قواعد سے ماخوذ و مستنبط ہیں جو امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں نے وضع کئے۔ فقہ حنفی کا ایک عام قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ مسائل کے جواز و عدم جواز یا اس کے صحیح یا غلط ہونے میں ائمہ احناف کے مابین آراء کا اختلاف نظر آتا ہے یعنی اگر امام ابوحنیفہ کسی چیز کو جائز قرار دیتے ہیں تو ان کے شاگرد اسے ناجائز گردانتے ہیں۔ ایسی صورت میں متاخر ائمہ احناف نے ان اختلافی اقوال میں ترجیح کے کچھ اصول بیان فرمائے ہیں جو فقہ حنفی کی حفاظت کے لئے ان کی ایک اجتہادی کوشش ہے اور حنفی نقطہ نظر کو سمجھنے کے لئے بہت اہم بھی۔

چوتھی رائے: یہ بات علماء احناف کے ہاں طے شدہ ہے کہ امام ابوحنیفہ نے جو فقہ کے اصول وضع کیے تھے تمام حنفی فقہاء ان کے پابند تھے، اور آج بھی ہیں۔ امام ابوحنیفہ کی رائے میں کوفہ کے اصحاب کی روایات، ان کے فتاویٰ اور ان کے قیاسی مسائل ہی قابل اعتماد ہیں۔ انہی اصولوں کو سامنے رکھ کر فقہی مسائل کی وقت کے ساتھ ساتھ تدوین کی گئی اور تخریج بھی۔ اس لئے اگر امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں کے مابین اختلاف رائے ہو تو اس صورت میں کس کی بات قبول کی جائے گی اور کس کی بات غیر مقبول ٹھہرے گی؟ اس سلسلے میں وقفا و قما بتدریج حسب ذیل اصولوں اور ضابطوں کو متعارف کرایا گیا جو مختلف اصولی و فقہی کتب میں دیکھے جاسکتے ہیں:

ضابطہ: اگر امام ابوحنیفہ اور ان کے دونوں شاگردوں یعنی امام ابو یوسف اور امام محمد کسی مسئلہ میں متفق رائے ہیں تو بعد کے مفتی حضرات اسی اتفاقی قول کے

مطابق ہی فتویٰ دیں گے۔ اور اگر ان کے مابین اختلاف ہے تو بعض ائمہ احناف کے نزدیک سب سے اولین حیثیت امام ابوحنیفہؒ کے قول کی ہوگی۔ ورنہ امام ابو یوسفؒ کی۔ اور ان کے بعد امام محمدؒ، پھر امام زفرؒ اور پھر امام حسنؒ بن زیاد کے قول پر فتویٰ ہوگا۔ بعض فقہائے احناف کے ہاں اگر امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ دونوں کی رائے یا مسئلہ امام ابوحنیفہؒ کی رائے یا مسئلہ کے خلاف ہے تو مفتی کو اختیار ہے کہ وہ امام صاحب یادوں شاگردوں میں سے جس کو چاہیں ان کے قول پر فتویٰ دے دیں۔ اگر مفتی مجتہد نہیں تو مناسب یہی ہے کہ اولاً امام صاحب کو رکھے پھر امام ابو یوسفؒ کو، پھر امام محمدؒ کو، پھر امام زفرؒ کو اور پھر امام حسن بن زیادؒ کو۔ (فتاویٰ سراجیہ)

ب۔ رد المختار جو فقہ حنفی کی ایک معتبر کتاب ہے اس کی ج ۱ ص ۵۳، اور ج ۲ ص ۴۰۵ میں مرقوم ہے: فقہاء احناف کے نزدیک عبادات میں ہمیشہ فتویٰ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے قول پر ہوگا اور مسائل ذوی الارحام میں امام محمدؒ کے قول پر۔ جب کہ وقف، قضاء، موارث اور شہادات کے مسائل میں امام ابو یوسفؒ کے قول پر اور سترہ مسئلوں فتویٰ میں امام زفرؒ کے قول پر ہوگا۔ یعنی ان مسائل میں اگر امام ابوحنیفہؒ اور ان کے شاگردوں کے مابین اختلاف ہو تو پھر درجہ بالا اصول ہی پیش نظر رہیں گے۔ مگر امام صباغی حنفی اس کے خلاف ہیں اسی کتاب کی ج ۱ ص ۱۶۱ میں ہے کہ وہ نماز میں صرف امام ابوحنیفہؒ کے قول پر فتویٰ دیا کرتے تھے اور دیگر مسائل خواہ عبادات ہوں یا غیر عبادات سب میں امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے قول پر فتویٰ دیا کرتے تھے۔

☆-تلفیق: تلفیق کا اہم مسئلہ کتب فقہ میں زیر بحث آیا ہے۔ طلبہ دین اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ جس سے مراد ہے کہ ایک مذہب کا حامل شخص بوقت شدید ضرورت کیا دوسرے مذہب کی باتیں اختیار کر سکتا ہے؟ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اسے فقہاء اپنی زبان میں تلفیق کہتے ہیں۔ علمائے احناف کے ہاں تلفیق کی دو قسمیں ہیں۔ تلفیق مذموم اور تلفیق محمود۔

تلفیق مذموم۔ دوسرے مذہب کی باتیں اختیار کرنے میں مقصد صرف سہولتوں کی تلاش ہو۔ یعنی ہر مذہب سے اپنی خواہش کے مطابق چیزیں لے لینا۔ یہ یقیناً قابل مذمت ہے۔

تلفیق محمود و مطلوب۔ جب مقصد نصوص شریعت کی بالادستی قائم کرنا ہو اور عوام کو آسانی فراہم کی جائے تو ایسی تلفیق عین مطلوب ہے امام ابوحنیفہؒ اس کے جواز کے قائل ہیں۔

حکى الحناطى وغيره عن أبى إسحاق فيما	امام حنطی اور دیگر علماء نے ابو اسحاق سے یہ بیان کیا
إذا اختار من كل مذهب ما هو أهون عليه،	ہے کہ ہر مذہب سے اگر آسانی کے لئے کچھ اختیار کر
أنه يفسق به. وعن أبى حنيفة: لا يفسق به.	لے تو وہ گناہ گار ہوگا۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں: وہ
	ایسا کرنے سے گناہ گار نہیں ہوگا۔

صرف رخصتیں تلاش کرنا بھی امام صاحبؒ کے نزدیک جب فسق نہیں تو نصوص شریعت کی بالادستی اور عوام کی سہولت کے نقطہ نظر سے مختلف مذاہب کی باتیں اختیار کرنا کیسے غلط ہوگا۔ ہر دور میں ایسا ہوا ہے۔ برصغیر میں حنفی علماء نے زوجہ مفقودہ الخبر کے بارے میں حنفی فقہ کی بجائے فقہ مالکی کا مسلک اپنا کر اسے چار سال کے انتظار کے بعد چار ماہ دس دن کی عدت گزار کر اسے نکاح کرنے کی اجازت دی ہے۔ عصر حاضر میں فقہی جمود کی نہیں فقہی توسع کی ضرورت ہے۔ امام طحاویؒ قاضی کے آداب میں امام محمدؒ کا ارشاد گرامی ذکر فرماتے ہیں:

اگر قاضی نے کسی معین فقیہ کی تقلید میں فیصلہ کیا۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ کسی دوسرے فقیہ کا قول اس سے بہتر ہے تو اسے چاہئے کہ پہلا فیصلہ توڑ کر صحیح فیصلہ کرے۔ امام طحاویؒ فرماتے ہیں: ہم بھی اس کے قائل ہیں۔ لیکن قاضی متقدمین فقہاء کے اس فیصلہ کو توڑ نہیں سکتا جس میں فقہاء کا اختلاف ہو۔ (مختصر الطحاوی ص ۳۲۷)

وإن كان إنما قضى به بتقليد الفقيه يعينه، ثم تبين له أن غيره من أقوال الفقهاء أولى مما قضى به، نقضه، وقضى بما يراه فيه، وبه نأخذ. ولا ينبغي له أن ينقض قضاء من تقدمه من القضاة إذا كان مما يختلف فيه الفقهاء.

مگر اس گنجائش کو سختی کی نذر فقہاء کرام نے نہیں فرمایا۔ بقول صاحب شرح مسلم الثبوت:

کچھ متکلمین اہل علم نے شدت سے کام لیا اور کہہ دیا کہ: ”حنفی اگر اپنے امام کے مذہب کو ترک کر دے تو اسے تعزیر (کوئی سزا) دی جائے۔“ حق تو یہ ہے کہ ایسی متعصبانہ بات ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔ بلکہ اپنی طرف سے شریعت سازی ہے۔ ”التیسیر“ میں ہے کہ: ”بالکل یہ تعصب ہے کیونکہ واجب وہی ہے جسے اللہ نے واجب قرار دیا، (ہم کون ہوتے ہیں تقلید کو واجب کرنے والے، اور اس کے ترک پر تعزیر دینے والے) القصہ کسی مذہب معین کی تقلید واجب نہیں۔ بلکہ ایک مذہب سے دوسرے مذہب کی طرف مسئلہ کی تلاش میں جانا بھی جائز ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ ایسا کرنا محض خواہش نفس کی بنیاد پر نہ ہو اور نہ ہی مجتہدین کرام کی توہین مقصود ہو۔“

شدد بعض المتكلمين، قالوا: ”الحنفي إذا ترك مذهب إمامه يعزر“، والحق أنه تعصب، لا دليل عليه، وإنما هو تشريع من عند نفسه. قال في التيسير شرح التحرير: ”هو الأصح، إذ لا واجب إلا ما أوجبه الله، وبالجملة لا يجب تقليد مذهب معين، بل جاز الانتقال. لكن لا بد أن لا يكون ذلك قصد التلهي وتوهين كبار المجتهدين.“

ان اصولوں کو دیکھ کر ایک معتدل قاری ضرور یہ باور کرتا ہے کہ متقدم علماء احناف میں رائے کی آزادی ان کا طرہ امتیاز تھا۔ ممتاز ترین شاگرد بھی باوجود مجتہد فی المذہب ہونے کے متعدد مسائل میں شیخ سے مختلف رائے رکھتے تھے جو ان کی باکمال وسعت کا مظہر ہے۔

فقہ حنفی کی چند اصطلاحات:

مفتی بہا: ہر دور میں پیش آمدہ مسائل پر تخریج فقہ حنفی کی ضرورت رہی ہے اور رہے گی۔ فروع اور چند اصولوں کی بنیاد پر کی گئی یہ کوششیں اصحاب تصحیح اور اصحاب تخریج کی ذمہ داری ٹھہری۔ چنانچہ جو نئے فروعی یا مفروضہ مسائل ان اصحاب کی نظر سے گزرے وہ مفتی بہا کہلائے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ اب علماء

احناف کا فتویٰ ان مسائل پر ایسا ہے۔ مگر مفتی بہا مسائل کو ایک طالب علم و عام قاری کس طرح جانے؟ اس کے لئے الگ فقہی کتب کا ہونا بہت ضروری ہے ورنہ جہالت میں نامعلوم کتنے لوگ کسی بھی فقہی کتاب کو پڑھ کر اس سے مسائل کی تفہیم شروع کر دیتے ہیں جو خالصتاً غیر علمی کوشش ہوگی۔ اسی طرح آج کے مسائل کے لئے اصحاب تصحیح و ترجیح کون ہیں جن کے فتاویٰ وغیرہ کو مفتی بہا کہا جاسکے اس کی وضاحت کی بھی ضرورت ہے۔

ظاہر الروایہ: عام طور پر اس سے مراد ائمہ احناف امام ابوحنیفہؒ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے اقوال مراد لئے جاتے ہیں۔

- الإمام :** سے مراد امام ابوحنیفہؒ ہیں۔
- الشیخان :** مراد امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ ہیں۔
- الطرفان :** اس سے مراد امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ ہیں۔
- صاحبان :** سے مراد امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ ہیں۔
- أصحابنا :** مشہور یہی ہے کہ اس سے مراد تینوں ائمہ کرام ہیں۔
- مشائخ :** وہ فقہاء جنہوں نے امام محترمؒ کا زمانہ نہ پایا۔

ائمہ اربعہ کے مابین اختلاف کی صورتیں: علامہ ابوزید الدبوسی (م ۴۳۰ھ) نے اپنی کتاب تأسیس النظر میں ائمہ اربعہ کے اصولی اختلافات کی متعدد صورتیں بیان فرمائی ہیں جن میں چند ایک درج ذیل ہیں:

- ۱۔ امام ابوحنیفہؒ اور صاحبین میں اختلاف
- ۲۔ امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ میں اختلاف
- ۳۔ امام ابوحنیفہؒ، امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ میں اختلاف
- ۴۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے مابین اختلاف
- ۵۔ امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، حسن بن زیادؒ اور امام زفرؒ میں اختلاف
- ۶۔ احناف اور امام مالکؒ میں اختلاف
- ۷۔ احناف اور امام ابن ابی لیلیؒ میں اختلاف
- ۸۔ احناف اور امام شافعیؒ میں اختلاف

علامہ دبوسیؒ نے ان اصولوں کا بھی ذکر کر دیا ہے جو ان ائمہ کے مابین اختلاف کا سبب بنے۔ بعد کے فقہاء اور علماء کے مابین اصولی اختلاف نظر نہیں آتا بلکہ سطحی سامحوس ہوتا ہے۔ مفقود الخیر کا مسئلہ ہو یا وضوء کا، یا فقہی کتب میں وارد دیگر مسائل ہوں، یہ سب کچھ اختلاف برائے اختلاف نہ تھا بلکہ برائے وسعت تھا۔ کتاب الحیلۃ الناجزۃ میں مؤلف مرحوم نے کھلے دل سے اس کا اعتراف کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ کام لیا۔ مگر متاخر تلامذہ نے عوام کے فعل و عمل کی ذمہ داری اٹھا کر بعض مسائل متعارف کرائے اور ان کی طرف سے ترجمانی بھی کی اور انہیں اختلافی مسائل بھی کہا۔ جب کہ ان مسائل میں ائمہ فقہاء کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ مثلاً: زبان سے نیت کے مسئلے میں بعض متاخر علماء کا یہ کہنا کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ حالاں کہ نیت کا تعلق زبان سے نہیں بلکہ دل سے ہے۔ اور ائمہ اربعہؒ اس پر متفق ہیں۔

وفات: سادات و علو بین اور عباسیوں میں جو سیاسی و انتقامی چپقلش خلافت اموی کے بعد ابھری تو ایسے موقع پر امام محترم نے ابراہیم جو محمد نفس ذکیہ کے بھائی تھے ان کا مالی سیاسی اور اخلاقی ساتھ دیا۔ ان کی ہمت بندھائی اس لئے کہ امام محترم عباسیوں کی ابتدائی بے اعتدالیوں کو دیکھ کر مسلمانوں کے مستقبل سے خائف تھے۔ عباسی خلیفہ منصور نے بغداد کو اپنا مرکز بنانے کے بعد ایسے اکابرین پر ہاتھ ڈالا جن کا مسلم دنیا پر ایک اثر تھا۔ امام محترم کے بارے میں اسے علم تھا

کہ انہوں نے ابراہیم کا ساتھ دیا ہے۔ انہیں گرفتار کرنے اور قتل کرنے کا اسے ایک بہانہ چاہئے تھا۔ بہر حال انہیں بلا بھیجا۔ گفتگو کے دوران اس نے عہدہ قضاء تجویز کیا جسے امام محترم نے رد کر دیا۔ اور کہا کہ میں اس کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ مجھے اپنی طبیعت پر اطمینان نہیں، میں عربی النسل نہیں ہوں اہل عرب کو میرا قاضی بنانا گوار ہوگا۔ درباریوں کی مجھے تعظیم کرنا پڑے گی اور یہ سب کچھ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ منصور نے غصہ میں آ کر کہا کہ تم جھوٹے ہو۔ امام محترم نے فرمایا: آپ نے خود ہی میرے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔ پھر جھوٹا آدمی کیسے قاضی بن سکتا ہے۔ پھر بھی منصور نہ مانا اور قسم کھا کر کہا کہ تمہیں یہ عہدہ قبول کرنا ہوگا۔ امام محترم نے بھی قسم اٹھائی کہ ہرگز قبول نہیں کروں گا۔ اس جرات و بے باکی پر اہل دربار حیران رہ گئے۔ ربیع جو حاجب منصور تھا اس نے غصہ سے کہا: ابوحنیفہ! تم امیر المومنین کے مقابلہ میں قسم کھاتے ہو؟ امام محترم نے جواب میں فرمایا: جی ہاں! اس لئے کہ امیر المومنین کو قسم کا کفارہ ادا کرنا میری نسبت زیادہ آسان ہے۔

خلیفہ منصور نے امام محترم کو جیل بھجوا دیا۔ یہ سن ۱۴۶ھ تھا مگر خلیفہ کو امام صاحب کی وجہ علمی شخصیت، اس کے اثرات اور قبول عام کا کھٹکا چار پانچ سال تک مسلسل رہا۔ بغداد ویسے بھی علوم و فنون کا مرکز بن چکا تھا۔ علماء کی آمد و رفت اور اس کے اہل دین پر اثرات ایک بہت بڑی قوت ثابتہ تھے۔ اس نے آخری تدبیر پھر یہی کی کہ امام محترم کو بے خبری میں زہر دلوادیا۔ امام محترم کو جب علم ہوا تو بارگاہ الہی میں سجدہ شکر بجالائے اور اسی عالم میں جان فرشتہء اجل کے حوالے کی۔ اور یوں منصور کی قید کے بعد قید حیات سے بھی چھوٹ گئے۔

امام محترم کی وفات کی خبر شہر میں پھیلی تو پورا شہر غم و اندوہ میں ڈوب گیا۔ چھ بار نماز جنازہ پڑھی گئی۔ پہلی نماز جنازہ میں کم و بیش پچاس ہزار کا مجمع تھا۔ بغداد کے خیزران نامی مقبرے میں عصر کے قریب جا کر کہیں تدفین عمل میں آ سکی۔ اور یوں علم فقہ کا یہ آفتاب اپنی حیات میں امت مسلمہ کو ایک نئی، منفرد فقہی، استدلالی اور اجتہادی جہت دے کر رخصت ہو گیا۔

ایک تحقیق طلب معاملہ: امام ابوحنیفہؒ بلاشبہ اپنے وقت کی ایک نابذ روزگار شخصیت تھے۔ جن کی فکر کو ان کے شاگردوں نے بڑی عرق ریزی اور محنت کے بعد منظم و مربوط کیا۔ جو ان کی پہچان بنی اور یہی ان کی امامت کی دلیل ہے۔ مگر کچھ مبالغہ آمیز باتیں امام محترم کے بارے میں کہی گئیں جو آج کے تحقیقی دور میں علمی اعتبار سے بہت کمزور حیثیت رکھتی ہیں۔ مناسب یہی تھا جیسا مقام اللہ تعالیٰ نے امام محترم کو دیا اس کے بڑھانے میں یہ غیر علمی کوششیں نہ کی جاتیں۔ ان چند منسوب باتوں میں ایک بات تدوین فقہ اور مجلس علمی کی بھی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوین فقہ کے لئے چالیس ارکان پر مشتمل ایک مجلس قائم کی تھی جس کا طریقہ یہ تھا کہ کسی خاص باب کا کوئی مسئلہ پیش کیا جاتا تھا اگر اس کے جواب میں سب لوگ متفق الرائے ہوتے تو اسی وقت قلم بند کر لیا جاتا اور نہ نہایت آزادی سے بحثیں شروع ہوتیں۔ کبھی کبھی دیر تک بحث قائم رہتی۔ امام ابوحنیفہؒ صبر و تحمل کے ساتھ سب کی تقریریں سنتے اور بالآخر چچا تلافی صادر فرماتے کہ سب کو تسلیم کرنا پڑتا۔ اس کام میں کم و بیش تیس برس لگے۔ بعض نے تدوین فقہ کے اس دورانیہ کو چودہ سال لکھا ہے اور یوں چودہ لاکھ فقہی مسائل مدون ہوئے۔ اس واقعے میں بلاشبہ تحقیقی، علمی اور تاریخی اعتبار سے مبالغہ آرائی ہے۔ مثلاً مجلس علمی کے چالیس ارکان کون کون تھے اہل علم ان کے نام بتانے سے قاصر ہیں اگر کوئی لکھتا بھی ہے تو زیادہ سے زیادہ دس نام مگر باقی کو وہ بھی نہیں مانتے۔ پھر یہ بھی مبالغہ ہے کہ آپؒ بحث و مباحثہ اور غور و تحمل کے بعد سب سے آخر میں ایسا چچا تلافی صادر فرماتے کہ سب کو تسلیم کرنا پڑتا۔ کیونکہ ہمیں تو محسوس یہ ہوتا ہے کہ جناب امام ابوحنیفہؒ کے دونوں عظیم شاگرد اپنے استاد محترم جناب امام ابوحنیفہؒ سے بیشتر مسائل میں اختلاف کرنے کی بھی جرأت کرتے ہیں؟ اس سلسلہ میں امام طحاویؒ عقیدہ طحاویہ میں فرماتے ہیں:

عن أبي يوسف رحمه الله قال: ناظرت أبا حنيفة مدة حتى اتفق رأبي ورأيه، أن من قال بخلق القرآن فهو كافر.

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں: میں نے کئی سال تک امام ابوحنیفہؒ سے بحث کی۔ بالآخر ان کی اور میری یہ رائے ٹھہری کہ جو خلق قرآن کا قائل ہے وہ کافر ہے۔

آخر یہ اختلاف رائے اور مناظرے حریت فکر کو ہی ظاہر کرتے ہیں جس کی گواہی فقہ حنفی کی ہر معتبر کتاب کا ہر صفحہ دیتا ہے۔ کہ ان دو شاگردوں کے علاوہ تیسرے شاگرد امام زفرؒ بھی اپنے استاد محترم کے بتائے ہوئے بیشتر مسائل میں مختلف رائے رکھتے ہیں۔ مزید یہ کہ جب اختلاف بداہتہ ہو رہا ہے تو پھر مجلس کی تشکیل اور مسائل پر بحث و مباحثہ، اور چچا تلافیصلہ، سب کیلئے تسلیم شدہ، یہ سب دعوے غیر صحیح نظر آتے ہیں۔ اسی طرح یہ کہنا کہ تیس برس میں چھ لاکھ مسائل مدون ہوئے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کہاں ہیں؟ وہ محنت شاقہ اور عرق ریزی کوئی ہے جو ضبط تحریر میں آئی بھی مگر اپنا وجود دکھائی دے؟ چالیس ارکان میں سے کوئی بھی اس عظیم الشان کام کو محفوظ نہ رکھ سکا۔ یا کم از کم امام مرحومؒ کے شاگرد رشید امام محمدؒ جنہوں نے حنفی فقہ کی کتب ظاہر الروایہ لکھیں۔ ان میں ہی کسی مسئلہ کا ذکر فرما دیتے۔ افسوس کہ ان چھ لاکھ یا اسی ہزار مسائل میں سے کچھ تو کسی نے ذکر کیا ہوتا۔ امام سفیانؒ ثوریؒ کہا کرتے تھے:

لما استعمل الرواة الكذب استعملنا لهم التاريخ.
جب راویوں نے جھوٹ کو شعار بنالیا تو ہم نے تاریخ کا ہتھیار استعمال کیا۔

یہی بات امام حفص بن غیاث فرماتے ہیں:

إذا اهتمم الشيخ فحاسبوه بالسنين.
جب تم کسی شیخ پر شک کرنے لگو تو اس کا احتساب پھر تاریخ و سال سے کرو۔ (الکفایۃ: ۱۹۳)

اسی اصول کی روشنی میں اگر اس فقہی مجلس کا جائزہ لیں تو پتہ یہ چلتا ہے کہ اس عظیم فقہی فورم کو امام ابوحنیفہؒ نے ۱۲۱ھ میں تشکیل دیا۔ جس کے ارکان میں امام محمدؒ بھی تھے جو ۱۳۵ھ میں پیدا ہوئے۔ امام محمدؒ کی پیدائش سے چودہ سال قبل فورم کی تشکیل ہوئی۔ امام ابوحنیفہؒ کی وفات تک یہ پندرہ سال کے تھے اور اس بورڈ کے اہم رکن تھے۔ اگر ۱۵۰ھ تک یہ بورڈ قائم رہتا ہے تو کیا پندرہ سال کا نوجوان اس اہم بورڈ کا جو فقہی، قانونی اور شرعی مسائل کا حل پیش کرتا رہا ہو رکن ہو سکتا ہے؟ ایک عقلی سوال ہے؟

قاضی ابو یوسفؒ ۱۳۳ھ میں پیدا ہوئے۔ جب بورڈ کے وہ رکن بنے تو ان کی عمر آٹھ برس تھی۔ امام زفرؒ ۱۱۰ھ کی پیدائش رکھتے ہیں۔ گیارہ برس کی عمر میں یہ بھی رکن بن گئے۔ امام یحییٰ بن زکریاؒ ۱۱۹ھ میں پیدا ہوئے۔ اس حساب سے ۱۲۱ھ میں دو برس کے تھے۔ حفص بن غیاثؒ کا سن پیدائش تقریباً ۱۱۵ھ لکھا ہے۔ گویا کہ یہ بورڈ کی تشکیل کے وقت چھ برس کے تھے اور اس کے رکن بنے۔ یہی حال دیگر ارکان کا ہے جو کم وبیش اسی عمر میں ہی تھے جب انہیں اس بورڈ کی رکنیت ملی۔ کیا یہ دعویٰ خلاف عقل نہیں کہ ایسے بورڈ کو ہم بالشان مجلس قرار دیا جائے جس میں دو برس، چھ برس، آٹھ برس، نو، دس یا گیارہ برس کی عمر کے ممبر مقرر ہوں۔ پھر ایسی مجلس جو مسائل یا احکامات O.K. کرے گی اس کی وقعت اہل انصاف کے نزدیک کیا ہوگی۔ اس مبالغے کو علمی حدود اور ضابطوں کے جاننے والا کوئی عالم بھی علمی حیثیت نہیں دیتا۔ اس لئے بیشتر محققین احناف نے اس مجلس کا تذکرہ کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔

بعض دعوؤں کا ضعف: امام سرخسیؒ نے المبسوط کی ابتداء میں اور الموفق بن احمد المکی نے مناقب ابی حنیفہؒ میں یہ بات بڑی شد و مد سے لکھی ہے کہ سب سے پہلے فقہ کی تدوین امام ابوحنیفہؒ نے فرمائی۔ مگر سرخسیؒ کسی کتاب کا ذکر نہ کر سکے اور نہ ہی ابواب و مسائل کا۔ جب کہ آخر الذکر نے بعض ابواب کا ذکر تو کیا ہے مگر کتاب کا تذکرہ وہ بھی نہ کر سکے۔ اس لئے کہ یہ کتاب اگر موجود ہوتی یا امام محترم کے تلامذہ سے ہوتی تو کم از کم مسائل تو اس کتاب کی طرف منسوب ہوتے جیسے مالکی، مسائل کی نسبت مؤطا امام مالک کی طرف کرتے ہیں اور شافعی، کتاب الاہم کی طرف۔ مگر یہاں کوئی ایک صورت بھی نہیں۔

فقہاء اربعہ میں ترجیح کا یہ اصول کہ امام محترم ہی فقہ کے بانی ہیں لہذا ان کی بات دوسرے فقہاء کے مقابلے میں اولیٰ ہوگی۔ یہ دلیل بھی درست نہیں اس لئے کہ جو واضع اول ہوتا ہے اس کی تحریر میں بہت سے تسامحات اور تساہلات شامل ہو جاتے ہیں۔ رہے متاخر تو ان کی بات تنقیح و تہذیب والی ہوتی ہے۔ اگر اس اصول سے یہ بات ثابت کرنا مقصود ہے کہ امام محترم کی کوئی تصنیف ہے تو یہ درست نہیں۔ کیونکہ ان کی کوئی کتاب وجود ہی نہیں رکھتی۔ بلکہ امام محترم کے تلامذہ کی تصنیفات ملتی ہیں۔ اور اگر ان کی مراد یہ ہے کہ وہی سب سے پہلے مسائل میں گویا ہوئے اور فروعات پر خامہ فرسائی فرمائی تو یہ بھی درست نہیں۔ اس لئے کہ امام محترم سے بہت پہلے

صحابہ و تابعینؓ میں محدثین اور فقہاء کی ایک بڑی جماعت بے شمار تفریقی مسائل پر گفتگو فرما چکی تھی۔ مناقب الإمام الشافعی از امام فخر الدین رازی: ۱۹۲۔

امام مالک بن انسؒ (۹۳ھ تا ۱۷۹ھ)

دوسرے بڑے امام ہیں۔ مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ اپنے گھر میں دادا، چچا اور والد خود ایک محدث تھے اور مدینہ منورہ تو ویسے ہی فقہاء و علماء سے منور تھا۔ امام مالکؒ بچپن سے ہی انہی کے چشمہ فیض سے اپنی پیاس بجھاتے رہے۔ فقہائے سبعہ میں باستثناء چند کے اکثر سے امام مالکؒ نے استفادہ کیا اس طرح متفرق سینوں میں پراگندہ علم ایک ہی سینہ میں مجتمع ہو گیا۔ اسی لئے آپؒ امام دارالہجرت کے لقب سے ملقب تھے۔ اور عالم المدینہ کی پیشین گوئی کے مصداق بھی بنے۔ طلب علم کے لئے دوسرے شہروں کا سفر امام صاحبؒ سے ثابت نہیں اس لئے کہ ان کا اپنا گھر اور وطن خود زرو جواہر کی ایسی کان تھے کہ امام مالکؒ کو باہر کسی دوسرے کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

دل و دماغ ہر فکر سے آزاد ہوں اور علم کا شوق بھی ہو تو علم کا حصول ممکن ہوتا ہے مگر شاہد مثالیں ہی اس کی ملتی ہیں کہ طالب علم کو یہ دونوں چیزیں نصیب ہوں۔ اس راہ میں جناب امام مالکؒ کو جو فقر کا سامنا کرنا پڑا وہ ہم سب کے لئے ایک قابل فخر مثال ہے کہ اپنی ضرورت کے لئے انہوں نے چھت کی کڑیاں تک فروخت کر دیں مگر کسی کے آگے اپنا ہاتھ نہیں پھیلایا اور علم کے حصول میں ہمت نہیں ہاری۔ جناب امام بخاریؒ جو فقہ و حدیث میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں، کو بھی سفر میں سوائے ستر کے تن کے کپڑے تک بیچنے پڑے اور گھاس پر قناعت کی مگر دست طلب کو دراز نہیں کیا اور نہ ہی علم کے حصول کو بوجھل سمجھا۔

اساتذہ: شیوخ میں امام مالکؒ کا انتخاب بھی قابل تحسین ہے ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ کر اس کے خریدار نہیں بنتے تھے۔ بلکہ جواہل ہوتا اسی سے علم کی پیاس بجھاتے۔ تحدیث نعمت کے طور پر کہا کرتے کہ میں کبھی کسی غیر فقیہ یعنی سفیہ کی صحبت میں نہیں بیٹھا۔ کبھی فرماتے: اس صحن مسجد کے ستونوں کے پاس میں نے ستر شیوخ کو ایسا پایا جو قال رسول اللہ کہا کرتے۔ اگر ان میں ہر ایک کو بیت المال کا امین بھی بنا دیا جاتا تو یقیناً وہ امین ہی ثابت ہوتے۔ مگر میں نے ان سے حدیث نہ سنی نہ روایت کی اس لئے کہ حدیث رسول ﷺ ان کا میدان ہی نہ تھا کہ وہ اس کے مغز بخن کو سمجھتے۔ اسی طرح اہل عراق سے حدیث روایت نہیں کرتے تھے وجہ یہی بتاتے کہ میں نے انہیں دیکھا ہے کہ وہ یہاں آ کر عموماً ان لوگوں سے حدیث سیکھتے اور سنتے ہیں جن پر وثوق نہیں کیا جاسکتا۔

صحابی رسول جناب عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی تیس سالہ شاگردی میں رہنے والے مایہ ناز فقیہ و محدث مگر آزاد کردہ غلام، امام نافعؒ، امام مالکؒ کے قابل فخر استاد تھے۔ کہا کرتے جب ابن عمرؓ کی حدیث امام نافعؒ سے سن لیتا ہوں تو پھر اس کی پروا نہیں کیا کرتا کہ کسی اور سے بھی اس کی تائید سنوں۔ دوسرے مایہ ناز استاد، جن کی حق گوئی، علمی وقار و رعب کے خلفاء بھی قائل تھے وہ امام ابن شہاب زہریؒ ہیں جن کی روایات سے صحاح ستہ مالا مال ہیں اور جواہر بکر ابن حزمؒ کے بعد حدیث رسول ﷺ کے سب سے بڑے مدون ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے امام صاحبؒ کے شیوخ کی تعداد کچھتر کے قریب بتائی ہے۔

تدریس و علمی وقار: بارہ برس مسلسل اپنے استاد امام نافعؒ کی صحبت فیض یاب سے مستفید ہوئے ان کی وفات کے بعد امام مالکؒ ۷۱ھ میں مسند تدریس پر بیٹھے اور جس جاہ و جلال کی محفل سجائی وہ علم اور علماء کی شان کو ظاہر کرتی تھی۔ تمام مجلس پر ایک مقدس سکوت طاری ہوتا کتاب کا ورق الٹنے سے طلبہ ڈرتے تھے کہ مبادا اس کی سرسراہٹ ہو۔ سب مؤدب ہو کر بیٹھتے اس لئے کہ امام صاحبؒ کی اداء سے شکوہ اور وقار جھلکتا تھا۔ امام شافعیؒ نے جب مؤطا امام مالکؒ سن لی تو ساتھیوں نے انہیں کہا کہ اب آپ کا کام مکمل ہو چکا ہے پھر بھی آپ یہیں ہیں؟ فرمانے لگے: اب تک میں نے اپنے شیخ سے علم سیکھا تھا اب رہ کر ادب و وقار سیکھنا چاہتا ہوں۔ امام ابو حنیفہؒ، خلیفہ ہارون الرشید، اس کے دونوں شاہزادے امین و مامون بھی ان کی مجلس میں آ کر شریک ہوئے اور اسی طرح مؤدب ہو کر بیٹھے۔ چند دنوں بعد لوگوں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ یہی شاہزادے امام محترم کی جوتیاں اٹھانے اور انہیں درست کرنے میں ایک دوسرے سے پہل کیا کرتے۔

عام و خاص اگر علم سے مستفید ہو رہے ہوں تو شخصی منفعت کے لئے امام محترم عام افادہ کا خون نہیں کرتے تھے اور اس کے قائل تھے کہ انی لا اذل العلم میں علم کو رسوا نہیں کرنا چاہتا۔ یا یوں فرمایا کرتے: العلم یزاد ولا یزور علم کے پاس آیا جاتا ہے نہ کہ علم کو لایا جاتا ہے۔ پڑھانے کا عام طریقہ یہ تھا کہ پہلے امام محترم احادیث، فتاویٰ اور اپنی تعلیقات کو قلم بند کر لیتے اور پھر کسی چاق و چوبند و صاحب فہم شاگرد کو مامور کرتے کہ وہ اسے خوش خط لکھے۔ یہی لکھے ہوئے اجزاء کاتب کے ہاتھ میں ہوتے جسے وہ محفل میں پڑھتا اور امام محترم جابجا اس کی تشریح و مطالب بیان کرتے جاتے اور اگر کاتب سے کوئی غلطی ہوتی تو خود اس کی تصحیح فرما دیتے۔

امام صاحب کے بارے میں امام شافعیؒ نے یہ خوب کہا ہے کہ إذا ذکر العلماء فمالک النجم یعنی جب علماء کے بارے میں سلسلہ گفتگو چل نکلے تو امام مالکؒ ہی ایک چمکتا ہوا تار محسوس ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ حدیث رسول ہو تو اس کی تصحیح و تضعیف، رجال کی معرفت اور جرح و تعدیل کے تمام اسباب کا جاننا اور پھر اس کی تصحیح کے بعد احکام کا استنباط اور ان کی تفریع، اختلاف کی صورت میں ترجیح و تطبیق اور پھر واجب و سنت و مستحب وغیرہ کی تعیین ایک غیر معمولی کام تھا جو امام مالکؒ نے قولی، عملی اور تحریری صورت میں پیش کیا اور اس کے بہترین نتائج سے دنیا مستفید ہوئی۔ مؤطاؒ ہو یا ان کے شاگرد عبد الرحمان بن القاسم (م۔ ۱۹۱ھ) کی امام مالکؒ کے ملفوظات فقہیہ و علمیہ پر مبنی کتاب المدونة الكبرى ہو یہ سب شواہد ہیں کہ امام صاحبؒ کے علم و فضل کے بارے میں غلو سے کام نہیں لیا گیا بلکہ یہ ان کی للہیت کا ثمرہ ہے۔

فقہ مالکی کی اہم کتب:

۱۔ **مؤطا امام مالکؒ:** یوں مسلسل باسٹھ سال تک مسجد نبویؐ میں اپنی فقہی، حدیثی، اور تدریسی مخلصانہ خدمات انجام دیں۔ اس عرصے میں اپنی معروف کتاب مؤطاؒ لکھی اور کئی بار نقد و نظر سے گزاری۔ بارہا اس میں ترمیم، حک و اضافہ کے مراحل آئے۔ جب امام محترمؒ نے اس کا آغاز کیا تو کسی شاگرد نے انہیں عرض کی: کہ مؤطاؒ نام کی کتب تو بہت سے لوگ لکھ رہے ہیں؟ آپ کے لکھنے کا کیا فائدہ؟ امام مالکؒ نے جواب میں فرمایا: ما کان للہ بقی۔ جو کام اللہ کے لئے ہوگا اللہ تعالیٰ اسے باقی رکھے گا۔ مؤطاؒ امام تو باقی رہی مگر ان کے معاصرین کی مؤطّات مفقود ہو گئیں۔ مؤطاؒ فقہ کی کتاب بھی ہے اور حدیث کی بھی۔ کیونکہ یہ کتاب مرفوع احادیث کے علاوہ بہت سے فقہی احکام پر مبنی فقہاء صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے فتاویٰ، فیصلہ جات اور اجتہادات سے بھی مالا مال ہے۔ فقہ اور اصول فقہ کے بارے میں امام مالکؒ کے نقطہ نظر کو واضح کرتی ہے۔

شہرت کتاب: امام محترمؒ کی زندگی میں ہی اس کتاب کو ایسا عروج ملا کہ خلیفہ ہارون نے اس کتاب کو بطور ایک قانون کے اپنی خلافت میں نافذ کرنا چاہا اور اسے ایک آئینی حیثیت یوں دینا چاہی کہ اسی کے مطابق تمام علماء و فقہاء فتوے دیں مگر امام محترمؒ نے بڑی عاجزی سے فرمایا: کہ یہ میرا علم ہے جب کہ عالم اسلام میں بے شمار اہل علم موجود ہیں ان کے علم سے بھی مستفید ہونا چاہئے۔ ایسی حالت میں ایک شخص کی رائے و عقل پر جس سے صحت و غلطی دونوں کا امکان ہے عالم اسلام کو مجبور کرنا مناسب نہیں۔ لہذا میرے علم کو حتمی علم کی حیثیت نہ دی جائے۔ امام محترمؒ اپنی سوچ اور فقہ کو اگر عام کرنا چاہتے یا اپنی شہرت و وجاہت چاہتے تو ان کے لئے کتنا سنہرا موقع تھا کہ ارباب حکومت میں گھس کر اپنے مسلک کو عام کرتے مگر انہوں نے خانہ کعبہ میں اپنی کتاب مؤطاؒ کو آویزاں کروانا پسند نہ فرمایا۔ الدبیان: ۲۰۰

انہی کی زندگی میں یہ کتاب اندلس میں پہنچ چکی تھی اور افریقہ کے علاوہ اہل مشرق بھی اس کتاب کے نسخوں کو اپنے اپنے علاقوں کی زینت بنا چکے تھے۔ امام شافعیؒ کے علاوہ امام محمدؒ بن الحسن بھی ان کے شاگرد تھے انہوں نے امام مالکؒ سے ان کی مؤطاسنی۔ بعد میں انہوں نے اپنے دیگر اساتذہ سے سنی ہوئی احادیث کو مؤطاؒ میں شامل کر دیا۔ یہ وہ روایات تھیں جو امام مالکؒ نے اپنی اصل مؤطا میں بیان نہیں کی تھیں۔ اس بناء پر ان کی مؤطا، مؤطا امام محمدؒ کے نام سے مشہور ہے جو مؤطا امام مالک سے بالکل مختلف مواد رکھتی ہے۔ امام محمدؒ نے یہ کوشش بھی کی کہ اپنی مؤطا میں ہر حدیث کے آخر میں حنفی مسائل کو ثابت کر دیا

جائے۔

۲. المدونہ: یہ فقہ مالکی کی دوسری مشہور کتاب ہے۔ اس میں ان سوالوں کے جوابات جمع کئے گئے ہیں جو امام مالکؒ سے پوچھے گئے تھے۔ پھر انہیں ان کے شاگردوں نے مرتب کر کے کتابی شکل دے دی۔ امام سحنونؒ نے اس کتاب کو مرتب کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ بعض مقامات پر ان آثار سے بھی احتجاج کیا جو ابن وہب کی روایت موطا سے تھے۔ مگر یہ سب کچھ امام ابن القاسم سے تصدیق کے بعد کیا۔ اس کتاب میں تقریباً چھتیس ہزار مسائل ہیں اور مالکیوں کے ہاں اسے بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

امام مالکؒ کے شاگرد:

امام مالکؒ کی شاگردی کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ مدینہ منورہ جو مسلمانوں کا مرکز عقیدت ہے دنیا بھر سے آنے والے مسلمان نہ صرف امام مالکؒ کے حلقہ درس میں بیٹھتے ہیں بلکہ ان کے شاگرد بن کر موطا پڑھتے ہیں اور پھر اس کی روایت اپنے اپنے ملکوں میں جا کر پھیلاتے ہیں۔ جن میں مصری، اندلسی، حجازی اور عراقی بھی ہیں۔ چند نامور شاگردوں کے نام یہ ہیں: ابو عبد اللہ عبد الرحمن بن القاسم العتقی (م ۱۹۱ھ) مصری بیس برس امام مالکؒ سے علم سیکھتے رہے۔ ابو محمد عبد اللہ بن وہب بن مسلم (م ۱۹۷ھ) انہوں نے بھی بیس برس امام محترم کی شاگردی میں گزارے۔ ابو عبد اللہ زید بن عبد الرحمن القرطبی (م ۱۹۳ھ) ان کا لقب شبطون تھا امام مالکؒ سے انہوں نے موطا سنی۔ اسد بن الفرات بن سنان (م ۲۱۳ھ) تیونس کے حکمران رہے۔ امام مالکؒ سے انہوں نے بھی موطا سنی۔ ابو مروان عبد الملک بن ابی سلمہ الماشون (م ۲۱۲ھ) اپنے وقت کے مفتی تھے۔

فقہ مالکی کے اصول: امام مالکؒ کے فقہی منہج کا مبداء اہل حجاز کا وہ منہج ہے جس کا آغاز امام سعید بن المسیبؒ نے کیا تھا۔ قاضی عیاضؒ نے ان فقہی اصولوں کی تفصیل دی ہے جن پر امام مالکؒ اعتماد کرتے تھے۔ ان کے نزدیک وہ اجتہاد جس پر عمل ہو سکے اور جو شریعت کے مزاج کے مطابق ہو اس کی شرائط، اس کا ماخذ اور اس کے مراتب وغیرہ درج ذیل ہیں:

اجتہاد کا ایک جامع اصول: اجتہاد کرتے وقت اللہ تعالیٰ کی کتاب کو اس طرح مقدم رکھنا ہے کہ نصوص سے ہی اس کے واضح ادلہ ہوں پھر اس کے ظاہر معانی کو لیا جائے پھر اس کے مفہوم کو۔ پھر اسی طرح سنت رسول ﷺ میں متواتر اور مشہور کی ترتیب سے مستفید ہوا جائے۔ پھر مراتب نصوص کا لحاظ رکھا جائے جن میں ان کے ظواہر اور ان کے مفہوم، جو کتاب اللہ کے مطابق ہوں کو مقدم رکھا جائے۔ پھر اجماع پر انحصار کیا جائے بشرطیکہ وہ مسئلہ کتاب اللہ و سنت متواترہ میں نہ ہو۔ ان تینوں کی عدم موجودگی میں اس مسئلہ پر قیاس بھی کیا جاسکتا ہے اور قیاس سے استنباط بھی۔ کیونکہ کتاب اللہ تو قطعی الثبوت ہے اور متواتر سنت رسول ﷺ بھی، اسی طرح نص بھی قطعی ہوتی ہے تو انہیں بہر حال مقدم رکھنا واجب ہوگا۔ پھر ان نصوص کے ظواہر اور مفہوم ہیں کیونکہ ان کے معنی کا بھی ان دونوں میں شامل ہونے کا احتمال ہے۔ ان کے بعد اخبار آحاد مقدم ہوں گی جن پر عمل کرنا واجب ہے یہ اس صورت میں جب مسئلہ کتاب و سنت (قرآن و سنت رسول ﷺ) متواترہ میں نہ ہو۔ خبر متواتر قیاس پر مقدم ہوگی۔

افتاء میں رجحان: افتاء میں یا استنباط مسئلہ میں امام محترم قرآن مجید و حدیث رسول ﷺ پر اعتماد کرتے ہیں۔ اور اس معاملہ میں سارا دار و مدار علماء حجاز میں کبار تابعین محدثین پر کرتے ہیں۔ یعنی اہل مدینہ کی روایات، ان کے قضایا و احکام کو قابل عمل قرار دیتے ہیں۔ وجہ سیدنا عمرؓ اور ان کے صاحب زادے عبد اللہؓ کی خاص اہمیت تھی۔ دیگر شہروں کی روایات کو یہ کہہ کر ترک کر دیا کرتے کہ یہ میرے شہر سے نہیں ہیں۔ مزید یہ کہ اہل مدینہ کا اس پر عمل بھی نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اگر کسی مسئلہ میں کوئی جواب انہیں نہ ملتا تو پھر قیاس یا ایک نئی دلیل یعنی مصالح مرسلہ کے ذریعے اجتہاد کر لیا کرتے تھے جس کا مطلب ہے مصلحت عامہ کا تقاضا۔

چند مالکی اصطلاحات

۱۔ مفتی۔ جو فقہ مالکی میں رائج کے مطابق ایسا فتویٰ دے جو نفس مسئلہ کے لئے مناسب ہو۔ اور غیر مفتی وہ ہوتا ہے جو اجتہاد کی شروط پر نہیں اترتا بلکہ وہ متفق علیہ مسائل ہی بیان کرتا ہے۔ یا وہ مسائل جو مذہب میں مشہور ہوں یا جن کو اولین فقہاء مالکیہ نے ترجیح دی ہو۔

۲۔ مالکی کتب کی روایات میں اور مشائخ کی روایات میں ترجیح کے کچھ اصول ہیں۔ مثلاً: مشائخ کے اقوال میں اگر اختلاف ہو تو الممدونہ میں امام مالک کا قول ابن القاسم کے قول سے مقدم ہوگا۔ اس لئے کہ امام مالک بہر حال بڑے امام ہیں۔

اسی کتاب میں ابن القاسم کا قول دوسرے کے مقابلے میں مقدم ہوگا اس لئے کہ وہ امام مالک کے مذہب کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔

۳۔ مذہب کی اصطلاح سے مراد مذہب امام مالک ہے۔ مالکی مسلک میں فقہاء مختلف رائے بھی رکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں ترجیح کے لئے مشہور کا لفظ مستعمل ہوتا ہے جس سے مراد وہ مسئلہ جو مالکی مسلک میں مشہور ہے یا جس مسئلے کے قائلین بہت ہوں۔

موازنہ مابین فقہ مالکی وحنفی: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی کتاب حجتہ اللہ البالغہ میں دونوں ائمہ کرام کے مقام و مرتبے کو بیان کرنے کے بعد دونوں کا موازنہ کر کے ان کے اپنے اپنے طریقہ اجتہاد پر روشنی ڈالی ہے۔

امام مالک علماء مدینہ کی احادیث کو خوب یاد رکھتے تھے۔ ان کی سند بھی زیادہ قوی تھی۔ سیدنا عمرؓ کے فیصلہ جات، ابن عمر، سیدہ عائشہؓ اور فقہاء سبعہ کے اقوال سب سے زیادہ جانتے تھے۔ امام مالک اور ان کے ہم سروس کی محنت سے روایت حدیث اور افتاء کا علم قائم ہوا۔

کان مالک من أثبتهم في حديث المدنيين
عن رسول الله ﷺ وأوثقهم إسناداً،
وأعلمهم بقضايا عمر، وأقاويل عبد الله بن
عمر، وعائشة، وأصحابهم من الفقهاء
السبعة، وبه وبأمثاله قام علم الرواية
والفتوى.

اس کے بعد امام ابو حنیفہؒ کا حال لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

امام ابوحنیفہؒ نے ابراہیم نخعی اور ان کے معاصرین کا مذہب اختیار کیا ہوا تھا۔ اس سے ذرا ادھر ادھر نہ ہوتے تھے۔ الا ماشاء اللہ۔ ابراہیم نخعی کے قواعد پر مسائل نکالنے میں امام محترم کو عظیم دسترس حاصل تھی۔ وجوہ تخریج میں بڑے باریک بین تھے۔ ان کی مکمل توجہ فروع پر تھی۔ میری اس بات کی تحقیق اگر آپ کرنا چاہیں تو امام محمد کی کتاب الآثار اور مصنف عبدالرزاق اور مصنف ابوبکر لے لیجئے۔ پھر ان میں ابراہیم نخعی اور ان کے معاصرین کے اقوال لے لیجئے۔ اب امام ابوحنیفہؒ کے مذہب سے ان کا موازنہ کر دیکھئے تو آپ شاید سوائے چند جگہوں کے کہیں فرق نہیں پائیں گے۔ پھر ان چند جگہوں میں بھی امام ابوحنیفہؒ فقہاء کوفہ کے مذہب سے باہر نہیں جاتے۔

وكان أبو حنيفة الزمهم بمذهب إبراهيم وأقرانه، لا يجاوزه إلا ما شاء الله، وكان عظيم الشأن في التخريج على مذهبه، دقيق النظر في وجوه التخريجات مقبلا على الفروع أتم إقبال، وإن شئت أن تعلم حقيقة ما قلناه فلخص أقوال إبراهيم وأقرانه من كتاب الآثار لمحمد رحمه الله، وجامع عبد الرزاق، ومصنف أبي بكر بن أبي شيبة، ثم قايسه بمذهبه تجده لا يفارق تلك المحجة إلا في مواضع يسيرة وهو في تلك السيرة أيضا لا يخرج عما ذهب إليه فقهاء الكوفة. حجة الله البالغة: 418/1

وفات: امام محترمؒ کو اللہ تعالیٰ نے خدمت دین کا بھرپور موقع دیا۔ ۹۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۷ھ میں مسجد نبوی کی مسند درس پر قدم رکھا۔ باسٹھ سال تک علم و دین کی خدمت کی۔ ۸۱ سال کی عمر میں ہی طبیعت میں ضعف و ناتوانی آ چکی تھی۔ تسلسل سے مسجد نبوی میں آنا، غم و شادی کی تقریبات میں جانا سب موقوف ہو گیا تھا۔ لوگ اعتراض کرتے تو جواب میں فرماتے: ہر شخص اپنا عذر بیان نہیں کر سکتا۔ آپ کے معروف شاگرد معن بن عیسیٰ جو صحاح ستہ کے رواۃ میں سے ہیں وہ اس عمر میں امام صاحب کے خادم تھے۔ انہی کا سہارا پکڑ کر چلتے تھے۔ اور کبھی کبھار اس بڑھاپے میں بھی درس و افتاء کی خدمت جاری رہتی۔ امام محترمؒ اتوار کے روز بیمار ہوئے یہ بخار اپنی شدت تین ہفتے تک دکھاتا رہا۔ اس دوران مرض کی شدت میں کوئی تخفیف نہ ہوئی۔ شاگردوں کو امام محترم کی تکلیف و بیماری کا جو ملال تھا اس کا یوں اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ صرف مدینہ کے علماء کو یقین ہو گیا کہ اب امام محترم کا آخری وقت ہے تو تیمارداری کے لئے حدیث وفقہ کے ۱۶۰ علما مودب بہ چشم نم آس پاس بیٹھے تھے۔

امام تعزنیؒ جو آپ کے خاص تلامذہ میں سے تھے انہوں نے امام محترم کی آنکھوں سے آنسو نکلتے دیکھے تو سبب پوچھا۔ امام محترم فرمانے لگے: تعزنی! میں نہ روؤں تو کون روئے۔ اے کاش! مجھے میرے ہر قیاسی فتوے کے بدلے میں ایک کوڑا مارا جاتا۔ یہی گریہ جاری تھا لب متحرک تھے کہ اسی عالم میں جان جان آفرین کے سپرد کردی۔ اور یوں ۸۶ سال کی عمر پا کر ۱۷۷ھ کو انتقال فرمایا۔

جنازہ میں خلقت تھی۔ سارا مدینہ حتیٰ کے والی مدینہ پیدل جنازہ میں نہ صرف چلا بلکہ اس نے کندھا دیا۔ جنت البقیع میں تدفین ہوئی جہاں ام المؤمنین عائشہؓ، عثمان ذوالنورینؓ، سیدنا حسنؓ، سیدہ فاطمہؓ ام المؤمنین حفصہؓ جیسی عظیم ہستیاں مدفون ہیں۔

امام شافعیؒ (۱۵۰-۲۰۴ھ)

نام اور بچپن: آپ کا نام محمد بن ادریس ہے۔ قریشی النسب تھے، شافع ان کے جد اعلیٰ تھے جن کی طرف نسبت سے آپ شافعی کہلائے۔ غزہ میں رجب ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد پہلے ہی فوت ہو چکے تھے۔ دو سال کے تھے کہ والدہ انہیں یمن اپنے قبیلہ ازد میں لے آئیں جہاں امام شافعیؒ نے اپنا بچپن گزارا۔ سات سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کیا اور دس سال میں مؤطاً امام مالک یاد کر لی۔ پھر مکہ آ گئے اور چچا محترم کے پاس رہ کر علم الانساب اور دیگر علوم سیکھنا شروع کئے۔

اساتذہ: مفتی مکہ مسلم بن خالد زنجی نے اس ذہین و ذکی اور قوت حفظ سے مالا مال بچے کو تین برس تک اپنے علم فقہ و حدیث سے مستفید فرمایا۔ بعد میں اپنے استاد کا خط لے کر مدینہ امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے جنہوں نے ان کی گفتگو اور ذوق علمی سے متاثر ہو کر قبول فرمایا۔ تین برس امام مالکؒ کی خدمت میں صرف کئے اس دوران صحابہ کرام، تابعین اور امام مالکؒ کی فقہ کو اچھی طرح سمجھا اور یاد کیا۔ مدینہ کے دیگر سرکردہ علماء میں ابراہیم بن سعد الانصاری، عبدالعزیز دروردی اور دیگر علماء سے بھی بکثرت احادیث، آثار صحابہ اور ان کے فتاویٰ کو پڑھا اور جستہ جستہ جرح و تعدیل کے اصول و قواعد کو بھی محفوظ کرتے گئے۔ امام مالکؒ اور دیگر فقہائے مدینہ نے آپ کی قابلیت کو جاننے کے بعد متفقہ طور پر انہیں فتویٰ دینے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

رحلہ برائے علم: بعد ازاں یمن تشریف لے گئے یہاں قبیلہ ہذیل میں رہ کر تیر اندازی، لغت، شاعری، تاریخ، انساب، نحو اور علم فراست جیسے علوم سیکھ کر ان میں کمال حاصل کیا۔ دس ہزار اشعار غرائب سمیت یاد کئے۔ عربی زبان میں ایسا درک پایا کہ مبرد، جاحظ، ابوالعباس ثعلب، ابومنصور ازہر، ابوسلیمان خطابی اور علامہ زنجشیری و امام رازیؒ نے زبردست خراج تحسین پیش کرتے ہوئے انہیں لغت اور ادب کا امام قرار دیا۔ فن تاریخ اور ایام العرب سے بھی بخوبی شناسائی تھی اور علم طب پر گہری نظر بھی۔ علم فراست بھی۔ امام شافعیؒ سے عرض کی کہ اپنی فراست سے یہ بتائیے کہ اس شخص کا ذریعہ معاش کیا ہو سکتا ہے؟ انہوں نے فرمایا: یہ شخص بڑھئی یا درزی معلوم ہوتا ہے۔ حمیدیؒ کہتے ہیں میں نے واپس جا کر اس سے پوچھا کیا کرتے ہو؟ اس نے کہا: میں پہلے بڑھئی تھا لیکن آج کل درزی کا کام کرتا ہوں۔

واحد امام ہیں جو مکہ، مدینہ، یمن، عراق، شام، مصر اور الجزائر کے علماء و فضلاء سے ملے اور ان سے فقہی و اجتہادی مسائل پر مذاکرات فرماتے رہے۔ فقہ جاز کو سیکھنے کے بعد امام محترم عراق تشریف لے گئے۔ وہاں انہوں نے محسوس کیا کہ امام مالکؒ کے بارے میں اہل عراق عصیت رکھتے ہیں۔ وہاں کے فقہاء کرام جو دربار خلافت میں ایک عالی مقام رکھتے تھے امام شافعیؒ نے اس کے باوجود بھی ان کے سامنے بہت ہی مناسب علمی و مناظراتی انداز میں امام مالکؒ کے نقطہ نظر کا دفاع کیا۔

فکر میں تبدیلی: بغداد میں رہتے ہوئے امام شافعیؒ نے ایک کتاب الحجۃ لکھی جس میں امام محترم نے اپنے قدیم نقطہ نظر کا خوب دفاع کیا اور جس میں اہل الرائے پر سخت نکیر کی اور یوں اہل عراق نے انہیں ناصراً الحدیث کا خطاب دیا۔ اس قیام کے دوران اہل الرائے کی کتب کا گہرائی سے مطالعہ بھی فرماتے رہے۔ اور غور و فکر بھی کرتے رہے۔ اس مطالعے نے ان کی سوچ کو ایک اور رخ دے دیا کہ مدرسہ اہل الرائے اور مدرسہ اہل حدیث کے درمیان کیوں نہ ایک بین بین راستہ نکالا جائے جس میں نصوص سے وابستگی بھی ہو اور مناسب رائے کا عقلی اظہار بھی۔ اس لئے جب امام محترم مصر تشریف لائے تو انہوں نے اپنی سابقہ فکر سے ہٹ کر نئے انداز سے اپنی کتب کو لکھنا شروع کیا۔ ان کی مشہور کتب کتاب الرسالہ الجدیدة، اختلاف الحدیث، جماع العلم، إبطال الإحسان، أحكام القرآن، صفة الأمر والنہی، اختلاف مالک و الشافعی، اختلاف العراقيين اور کتاب الأم وغیرہ اسی سوچ کی عکاس ہیں۔ جو ان کی چار سالہ محنت شاقہ کا ثمرہ ہیں۔ ان کتب کے مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امام محترمؒ نے جہاں محسوس کیا کہ رائے کے استعمال کی یہاں

ضرورت ہے انہوں نے وہاں اسے استعمال کیا اور جہاں حدیث کو بطور دلیل پیش کرنے کی ضرورت تھی وہاں اسے پیش کر دیا۔ غرضیکہ جہاں جہاں انہوں نے دونوں مذاہب میں کمی دیکھی اسے پورا کرنے کی کوشش کی۔ اور عام متداول فقہی منہج سے ہٹ کر اسے ایک نیا رخ دینے کی کوشش کی۔ مثلاً:

راج فقہی اصولوں کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا۔ فقہ کی بنیاد اصولوں پر رکھی اور فروع و جزئیات کو کلی قواعد کے ساتھ منضبط کر دیا۔ مشہور فقہ **ربیعہ الرائی** نے ایک مرتبہ امام شافعیؒ سے کہا: اگر کوئی شخص رمضان کا روزہ قضاء کر دے تو اسے بارہ روزے رکھنا چاہئیں اس لئے کہ اس مہینے کا ایک دن دوسرے مہینوں کے بارہ دن کے برابر ہے۔ امام شافعیؒ نے جواب دیا: یہ فقہ ہے یا مذاق۔ اگر تمہارا نظریہ یہی ہے تو پھر شب قدر کی نماز فوت ہو جائے تو وہ ہزار مہینے تک قضاء کیا کرے کیونکہ لیلۃ القدر خیر من ألف شهر قرآن میں ہے۔ ربیعہ خاموش ہو کر چلے گئے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی بھی امام شافعیؒ کے اس نقطہ نظر کو پسند فرمایا کرتے اور استنباط مسائل میں شاہ صاحبؒ کے پیش نظر ہمیشہ امام صاحب کے اصول رہے۔ جو ان کی کتب الإنصاف، عقد الجید، حجة الله البالغہ اور المسوی والمصفی میں جگہ جگہ واضح ہیں۔

تلامذہ: ان کی صحیح تعداد کا تعین کرنا تو مشکل ہے البتہ کچھ ممتاز افراد کے تعین سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ امام محترمؒ جیسی ذی علم شخصیت سے کن مشاہیر و اکابرین نے استفادہ فرمایا۔ امام ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں: ان میں امام ابو عبد اللہ الحمیدیؒ (م ۲۱۹ھ) مکہ کے رہنے والے، حافظ حدیث اور عظیم فقیہ، امام شافعیؒ کے سب سے بڑے شاگردوں میں سے تھے۔ جو امام بخاریؒ کے استاذ ہیں، ابو حفص حرمہ بن یحییٰ المصری (۱۶۶-۲۴۴)، سلیمان بن داؤد الہاشمی (م ۲۱۹ھ)، ابو علی حسن بن محمد زعفرانیؒ (م ۲۵۹ھ) پہلے کوئی فقہ پر عمل کرتے تھے بعد میں امام محترم سے متاثر ہو کر امام شافعیؒ کے مستقل شاگرد بن گئے ان سے بہتر فصیح اور لغت کا جاننے والا کوئی نہ تھا۔ ابو ابراہیم اسمعیل بن یحییٰ المزنی (۱۷۵-۲۶۴)، وسیع علم رکھتے تھے۔ زاہد، عالم، مجتہد، مناظر اور مشکل علمی مباحث کو سلجھانے والے تھے۔ امام شافعیؒ فرمایا کرتے: اگر یہ شیطان سے مناظرہ کریں تو غالب آئیں گے۔ اپنی اصلاح کے لئے مُردوں کو لوجہ اللہ نہلایا کرتے۔ کہا کرتے یہ میں اس لئے کرتا ہوں تاکہ میرے دل میں سختی نہ پیدا ہو جائے۔ ابو محمد الربیع بن سلیمان بن عبد الجبار المرادی (۲۷۰)، مصر کے ایک ثقہ عالم، جنہوں نے امام شافعیؒ کے بعد ان کی جانشینی کی۔ انہیں امام شافعیؒ نے فرمایا تھا: ربیع! تم میری کتابوں کی اشاعت کرو گے۔ ربیع فرماتے ہیں جو ہمارے شیخ نے ہمیں فرمایا وہ حرف بحرف صحیح ہوا۔

فقہ شافعی کے اصول: امام محترم نے اپنی مشہور کتاب الرسالہ لکھی جو اصول فقہ اور اصول حدیث کی اولین نفیس اور اساسی کوشش قرار پائی۔ یہ ایسے اصول ہیں جو آج تک بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور سبھی کے نزدیک مسلمہ ہیں۔

استدلال میں اصل حیثیت کس کی؟

امام محترمؒ نے احکام و مسائل میں استدلال کے چند مدارج پر رائے دی ہے جس سے فقہ شافعی میں استدلال کی اصل حیثیت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ آراء درج ذیل ہیں:

۱۔ دین میں اصل حیثیت قرآن مجید و سنت رسول ﷺ کی ہے اور اگر ان سے استدلال نہ ہو سکے تو پھر قیاس جو قرآن مجید و سنت رسول ﷺ کے مطابق ہو۔ وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید و سنت رسول ﷺ کے قوانین محدود ہیں اور امتداد زمانہ کے ساتھ پیش آنے والی صورتیں غیر محدود اس لئے جب کوئی واقعہ پیش آئے تو پہلے قرآن مجید و حدیث رسول ﷺ میں غور کرنا چاہئے اور صحابہ کرامؓ کے تعامل پر بھی نظر رکھنی چاہئے۔ اگر مسئلہ سے متعلق کوئی بات مل جائے جو صورت حال کے چند پہلوؤں سے تو یکساں ہو مگر ہو بہو نہ ہو تو قرآن مجید و حدیث رسول ﷺ کے بیان شدہ امرا و پیش آمدہ واقعہ میں مماثلت پیدا کرنے کے لئے ہمیں یہ حق ہے کہ ہم اس امر کی جستجو کریں کہ قرآن مجید و حدیث رسول ﷺ کے اس قاعدہ مغیہ کی علت اور وجہ کیا تھی؟ پھر ہم بھی اس علت کی بناء پر قیاس کرنے کے مجاز ہیں۔ قیاس کے متعلق اس دقیق بات کا نتیجہ یہ نکلا کہ بڑے ممتاز محدثین امام محترم کی اس رائے سے متفق ہو گئے۔

- ۲۔ کوفہ و مدینہ کی روایتوں پر اعتماد کی بجائے جب حدیث رسول ﷺ صحیح، متصل سند کے ساتھ ثابت ہو جائے تو اس پر عمل لازمی ہے۔
 - ۳۔ حدیث ہمیشہ اپنے ظاہری معنی پر محمول ہونی چاہئے اور جب اس میں متعدد معانی کا احتمال ہو تو جو معنی ظاہری معنی کے قریب ہوں وہ لئے جائیں گے۔
 - ۴۔ صحابہ کرامؓ کا اجماع خبر واحد سے بالاتر ہے اور اجماع صحابہ نہ ہونے پر خبر واحد قابل عمل ہے۔ حدیث خواہ کسی درجہ کی ہو قرآن کی ناسخ نہیں ہو سکتی۔
 - ۵۔ جب چند احادیث باہم متعارض ہوں تو ان میں یہ غور کرنا چاہئے کہ راوی کیسے ہیں؟ دوسرے احکام کی ترتیب، تیسرے صحابہ کے تقدم و تاخر ایمان کا لحاظ بھی کرنا چاہئے۔
 - ۶۔ حدیث مرسل بجز امام سعید بن المسیبؒ کے ناقابل قبول ہے جب کہ یہ دوسری سند سے بھی مروی نہ ہو۔ دوسری یا تیسری صدی ہجری کی مرسل امام شافعیؒ کے نزدیک قطعی قابل قبول نہیں۔
 - ۷۔ حدیث موقوف، منقطع کی حیثیت حدیث صحیح، متصل کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔
 - ۸۔ امام شافعیؒ کے دور میں اقوال صحابہ کرامؓ جمع ہو گئے تھے اور بعض اقوال صحیح حدیث کے خلاف تھے اس لئے امام محترم نے یہ طے کیا کہ صحیح حدیث کے مقابلہ میں اقوال صحابہ کوئی وقعت نہیں رکھتے۔
 - ۹۔ ہر عام حکم میں مستثنیات بھی ہوتے ہیں اور عام قطعی نہیں ہوتا۔ ۱۰۔ جلب منفعت سے دفع مضرت اولیٰ ہے۔
 - ۱۰۔ ایک اصل کو دوسرے اصل پر قیاس نہیں کیا جاسکتا اگر اس کی علت دریافت ہو جائے تو فرع کو اصل پر قیاس کرنا چاہئے۔
 - ۱۱۔ اصل کے لئے کیوں اور کیسے کی بات نہیں کی جاسکتی بلکہ یہ بات فرع کے لئے کہی جاسکتی ہے کہ کیوں اور کیسے۔
 - ۱۲۔ اجماع وہاں ہوگا جہاں کتاب و سنت خاموش ہوں اور پھر قابل قبول بھی۔
 - ۱۳۔ اگر اجماع بھی نہ پائے تو پھر مجتہد قیاس میں غور و خوض کرے۔
- مشہور شافعی کتب:** یہ وہ کتب ہیں جن پر شافعی مسلک قائم ہے۔
- ۱۔ **الرسالہ:** اصول فقہ میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے جو امام محترم نے لکھی۔ تالیف کی وجہ یہ بنی کہ امام شافعیؒ نے محسوس کیا کہ فقہاء کرام کے ہاں طریقہ استنباط غیر واضح اور غیر معین سا ہے۔ اس لئے یہ کتاب لکھی جس میں کتاب و سنت کی نصوص، ناسخ و منسوخ، علل احادیث، قبولیت حدیث کی شروط، خبر واحد، اجماع اور قیاس وغیرہ کے وضع مباحث ہیں۔ ان کے شاگرد ربیع بن سلیمان نے اس کتاب کو روایت کیا۔
 - ۲۔ **الأُم:** یہ کتاب اپنے شاندار اسلوب، اور دقت تعبیر میں منفرد ہے۔ علمی مناظراتی انداز ہے جو تفہیم مسائل میں خاصا موثر ہے۔ اس کتاب کے سات اجزاء ہیں۔ امام محترم نے جو دوسری کتب و فتاویٰ لکھیں انہیں بھی اس کے ساتھ ملا دیا ہے جیسے: جماع العلم، ابطال الاستحسان، اختلاف مالک والشافعی، الرد علیٰ اهل المدينة، اختلاف ابی حنیفہ وابن ابی لیلیٰ اور سیر الأوزاعی وغیرہ۔
 - ۳۔ **مسند الإمام الشافعی:** نیشاپور کے چند شاگردوں نے اس کتاب کو کتاب الأُم اور دیگر کتب میں مروی امام محترم کی روایات کو یک جا کرنے کی کوشش اس میں کی ہے۔ جب کہ امام محترم کی بہت سی احادیث اس کتاب میں نہیں سما سکیں۔
 - ۴۔ **مختصر المزنی:** شافعی مسلک میں لکھی ہوئی کتب میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کی ترتیب بھی امام شافعی کی طرز پر ہے۔ متاخر شوافع نے اس کی شروحات لکھیں اور حاشیے بھی چڑھائے۔

بعض مشہور فقہی اصطلاحات

کتب شافعیہ میں بعض مصطلحات بار بار مستعمل ہوئی ہیں۔ ان سے مراد کیا ہے؟۔

۱۔ **مفتی:** جب مفتی امام محترم کے کسی مسئلہ کے بارے میں دو قول پائے تو مفتی کے لئے یہ لازمی ہوگا کہ ان دو میں اسے اختیار کرے جسے سابق فقہاء مذہب نے ترجیح دی ہو۔ ورنہ وہ توقف کرے۔ جب مسئلہ مجتہد شوافع کے ہاں متعدد صورتوں کا حامل ہو یا اس کی روایت کی مختلف اسانید ہوں تو مفتی اس صورت کو لے گا جسے سابق مجتہدین نے ترجیح دی ہو۔ یہی وہ اصول ہے جسے اکثر فقہاء شوافع نے صحیح قرار دیا ہے۔ پھر درجات کے اعتبار سے اعلم کو ترجیح دی جائے گی پھر اودع کو۔ اگر مفتی ترجیح کی کوئی شکل نہ پائے تو اس رائے یا فتویٰ کو مقدم رکھے گا جسے امام بوہیطی، ربیع المرادی اور المرزئی نے امام شافعی سے روایت کیا ہے۔

۲۔ **الأظهر:** مراد دو اقوال میں یا امام شافعی کے اقوال میں اختلاف کی صورت میں کونسا قول زیادہ قوی ہے۔ یہی مقابلہ قوت کو ظاہر کرتا ہے۔

۳۔ **المشہور:** دو اقوال میں یا امام شافعی کے اقوال میں مشہور ہو۔ ان اقوال میں اختلاف نمایاں نہیں ہوتا۔ مشہور کا مقابل اپنے ضعف کی وجہ سے غریب کہلاتا ہے۔

۴۔ **الأصح:** دو صورتوں میں یا دو سے زیادہ صورتوں میں صحیح ترین قول۔ یہ اقوال وہ ہوتے ہیں جنہیں شوافع امام شافعی کے بنائے ہوئے اصول کی بناء پر ان کے کلام سے نکال لاتے ہیں۔ یا پھر ان کے قواعد سے استنباط کرتے ہیں۔ جو صورت مذکورہ ہوتی ہے اس میں اختلاف نمایاں ہو سکتا ہے۔ اس کا مقابل صحیح کہلاتا ہے۔

۵۔ **الصحيح:** دو یا دو سے زیادہ صورتوں میں کون صحیح ہے اور کون ضعیف؟ شوافع علماء میں یہ اختلاف کوئی زیادہ قوی نہیں ہوتا۔ اس کا مقابل ضعیف ہوتا ہے۔

۶۔ **المذهب:** دو یا دو سے زیادہ آراء کی صورت میں کسی ایک رائے کے اظہار میں اس طرح کا اختلاف کہ کوئی ایک مسئلہ میں دو قول یا دو صورتیں پیش کر رہا ہے۔ اور کوئی ان میں سے ایک کی تردید کر رہا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تردید رائج ہو یا نہ ہو۔

۷۔ **النص:** اس سے مراد امام شافعی کی اپنی کوئی بیان کردہ نص۔ اس کا مقابل وجہ ضعیف، یا مخرج ہوتا ہے۔ بہر حال کبھی افتاء بغیر نص کے بھی ہو سکتا ہے۔

۸۔ **الجديد:** قدیم مذہب کا مقابل یہ اصطلاح ہے جس سے مراد وہ قول ہے جو امام محترم نے مصر میں تالیف یا افتاء میں فرمایا۔ امام محترم کے جدید اقوال کے راوی: ابوہیطی، المرزئی، الربیع المرادی، حرمہ، یونس بن عبدالأعلیٰ، عبداللہ بن الزبیر المکی اور محمد بن عبداللہ بن الحکم وغیرہ ہیں۔ پہلے تین وہ اصحاب ہیں جنہوں نے اصل بوجھ اٹھایا۔ باقی خوشہ چین ہیں۔

۹۔ **القديم:** یہ وہ اقوال ہیں جو امام محترم نے عراق میں اپنی کتاب الحجۃ کو تصنیف کرتے دوران لکھے یا وہیں کوئی فتویٰ دیا۔ قدیم اقوال کے رواۃ میں مشہور شاگرد: امام احمد بن حنبل، الزعفرانی، الکرابیسی، ابو ثور وغیرہ ہیں۔ امام شافعی نے ان تمام قدیم اقوال سے رجوع کر لیا تھا اس لئے ان کے مطابق فتویٰ دینا جائز نہ ہوگا۔ بعض شوافع نے سترہ مسائل میں قدیم قول کے مطابق فتویٰ دیا ہے۔ رہے وہ اقوال جو مصر اور عراق کے درمیان انہوں نے ارشاد فرمائے تو ان میں متاخر قول جدید شمار ہوگا اور متقدم قول قدیم شمار ہوگا۔ اور اگر کسی مسئلہ میں قدیم و جدید دونوں پائے جائیں تو جدید معمول بہ ہوگا سوائے سترہ مسائل کے جو امام شافعی نے قدیم قول کے مطابق دیے۔

۱۰۔ **قولا الجديد:** مراد دو جدید قول، مفتی ان اقوال میں آخری قول کے مطابق فتویٰ دے گا بشرطیکہ اسے علم ہو۔ اور اگر اسے علم نہیں مگر امام شافعی نے ان دونوں میں سے ایک پر عمل کیا ہے تو یہی عمل دوسرے کے ابطال کے لئے کافی ہوگا۔ یا ترجیح عملی قول کو دی جائے گی۔

۱۱۔ **الشيخان:** اس سے مراد امام رافعی اور امام نووی ہیں۔

۱۲۔ **اختلافی اصطلاحات:** فقہ شافعی میں اختلاف تین قسم کے ہیں۔ الأقوال: جو امام شافعی کی طرف منسوب ہیں۔ الأوجه: یہ وہ آراء ہیں جنہیں فقہاء شافعیہ نے امام شافعی کے اصول اور قواعد کی روشنی میں مستنبط کیا ہوتا ہے۔ الطرق: مذہب کے بیان میں راویوں کا اختلاف مراد ہے۔ اقوال کے بیان

کرنے، شوافع کی مختلف مخرج صورتوں کی وضاحت اور ان کے درمیان ترجیح قائم کرنے میں امام نووی رحمہ اللہ کے یہی طریقے ہیں۔

۱۳۔ مذہب شافعی کی ضعیف باتوں پر عمل کرنا جائز نہیں۔ اور کسی مسئلہ میں تلفیق بھی ممنوع ہے۔

تقابلی مطالعہ: آپ نے ہر مسلک کے طریقہ استنباط و اصول کا مطالعہ کیا۔ تجزیہ یہی بتاتا ہے: کہ امام احمد بن حنبلؒ جو امام شافعی رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں اور دنیائے اسلام میں ایک مسلمہ امام ہیں۔ انہوں نے اپنے شیخ محترم کے معین اصولوں کو تقریباً قبول کیا ہے اور عمل بھی کیا ہے۔ صرف امام شافعیؒ کے اصولوں میں دو باتوں میں اضافہ کیا یا ترمیم کی۔

۱۔ ہمارے قیاس سے اقوال صحابہ بہتر ہیں۔ ۲۔ خبر واحد قابل عمل ہے۔

ان اصولوں کی وجہ سے امام احمد بن حنبلؒ کا امام شافعیؒ کے مسلک سے اختلاف بہت کم مسائل میں نظر آتا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے مذہب سے امام شافعیؒ نے تقریباً بیس فی صد مسائل میں اختلاف کیا ہے۔ یہ اختلافات عبادات میں کم تر اور معاملات میں نمایاں ہیں۔ حنفی مذہب سے امام شافعیؒ رحمہ اللہ نے تقریباً ستر فی صد مسائل میں اختلاف کیا ہے۔ یہ اختلافات عبادات، معاملات غرضیکہ ہر فقہی شعبہ میں نمایاں نظر آتا ہے۔ اسی طرح امام محترم چاروں مصادر سے استنباط مسائل کرتے تھے اور انہیں قابل استدلال سمجھتے تھے۔ مگر آپ احناف کے استحسان کو اور مالکیوں کے مصالح مرسلہ کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ عبادات وغیرہ کے متعلق ذیل میں ایک نقشہ دیا جا رہا ہے۔ تاکہ طلبہ دونوں مذاہب کے مسائل کو علیحدہ علیحدہ جان لیں اور اس اختلاف کو بآسانی سمجھ سکیں:

حنفی مسائل

- ☆ وضوء بغیر نیت اور بغیر ترتیب کے جائز ہے۔
- ☆ کھجور کے شیرہ سے جب پانی نہ ہو تو وضوء جائز ہے۔
- ☆ وضوء و غسل میں کلی کرنا اور ناک میں پانی دینا فرض ہے۔
- ☆ اگر بحالت نماز قہقہہ لگ جائے تو وضوء بھی ٹوٹ جائے گا اور نماز بھی۔
- ☆ بحالت روزہ وضوء میں کلی کرتے وقت بے اختیار اور بھول کر پانی حلق میں اتر جائے تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔
- ☆ نفل روزہ کی قضاء بھی فرض کی طرح ہے۔
- ☆ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ جہری یا سری نماز میں نہیں پڑھنی چاہئے
- ☆ بیماری و سفر کی حالت میں جمع بین الصلوتین جائز نہیں ہے۔
- ☆ قربانی واجب ہے اور استطاعت والے پر ایک بکرا ہے۔
- ☆ کوئی زبردستی شوہر کو پکڑ کر طلاق لکھوا لے تو جائز ہے اور طلاق ہو جائے گی۔
- ☆ بغیر نیت اور بغیر ترتیب کے وضوء صحیح نہیں ہوتا۔
- ☆ بغیر پانی کے وضوء درست نہیں ہوتا۔
- ☆ یہ دونوں فعل فرض نہیں۔
- ☆ ایسی صورت میں وضوء نہیں ٹوٹے گا۔ نماز فاسد ہو جائے گی۔
- ☆ بھول کر یا بلا ارادہ کلی کرتے وقت اگر پیٹ میں پانی چلا جائے تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔
- ☆ نفل روزہ کی قضاء لازمی نہیں۔
- ☆ ہر نماز میں مقتدی کو سورہ فاتحہ پڑھنی چاہئے ورنہ نماز نہیں ہوتی۔
- ☆ بیماری یا سفر کی حالت میں جمع بین الصلوتین جائز ہے۔
- ☆ قربانی مسنون ہے اور ہر گھر کا سربراہ اپنی اور اپنے گھر والوں کی طرف سے ایک بکرا قربان کر سکتا ہے
- ☆ ایسی طلاق لغو اور باطل ہے۔

وفات: امام ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ کو آخری عمر میں بوا سیر کی سخت شکایت ہو گئی تھی۔ ایک مشہور واقعہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ فتیان بن ابی السحج جو مصلب مالکی تھے انہوں نے ایک مناظرے میں امام محترم سے واضح علمی شکست کھائی تھی۔ مگر انہوں نے بعد میں موقع پا کر رات کے اندھیرے میں امام محترم کے سر پر لوہے کا ایک گرز دے مارا جس سے امام محترم کا سر پھٹ گیا۔ طبیعت پہلے ہی کمزور تھی۔ اس تکلیف نے مزید نڈھال کر دیا۔ دوسری طرف مالکی فقیہ اشہب بن عبدالعزیز مسلسل سجدہ میں پڑ کر آپ کے لئے بد دعا کرتا رہا کہ الہی! شافعی کو اٹھالے ورنہ ہمارا مالکی مسلک فنا ہو جائے گا۔ امام محترم کو جب اس کا علم ہوا تو فی البدیہہ دو اشعار کہے:

تمنی رجال بأن أموت فإن أمت

لئن مت ما الداعي على بمخلد

وقد علموا لو ينفع العلم عندهم

لوگ تمنا کرتے ہیں کہ میں مر جاؤں۔ اگر میں مر بھی گیا تو یہ راہ ایسی ہے جس کا راہی صرف میں نہیں ہوں۔ اگر علم لوگوں کے لئے نفع بخش ثابت ہو تو وہ یہ مان لیں کہ میں اگر مر بھی گیا تو مجھے بد دعا دینے والا بھی باقی رہنے کا نہیں۔ آپ کی طبیعت جب بہت زیادہ بگڑی تو پاس بیٹھے شاگرد امام مزنی نے خیریت

دریافت کرتے ہوئے عرض کی: کیف أمسیت یا أستاذ الأستاذین؟ استاذہ کے استاذ! آپ کا دن کیسے گذرا؟ جواب میں فرماتے ہیں:

أصبحت من الدنيا راحلاً فلاخوان مفارقاً،
وبسوء أفعالی ملاقیاً، وعلى الله واردة،
ولكأس المنية شارباً، ولا والله لا أدرى أن
روحي يصير إلى الجنة فأهنتها أو إلى النار
فأعزيتها.

آج میں دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں، اور اپنے
بھائیوں کو چھوڑنے والا بھی۔ ہائے! اپنے برے
اعمال کی سزا بھی پانے والا ہوں اور اللہ بزرگ و برتر
کی بارگاہ میں پیش ہونے والا ہوں اور موت کا پیالہ
ابھی پینے والا ہوں۔ واللہ! میں نہیں جانتا آیا میری
روح جنت میں جائے گی کہ میں اسے مبارک باد دوں
یا اس کا مقام دوزخ ہے کہ میں اس سے تعزیت
کروں۔

نماز مغرب سے فراغت کے بعد لیٹے ہی تھے کہ نزع کی کیفیت شروع ہو گئی۔ بہت الحاح کے ساتھ بارگاہ الہی میں پھر عرض گزار ہوئے۔ عشاء کی نماز ہمت
کر کے پڑھی اور فراغت کے بعد پھر گڑگڑا کر دُعا مانگی۔ دُعا سے فارغ ہو کر لیٹے ہی تھے کہ روح مبارک بآسانی نکل گئی۔ اور اس طرح امام محترم خدمت
دین سے بھرپور اپنی یہ مختصر زندگی گزار کر دارفانی میں جا پہنچے۔ نماز جمعہ کے بعد آپ کی نماز جنازہ سب سے پہلے سیدہ نفیسہ بنت حسن نے ادا کی اور پھر ساری
خلقت نے۔ اور یوں بعد از عصر آپ کو قاہرہ کے جبل مقطم کے قبرستان قرافصۃ الصغریٰ میں دفن کیا گیا۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔ آمین

امام احمد بن حنبلؒ (۱۶۴-۲۴۱ھ)

ابو عبد اللہ الشیبانی، بغداد میں ربیع الاول ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے دور کے سب سے بڑے عالم حدیث اور فقیہ سنت تھے۔ سنت نبوی سے عمل و علمی لگاؤ
تھا اس لئے امام اہل السنۃ کا لقب امت سے پایا۔ زہد و استغناء جہاں مثالی تھا وہاں اللہ تعالیٰ نے جذبہ جہاد سے بھی سرشار کر رکھا تھا۔ آپ کے والد محترم فوج
کے ایک سپاہی تھے جو جوانی میں ہی انتقال کر گئے۔ اس وقت ان کی عمر دو برس کی تھی۔ والدہ محترمہ نے پوری نگہداشت کی اور ابتدائی تعلیم بغداد میں ہی
دلائی۔

سماعت حدیث: سنت رسول ﷺ سے محبت اور اس پر عمل کا شوق شروع سے ہی تھا۔ چھوٹی عمر میں ہی یعنی سولہ برس کی عمر میں آپ نے حدیث رسول ﷺ
کی سماعت شروع کی۔ امام ابو یوسفؒ کے حلقہ درس میں بیٹھے۔ ۱۸۰ھ میں سب سے پہلا حج کیا۔ پھر آمدورفت رہی اور علماء حجاز سے علم سیکھتے رہے۔ ۱۹۶ھ
میں یمن جا کر امام حدیث عبد الرزاق الصنعائی سے احادیث سنیں۔ یہاں امام یحییٰ بن معینؒ اور اسحاق بن راہویہؒ ان کے شریک درس رہے۔ علم کے لئے آپ
کوفہ بھی تشریف لے گئے اس مسافرت میں تنگدستی بھی دیکھی۔ جس جگہ قیام پذیر رہے سر کے نیچے سونے کے لئے اینٹ رکھا کرتے۔ کہا کرتے کاش
میرے پاس دس درہم ہوتے میں حدیث رسول ﷺ سننے کے لئے جریر بن عبد الحمید کے پاس رے چلا جاتا۔ امام شافعیؒ خود فرماتے ہیں انہوں نے مجھ سے
مصر آنے کا وعدہ کیا مگر معلوم نہیں کس وجہ سے نہیں آ سکے شاید وجہ بے زری ہوگی۔ بایں ہمہ امام محترم تقریباً سارے اسلامی ممالک میں گھومے اور اپنے وقت
کے بیشتر مشائخ سے احادیث حاصل کیں۔ زمانہ طالب علمی میں ہارون الرشید کی طرف سے یمن کا قاضی بننے کی پیش کش ہوئی جسے انہوں نے قبول نہ کیا۔
۱۹۹ھ میں امام شافعیؒ جب دوسری بار بغداد تشریف لائے تو امام احمدؒ سے انہوں نے کہا: اگر تمہارے پاس، کوئی صحیح حدیث حجاز، شام، یاعراق کہیں کی ہو مجھے
اس سے مطلع کرو۔ میں حجازی فقہاء کی طرح نہیں ہوں جو اپنے شہر کے علاوہ دیگر بلاد اسلامیہ میں پھیلی ہوئی احادیث کو غیر مصدقہ سمجھتے ہیں۔ اس وقت امام

احمدؒ کی عمر تیس برس کی تھی۔

اساتذہ: آپ کے اساتذہ کی ایک خاصی تعداد ہے جن سے فقہ وحدیث کا علم حاصل کرتے رہے۔ ان میں قاضی ابویوسفؒ، امام شافعیؒ، سفیان بن عیینہؒ، یحییٰ بن سعید القطانؒ، عبدالرحمن بن مہدیؒ، اسمعیل بن علیہ، ابوداؤد طیالسیؒ اور وکیع بن الجراح جیسی نابغہ روزگار شخصیات ہیں جو اپنے مقام اور مرتبے کے اعتبار سے نہ صرف روایت ودرایت حدیث رسول ﷺ میں سب سے آگے ہیں بلکہ فقاہت کے اعتبار سے بھی وہ اجتہاد کے مقام کو پہنچتے ہیں۔ امام محترم کا سنت رسول ﷺ کی طرف میلان اور اس کا حفظ وجمع انہیں اپنے وقت کا امام حدیث اور مجتہد وقت بنا گیا۔ امام ابراہیم الحاربی کہتے ہیں: میں نے امام احمدؒ کو دیکھا یوں لگتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں علم اولین و آخرین جمع کر دیا ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں: میں جب بغداد سے نکلا تو اپنے پیچھے سب سے زیادہ متقی اور فقیہ انسان احمد بن حنبلؒ ہی کو چھوڑا۔

تلامذہ: بہت سے علماء نے آپ سے علم حاصل کیا۔ خصوصیت کے ساتھ آپ سے فقہ اور اجتہادات کو اخذ کرنے والے ایک سو بیس سے زیادہ فقہاء شاگرد ہیں۔ جنہوں نے اپنے شیخ کی فقہ اور اجتہادات کو سارے عالم میں پھیلا دیا۔ ان میں ان کے اپنے بڑے صاحب زادے صالح بن احمد ہیں جنہوں نے اپنے والد محترم سے علم فقہ وحدیث کو حاصل کیا اور دیگر اساتذہ سے بھی وہ مستفید ہوئے۔ ۲۶۶ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ ابوبکر احمدؒ بن محمد الخراسانی جو الاثرم کے نام سے معروف تھے، انہوں نے بھی امام احمدؒ سے بہت سے فقہی مسائل روایت کئے ہیں اور بہت سی احادیث بھی۔ اپنے وقت کے فقہاء وحفاظ حدیث میں شمار ہوتے ہیں۔ سن ۲۷۳ھ میں آپ فوت ہوئے۔ ایک اور شاگرد عبدالملک بن عبد الحمید بن مہران المیمونی جو امام محترم کی صحبت میں بیس سال سے زائد عرصہ تک رہے۔ امام محترم کے شاگردوں میں یہ بہت جلیل القدر شمار ہوتے ہیں۔ ان کا انتقال سن ۲۷۴ھ میں ہوا۔ اسی طرح امام بخاریؒ، امام مسلمؒ اور امام ابوداؤدؒ بھی آپ کے تلمذ پر مفتخر تھے۔

تقویٰ: امام بیہقیؒ لکھتے ہیں: امام احمدؒ اپنے چچا اور اپنے بیٹے کے پیچھے نماز نہیں پڑھا کرتے تھے اور نہ ہی ان میں سے کسی کے گھر کھانا کھاتے۔ وجہ یہ تھی کہ ان دونوں نے بادشاہی مناصب قبول کر رکھے تھے۔ بڑے تاجر آ کر آپ کی خدمت میں دینار پیش کرتے مگر بالکل قبول نہ کرتے۔ یمن میں طالب علمی کے دوران ان کی مالی حالت بہت کمزور تھی آپ کے شیخ امام عبدالرزاقؒ نے اس خبر پر جب خاموشی سے ان کی مٹھی میں کچھ دینا چاہا تو لینے سے انکار کر دیا اور کہا: اللہ تعالیٰ میری ضروریات پوری کر دیتا ہے۔ ان کی صحبت لوگوں کو آخرت یاد دلا دیتی۔ دنیاوی باتوں میں بالکل نہیں الجھتے تھے۔ متوکل کون ہوتا ہے؟ اس کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: جو غیر اللہ سے ہر قسم کی توقعات ختم کر دے۔ دلیل پوچھی گئی تو فرمایا: سیدنا ابراہیم علیہ السلام جب منجیق پر چڑھائے گئے تو جبریل امین نے آ کر مدد کے لئے کہا تو فرمایا: ہاں مدد تو چاہئے مگر تم سے نہیں۔ جبریل علیہ السلام نے عرض کی تو آپ اسی سے کہئے جس سے آپ کہنا چاہتے ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: میرے لئے وہی امر پسندیدہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسندیدہ ہے۔ فرمایا کرتے: فقر ایک ایسا عظیم مرتبہ ہے جسے اکابر کے سوا اور کوئی نہیں پاسکتا۔ اپنی دعاؤں اور سجدوں میں اکثر گڑگڑاتے اور فرماتے: اے اللہ! اگر گنہگار ان امت محمدیہ کا تو کوئی فدیہ چاہتا ہے تو مجھی کو ان کا فدیہ بنا لے۔

فہ خلق قرآن: خلیفہ مامون نے معتزلی علماء کے کہنے پر علمائے امت کو ایک خط لکھا جس میں یہ تلقین تھی کہ قرآن مخلوق ہے اور محدث ہے۔ اس نے خود اپنے اس عقیدے کے ثبوت کے لئے شواہد بھی پیش کئے۔ معتزلہ کی انگلیخت پر مامون نے بہ جبر اس مسلک کی طرف دعوت دی۔ انکار کی صورت میں سختیاں شروع کر دیں، معاش بند کر دیا اور سخت سزاؤں کی دھمکی بھی دی۔ بہت سے جبراقائل ہو گئے کہ قرآن مخلوق ہے۔ مگر امام احمدؒ اور محمد بن نوح نیشاپوری کی ذات ایسی تھی جو آزمائش کے اس مرحلے پر ثابت قدم رہی۔ آزمائشوں سے نکل کر ہی انسان کندن بنتا ہے اور بڑا رتبہ پاتا ہے۔ مگر درجہ بدرجہ۔ دین کے معاملہ میں ہر انسان اسی حد تک مبتلا کیا جاتا ہے جس قدر دین پر مضبوطی سے قائم رہے۔ اور آزمائش انسان کے لئے تاحیات قائم رہتی ہے حالانکہ وہ گناہ گار نہیں ہوتا۔ آپ ﷺ کا یہ ارشاد انہیں از بر تھا: یہ دنیا ہمیشہ مصائب اور فتنے دکھایا کرتی ہے۔ بعد کے ادوار میں مصائب کی شدت تیز تر ہوگی۔ خلیفہ مامون نے سب علماء

کو بلا بھیجا۔ کمزور لوگ حکومت کی سطوت اور قہر کے آگے گردن خم کر بیٹھے۔ امام احمدؒ اور محمد بن نوحؒ نے سختی سے انکار کر دیا۔ چنانچہ دونوں حضرات کو اونٹ پر سوار کر کے مامون کے ہاں لے جایا گیا۔ راستہ میں ایک بدو نے نصیحت کی۔ آپ مسلمانوں کی نمائندگی کرنے جا رہے ہیں۔ سب کی نظر آپ پر ہے۔ اللہ آپ مسلمانوں کو رسوا نہ کیجئے گا۔ اللہ آپ کا دوست ہے صبر کیجئے گا۔ جنت آپ اور آپ کے شہید ہونے کی دیر تک ہے۔ موت تو بہر حال آنی ہے اس فتنہ میں آپ اگر کامیاب ہو گئے تو دنیا اور آخرت دونوں سنور جائیں گی۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ یہ نصیحتیں میرے دل کو لگ گئیں اور میں نے مامون کے خیالات کی نفی کا پورا عزم کر لیا۔ مامون کے ہاں جب یہ دونوں حضرات پہنچے تو قریب ہی ایک جگہ میں انہیں ٹھہرا دیا گیا۔ خادم نے اطلاع دی کہ مامون نے رسول اللہ سے قربت کا واسطہ دے کر قسم کھالی ہے کہ اگر احمدؒ نے خلق قرآن کا اقرار نہ کیا تو اسی تلوار سے اس کی گردن اڑا دوں گا۔

امام احمدؒ نے یہ سنتے ہی گھٹنے زمین پر ٹیک دیے اور آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور عرض کی: خدایا! اس فاجر کو تیرے حلم نے بہت مغرور کر دیا ہے کہ وہ اب تیرے دوستوں پر بھی تلوار اٹھاتا ہے۔ خدایا! اگر تیرا کلام غیر مخلوق ہے تو تو مجھے اس پر ثابت قدم رکھ میں اس کے لئے ہر مصیبت سہنے کو تیار ہوں۔ اسی رات صبح ہونے سے پہلے مامون کا انتقال ہو گیا۔ مگر معتمد خلیفہ بن گیا۔ اس نے محمد بن ابی دؤاد کو اپنا وزیر، اور قوت بازو بنایا۔ اس طرح معتمد، مامون سے بھی زیادہ اس نظریے کے لئے سخت گیر ثابت ہوا۔ اس نے امام محترم کو دیگر قیدیوں کے ساتھ بیڑیاں باندھ کر ایک کشتی میں بغداد بھیج دیا۔ محمد بن بن نوحؒ راستہ میں ہی انتقال کر گئے۔

امام محترم جب بغداد پہنچے تو پاؤں میں بوجھل بیڑیاں تھیں جن کی وجہ سے چلنا دشوار تھا۔ سخت علیل ہو گئے۔ قید خانہ میں ڈال دیئے گئے اور تیس ماہ قید میں رہے۔ پھر معتمد کے پاس انہی بیڑیوں میں لائے گئے۔ سُرمَن رَای میں ایک کمرہ میں بند کر دیا گیا۔ جس میں اندھیرا ایسا تھا کہ کوئی چیز نظر نہ آتی۔ رب کے حضور نماز شکر ادا کی۔ معتمد کے پاس اسی حالت میں مجھے لے جایا گیا۔ میں نے سلام کے بعد گفتگو کی اور کہا کہ آپ کے نانا محترم کا کیا پیغام تھا؟ معتمد نے کہا: لا إله إلا الله کی طرف۔ تھوڑی گفتگو کے بعد معتمد نے عبدالرحمنؒ معزلی کو کہا کہ ان سے پوچھو۔

عبدالرحمنؒ نے مجھ سے کہا: قرآن کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ میں چپ رہا۔ لیکن معتمد نے اصرار کیا تو میں نے کہا: باری تعالیٰ کے علم کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ اس نے جواب نہ دیا۔ میں نے کہا: قرآن اللہ کا علم ہے اور جس نے اللہ کے علم کو مخلوق کہا اس نے کفر کیا۔ کفر کے لفظ سے یہ جماعت بڑی سیخ پا ہوئی اور معتمد سے کہا: دیکھئے اس نے آپ کو اور ہم سب کو کافر کہہ دیا۔ مگر معتمد نے توجہ نہ دی۔ پھر عبدالرحمنؒ نے سوال کیا: یہ بتاؤ ایک زمانہ تھا جب اللہ تھا اور قرآن نہ تھا۔ میں نے جواباً کہا: کیا ایسا تھا کہ خدا تھا اور اس کا علم نہ تھا؟ عبدالرحمنؒ چپ ہو گیا۔ بہر حال وہ جو دلائل دیتے میرے سوال یا جواب میں وہ خاموش ہوتے رہے اور بدتمیزی و بدکلامی بھی کرتے رہے۔ اور خلیفہ کو بہکاتے بھی۔ میں کہتا: دین کی بنیاد کتاب و سنت کے علاوہ کسی تیسری چیز پر نہیں ہے۔ مگر ابن ابی دؤاد کہتا: بحث کا دار و مدار نقل کے علاوہ عقل پر بھی ہونا چاہئے۔ اسی طرح دوسرے اور تیسرے دن گفتگو ہوتی رہی۔ آخری دن امام محترم کی آواز ان سب کی آوازوں سے بھاری اور اونچی رہی جو معزلی فقہاء اور قضاة کی تھی۔ وہ لا جواب رہے۔ اور خلیفہ مجھے یہی کہتا رہا کہ تم میرے مسلک کی تائید کرو میں تمہیں مقرب خاص بنالوں گا۔ میں نے یہی کہا: کہ اگر کوئی دلیل قرآن و حدیث سے بیش کر دیجئے تو میں ماننے کو تیار ہوں۔ بعد ازاں خلیفہ نے میرے ہاتھ پاؤں بندھوا دیئے اور مجھے کوڑے برسوائے۔ میں بار بار بے ہوش ہوا۔ جب پہلا کوڑا برسایں نے بسم اللہ کہا۔ جب دوسرا پڑا تو لا حول ولا قوۃ إلا باللہ کہا اور جب تیسرا پڑا تو کہا: قل لن یصیبنا إلا ما کتب اللہ لنا۔ بے ہوش ہوتا تو چھوڑ دیا جاتا۔ ہوش میں آتا تو دوبارہ مارنا شروع کر دیتے۔ میں جلد بے ہوش ہونے لگا تو معتمد ڈر گیا کہ کہیں اب یہ فوت ہی نہ ہو جائیں۔ اس نے ضرب بند کرادی۔ جب ہوش آیا تو معتمد کے ایک کمرہ میں ہی خود کو بغیر سلاسل کے آزاد پایا۔ یہ واقعہ ۲۵ رمضان ۲۲۱ھ کا ہے۔

مجھے گھر پہنچانے کا خلیفہ نے حکم دیا۔ راستہ میں اسحق بن ابراہیم کے ہاں ٹھہرے۔ کہتے ہیں کہ میں صائم تھا۔ کپڑے خون آلود تھے اسی حالت میں نماز ادا کی۔ ابن سماعہ نے کہا کہ آپ نے خون کے کپڑوں میں نماز ادا کی؟ میں نے کہا: ہاں! سیدنا عمرؓ نے خون بہنے کی حالت میں نماز ادا تھی اور ان کے زخم کا خون فوارہ

کی صورت میں نکل رہا تھا۔ کوڑوں کے ضرب کی وجہ سے ہاتھ اور ہونٹوں پر سردی کا اثر تاوفات رہا۔

خراج عقیدت: امام ابن المدینیؒ نے آزمائش کی اس گھڑی پر امامؒ کی ثابت قدمی پر کہا: اللہ تعالیٰ نے اسلام کو دو بندوں کی وجہ سے بڑی عزت عطا فرمائی۔ ابو بکرؓ صدیق کی وجہ سے جو یوم الردۃ (جنگ یمامہ) کے دن ثابت قدم رہے۔ اور امام احمدؒ کی وجہ سے جنہوں نے حنہ کے موقع پر اسلام کو سرفراز فرمایا۔ امام بشر الحافیؒ نے فرمایا: امام احمدؒ نے اس امت میں نبوت کے فرائض سرانجام دیے ہیں۔ ابوالولید الطیالسیؒ نے کہا: اگر احمدؒ بنو اسرائیل میں پیدا ہوتے تو کچھ بعید نہ تھا کہ وہ نبی ہوتے۔

عقیدہ: امام محترمؒ ٹھوس اسلامی عقائد کے قائل تھے۔ قرآن مجید پر کسی چیز کو مقدم نہ کرتے۔ اسے غیر مخلوق بلکہ لوح محفوظ میں جو کچھ ہے وہ بھی غیر مخلوق قرار دیتے۔ اس کے بعد حدیث رسول ﷺ کا مرتبہ ہے۔ اور آپ ﷺ کی حدیث کے ساتھ صحابہؓ و تابعینؓ کے آثار بھی قابل قبول ہیں۔ آپ ﷺ جو کچھ لائے ہیں اس کی تصدیق اور آپ ﷺ کی سنت کی اتباع میں ہی نجات ہے۔ قضاء و قدر، خیر و شر سب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں۔ اگر کسی نے فرض کو سستی ولا پروائی سے ترک کر دیا تو اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے بخش دے یا اسے عذاب دے۔ ایمان، قول و عمل اور دلی تصدیق کا نام ہے۔ میزان حق ہے۔ صراط حق ہے۔ جنت و دوزخ برحق ہیں۔ عیسیٰ بن مریمؑ کا نزول برحق ہے۔ حوض حق اور شفاعت بھی حق ہے۔ عرش و کرسی برحق ہیں۔ ملک الموت پر میرا ایمان ہے۔ دجال یقیناً آئے گا۔ عیسیٰ بن مریمؑ دنیا میں آئیں گے اور باب لد پر دجال قتل کریں گے۔

آپ ﷺ کے بعد سیدنا ابوبکرؓ جیسا کوئی نہیں۔ ان کے بعد سیدنا عمرؓ جیسا اور ان کے بعد عثمانؓ جیسا کوئی نہیں۔ بغیر ولی نکاح صحیح نہیں۔ متعہ قیامت تک کے لئے حرام ہے۔ وغیرہ

وفات: ۲۴۱ھ ربیع الاول میں مرض الموت میں مبتلا ہوئے۔ وفات سے قبل امام محترمؒ نے وصیت لکھی اور کی بھی۔ جس کے الفاظ یہ تھے:

بسم الله الرحمن الرحيم هذا ما أوصى أحمد بن حنبل أوصى أنه يشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له وأن محمدا عبده ورسوله، أرسله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله ولو كره المشركون، وأوصى لأهلي وقرباتي أن يعبدوا الله وأن يحمدوه وأن ينصحوهم لجماعة المسلمين وأوصى أني قد رضيت بالله ربا وبالأسلام دينا وبمحمد رسولا. وفات سے قبل اپنا وضو کرایا، اور ہر حصے کو اچھی طرح دھلوا یا۔ پیر کی انگلیوں کا خلال تک کیا۔ درمیان میں اللہ کا ذکر کرتے رہے جب وضو مکمل ہوا تب فوت ہو گئے۔ جمعہ کا دن تھا۔ عمر تقریباً (۷۷) ستر سال تھی۔ تجہیز و تکفین سب کچھ اولاد نے خرید کر کی۔ جنازہ میں سات لاکھ لوگ شریک ہوئے جن میں اکثریت اہل علم کی تھی۔ علماء اس وقت کہا کرتے تھے: بیننا وبين القوم الجنائز ہمارے اور دوسروں کے درمیان جنازے ہی تو فرق کیا کرتے ہیں۔

فقہ حنبلی کے اصول: امام محترمؒ نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کے لئے کچھ ایسے اصول اختیار کئے جو بعد میں فقہ حنبلی کی اساس قرار پائے۔ یہ پانچ اصول تھے جو آپ کے فتاویٰ میں واضح طور پر نظر آتے اور انہی پر ہی آپ کا دار و مدار تھا۔ ہاں اگر آپ کے پاس دلائل متعارض ہوتے تو فتویٰ نہ دیتے یا اس مسئلے میں صحابہ کرامؓ کا اختلاف ہوتا یا کوئی اثر آپ کے علم میں نہ ہوتا یا کسی صحابی یا تابعی کا قول نہ ملتا تو توقف فرماتے۔

اسی طرح امام محترمؒ ایسے مسئلے میں فتویٰ دینا سخت ناپسند فرماتے جس میں سلف سے کوئی اثر نہ ملتا۔ آپ فرمایا کرتے: اس مسئلے پر رائے دینے سے بچو جس میں تمہارے پاس کوئی راہنما نہ ہو۔ مسائل کے جواب میں فقہاء محدثین کے فتاویٰ کو اور امام مالکؒ اور اصحاب مالکؒ کے فتاویٰ وغیرہ کو بطور دلیل کے پیش کر دیا کرتے ایسے فتویٰ سے روکا کرتے جس میں حدیث سے اعراض نظر آتا ہو یا حدیث کے مطابق وہ فتویٰ نہ دیتا ہو اور نہ ہی ایسے فتویٰ کو قابل عمل سمجھتے تھے۔ وہ پانچ اصول درج ذیل ہیں:

۱۔ نصوص: نص جب انہیں مل جاتی تو اسی کے مطابق فتویٰ دے دیا کرتے۔ جس نے اس کے خلاف کہا ہوتا اس کی پروا نہیں کرتے تھے۔ خواہ کوئی بھی ہوتا۔ حدیث صحیح پر کسی کے قول، عمل، رائے، قیاس کو مقدم نہیں کیا کرتے تھے۔ اور نہ ہی اجماع کو وہ حدیث صحیح پر مقدم کرتے تھے۔ امام احمدؒ نے ایسے اجماع

کو تسلیم ہی نہیں کیا جو صحیح حدیث کی موجودگی میں اس کے برعکس کیا گیا ہو۔ کسی مسئلے پر اجماع کے دعوے کو بھی تسلیم نہیں کیا کرتے تھے۔ اس لئے کہ جو یہ دعویٰ کر رہا ہے اسے کیا علم کہ علماء نے اس سے اختلاف کیا ہو۔ اور یا اس اختلاف کا علم اسے نہ ہوا ہو۔

۲۔ فتاویٰ صحابہ: کسی صحابی کا فتویٰ مل جانے کے بعد اس کی مخالفت کسی اور صحابی سے نہ ملتی ہو تو فتویٰ اس کے مطابق دے دیا جائے۔ ایسے فتویٰ کو اجماع نہ کہتے بلکہ یہ فرمایا کرتے: اس کے بارے میں ایسی بات کا علم نہیں جو اس صحابی کی بات کو رد کرتی ہو۔ اس نوع کا کوئی فتویٰ آپ کو اگر مل جاتا تو کسی کے عمل، رائے یا قیاس پر اسے مقدم نہیں کرتے تھے۔

۳۔ اقوال صحابہ کا چناؤ: جب اقوال صحابہ میں انہیں اختلاف نظر آتا تو اس صورت میں وہ ان کا قول لے لیتے جو کتاب و سنت رسول ﷺ کے قریب ترین ہوتا۔ اس صورت میں وہ پھر ان کے مختار اقوال سے نکلتے نہیں تھے۔ اور اگر کسی کے قول کی موافقت نہ ملتی تو اس مسئلے میں اختلاف کا ذکر فرماتے مگر کوئی حتمی رائے نہ دیتے۔

۴۔ حدیث مرسل: امام محترم حدیث مرسل اور حدیث ضعیف سے بھی استدلال لیتے بشرطیکہ اس موضوع میں صحیح حدیث نہ ہوتی۔ ایسی حدیث کو تو وہ قیاس پر بھی ترجیح دے دیا کرتے۔ ضعیف حدیث سے مراد ان کے ہاں کوئی باطل حدیث، یا منکر حدیث، یا اس راوی کی حدیث نہیں جو متہم ہو کہ ایسی حدیث پر عمل ناگزیر ہو بلکہ ان کے نزدیک ضعیف حدیث، صحیح کی ایک قسم ہی ہے جو حسن کے درجے کی ہے۔ کیونکہ ان کے زمانہ میں حدیث کی دو ہی اقسام ہوا کرتی تھیں صحیح اور ضعیف۔ ضعیف حدیث کے کچھ مراتب تھے۔ جن کی یہ ادنیٰ قسم ضعیف ہوا کرتی تھی۔ جسے بعد میں حسن کا نام دیا گیا۔ جب کسی مسئلہ میں کوئی ایسا اثر نہ پاتے یا کسی صحابی کا کوئی قول نہ ملتا یا کوئی اجماع اس کے خلاف نہ ملتا جو اس ضعیف حدیث کو رد کر سکے تو قیاس کو ترجیح دینے کی بجائے اس پر عمل فرماتے۔ تمام ائمہ کی طرح ان کا بھی یہی اصول تھا کہ ضعیف حدیث کو قیاس پر مقدم رکھا جائے۔ (اعلام الموقعین: ۳۲۱)

۵۔ ضرورۃ قیاس: جب کسی مسئلہ میں ان کے پاس کوئی نص نہ ہوتی، نہ قول صحابہ یا صحابی، نہ اثر مرسل یا ضعیف، پھر آپ پانچویں اصول کی طرف توجہ فرماتے جسے قیاس کہتے ہیں۔ اسے بھی امام محترم نے بوقت ضرورت استعمال کیا ہے۔ الخلال کی کتاب میں امام احمد فرماتے ہیں: میں نے امام شافعیؒ سے قیاس سے متعلق پوچھا: تو آپ نے فرمایا: ضرورت کے وقت اس کی طرف بھی رخ کیا جاسکتا ہے۔ (اعلام الموقعین: ۳۲۱)

قابل اعتماد حنبلی کتب: یوں تو امام محترم نے بہت سے کتب چھوڑیں مگر حنا بلہ حضرات کے لئے کچھ کتب ایسی ہیں جو اساسی کتب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ چند ایک کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ المسند: امام محترم نے امت کے لئے یہ کتاب چھوڑی جس میں کم و بیش چالیس ہزار سے زائد احادیث ہیں۔ سولہ سال کی عمر میں اس کا مواد جمع کرنا شروع کیا اور عمر کے آخر تک اس کتاب میں لگے رہے۔ کہا کرتے: میں نے اس کتاب کو ایک امام و دلیل کے طور پر لکھا ہے جب لوگ سنت رسول ﷺ میں اختلاف کرنے لگیں تو اس کی طرف رجوع کیا کریں۔ ثقہ راویوں اور قابل اعتماد محدثین سے احادیث رسول ﷺ کو اپنی تمام زندگی جمع کرتے رہے۔ یہ تمام احادیث متفرق اوراق میں تھیں آخری عمر میں ان کے بیٹوں اور چند خاص شاگردوں نے اسے جمع کیا اور پھر امام محترم نے انہیں جو کچھ بھی لکھا تھا اسے املاء کرا دیا۔ گو یہ سب اوراق مرتب نہیں تھے۔

۲۔ مسائل الإمام أحمد لابن عبد الله

۳۔ مسائل الإمام أحمد برواية أبي داود

۴۔ مسائل الإمام أحمد برواية ابنه أبي الفضل صالح

۵۔ الجامع الكبير از ابو بكر الخلال

۶۔ مختصر الخرقی

چند حنبلی اصطلاحات: امام احمدؒ کے شاگردوں نے امام محترم کی آراء کو نقل کرتے وقت بہت سی مصطلحات کا استعمال کیا ہے۔ اسی طرح دیگر حنبلی مجتہدین کی آراء کو بھی کتب میں ذکر کیا گیا ہے۔ جن کی مراد اور مفہوم اپنا اپنا ہے۔ ان میں سے: النص، الإيماء، التنبيه، الإشاره، الروايه، القول، التخریج، النقل، الوجه، الاحتمال، المذهب، ظاهر المذهب، التوقف، الروایتان، القولان اور الوجهان جیسی اصطلاحات ہیں۔ ذیل میں ان کی مختصر تفصیل دی جاتی ہے۔

۱۔ النص: کسی حکم کے بارے میں ایسا صریح قول کہ کسی دوسرے کا احتمال بھی نہ ہو۔

۲۔ التنبيه: یہ وہ قول ہوتا ہے جسے امام محترم نے بصراحت عبارت میں واضح نہ کیا ہو کہ اس سے مراد کیا ہے۔ بلکہ عبارت سے مسلسل یہی مراد سمجھ آ رہی ہو۔ جیسے کسی حکم کے بارے میں آپ سے پوچھا گیا تو اس کے جواب میں ایک حدیث بیان کر دی جو اس حکم کا مفہوم بتا دیتی اور پھر امام محترم اس حدیث کو حسن قرار دیں یا اسے مزید تقویت دیں مگر اس حکم کے بارے میں صراحت سے کچھ نہ کہیں۔ یہ سب کچھ ایماء، اشارہ اور توقف کو شامل ہوگا۔

۳۔ الروایۃ: اس سے مراد امام محترم سے منقول نص ہے۔ امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: مطلق روایات امام احمدؒ کی نصوص ہیں۔ روایت میں امام احمدؒ کا قول بھی شامل ہے۔

۴۔ القول: ایسا حکم جو امام محترم کی طرف منسوب ہو اس میں وجہ، احتمال، تخریج اور کبھی روایت کا مفہوم بھی شامل ہو جاتا ہے۔

قول اور روایت میں فرق: روایت دراصل امام احمد سے مروی منصوص حکم ہے۔ رہا قول تو یہ امام صاحب کی طرف منسوب حکم کی کوئی وجہ ہے، یا احتمال ہوتا ہے یا تخریج ہوتی ہے۔

۵۔ تخریج: حکم کو ایک مسئلہ سے منتقل کر کے اس مسئلہ کی طرف لے جانا جو اس سے ملتا جلتا ہو اور ان دونوں کے درمیان اس حکم میں برابری کر دینا۔ یہ تخریج اس صورت میں ممکن ہوتی ہے جب مسئلہ کے معنی کا فہم ہو جائے۔

تخریج اور قول میں فرق: امام محترمؒ کی طرف قول اس شرط پر منسوب ہوگا جب کہ وہ ان کا ہو۔ رہی تخریج تو وہ امام صاحب کے اصول سے حکم کے استخراج کا نام ہے۔ اگر مخرج حکم امام محترم کی نصوص سے ہے تو وہ ان کی نصوص سے مخرج قول ہوگا۔ یہ ایک رائے ہے کہ جو مسئلہ ان کے کلام پر قیاس کیا جائے گا وہ ان کا قول ہوگا۔

۶۔ النقل: امام محترمؒ کی نصوص کی روایت اور ان پر تخریج کو کہا جاتا ہے۔

۷۔ الوجه: امام محترمؒ کے اصولوں، یا ان کے ایماء، دلیل، تعلیل، یا امام احمدؒ کے کلام کے سیاق یا قوت کلام کا اتباع کرتے ہوئے کسی مسئلے کا قیاس کے ذریعے دوسرے ایسے حکم سے مسئلہ مستنبط کرنا جو اس سے ملتا جلتا ہو۔ وجہ کہلاتا ہے۔

۸۔ الاحتمال: وجہ کا ہم معنی ہے۔ فرق یہ ہے کہ وجہ میں فتویٰ دینا پڑتا ہے احتمال میں جزم نہیں ہوتا۔

۹۔ المذهب: اس سے مراد حنبلی مذہب میں معمول بہ شے ہے خواہ وہ امام کی طرف سے ہو یا حنبلی فقہاء کی طرف سے۔ خواہ وہ نص سے ثابت ہو یا ایماء و تخریج سے۔

۱۰۔ ظاہر المذهب: ایسا لفظ جس میں دو معنوں کا احتمال ہو مگر ان میں سے ایک دوسرے سے اظہر ہو، وہ ظاہر کہلاتا ہے۔ لہذا ان میں قوی معنی کو لینا ہی جائز ہوگا۔ اس سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مشہور مذہب یہی ہے۔ یہ لفظ اس وقت استعمال ہوگا جب کسی مسئلہ میں وہاں اختلاف ہو۔

۱۱۔ التوقف: کسی مسئلہ میں اگر کوئی قول نہ ہو تو دلائل کے تعارض کی صورت میں دیگر اقوال میں سے پہلے، دوسرے قول کو ترک کرنا اور نفی یا اثبات کو ترک کرنا اور کچھ نہ کہنا توقف کہلاتا ہے۔

۱۲۔ الروایتان: روایت کا تشبیہ ہے۔ جب یہ کہا جائے کہ اس مسئلہ میں دو روایتیں ہیں تو اس سے مراد ایک روایت نص کے ساتھ ہے اور دوسری ایماء کے

ساتھ۔ یا ایک اور نص سے تخریج کی گئی ہے۔ یا وہ ایسی نص سے ہوگی جو ناپسندیدہ ہو۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس مسئلہ میں ایک روایت ہے تو اس سے مراد امام کی اس حکم میں ایک ہی نص ہوگی۔

۱۳۔ القولان: دونوں قول یا تو امام کی نص سے ہوں گے یا ان میں سے ایک نص سے ہوگا اور دوسرا ایماء سے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان میں اس کے برعکس وجہ ہو یا تخریج یا احتمال ہو۔

۱۴۔ الوجہان: وجہ تخریج کے بغیر نہیں ہوتی۔ جب یہ کہا جائے کہ اس مسئلہ میں دو صورتیں ہیں تو اس سے مراد یہ ہوگا کہ امام محترمؑ کی اس مسئلے میں کوئی نص نہیں بلکہ ان کے اصحاب نے اس مسئلہ میں تخریج کر کے حکم لگایا ہے۔ ایسی صورت میں ان اصحاب کے مابین اجتہادی اختلاف ہوا تو نتیجہ ہر اجتہاد کی الگ الگ صورت ظاہر ہوئی۔

ائمہ اربعہ کے فقہی مناہج پر تبصرہ

ان ائمہ کرام کے ادوار میں موجود مسلمان کسی خاص مذہب کے پابند نہیں تھے اور نہ ہی ان کے علم میں تھا کہ دین میں ایسی کوئی شق ہے کہ جس میں علماء و ائمہ کرام کے استنباط و اجتہاد کو حتمی حیثیت دے دی جائے۔ اولاً تو یہ سوچنا ہی محال ہے کہ ائمہ کرام کی یہ سب جدوجہد اپنے اپنے مذاہب کی ترویج کے لئے تھی نیز نقطہ نظر کے اختلاف کو جس طرح انہوں نے اپنے لئے پسند فرمایا دوسرے کے لئے بھی ضرور پسند فرمایا ہوگا۔ ان ائمہ اربعہ کے بارے میں شاہ ولی اللہ دہلوی اپنا تبصرہ یوں پیش فرماتے ہیں:

محدثین میں سب سے بڑی شان والے، اور زیادہ روایت والے اور حدیث کے مراتب زیادہ پہچاننے والے اور معانی نصوص خوب سمجھنے والے امام احمد بن حنبل اور امام اسحاق بن راہویہ تھے۔ ان کے ہاں فقہ کی ترتیب بھی اس پر موقوف تھی کہ بہت سی احادیث اور آثار جمع کر لئے جائیں۔

وكان أعظمهم شأنًا وأوسعهم رواية وأعرفهم مرتبة وأعمقهم فقها أحمد بن حنبل وإسحاق بن راهويه، وكان ترتيب الفقه على هذا الوجه يتوقف على جمع شيء كثير من الأحاديث والآثار.

پھر امام احمدؑ کے بعد کے محدثین کے ذکر میں لکھا ہے۔

ان میں سب سے زیادہ علم اور مفید علمی تصانیف پیش کرنے والوں میں چار مشہور ترین شخص ہیں جن کا زمانہ قریب قریب کا ہے۔ ان میں سب سے اول حیثیت امام ابو عبد اللہ البخاری کی ہے ان کی تصنیف کا مقصد یہی تھا کہ احادیث صحیحہ کو الگ الگ کر دیا جائے، جس سے فقہ و سیر و تفسیر مستنبط کی جاسکے۔ یہی شرط انہوں نے اپنی کتاب میں پوری کر دکھائی۔

وكان أوسعهم علما عندی وأنفعهم تصنيفا وأشهرهم ذكرا رجال أربعة متقاربون في العصر، أولهم أبو عبد الله البخاري وكان غرضه تجريد الأحاديث الصحاح المستفيضة المتصلة من غيرها، واستنباط الفقه والسيرة والتفسير منها، فصنف جامعہ الصحيح ووفى بما شرط.

پھر ذکر محدثین کے بعد لکھا ہے:

امام مالک و امام سفیان ثوری کے زمانہ میں محدثین کے مقابلہ میں ایک قوم تھی جو کثرت سوال کو برائیں جانتی تھی اور بے دھڑک فتویٰ دے دیتی اور کہتی تھی کہ دین کا دار و مدار فقہ ہی پر تو ہے۔ ضرور اس کی اشاعت ہونی چاہئے۔ مگر روایت حدیث سے وہ بھاگتے تھے۔

وكان يازاء هؤلاء في عصر مالک وسفیان وبعدهم قوم لا يكرهون المسائل، ولا يهابون الفتيا، ويقولون على الفقه بناء الدين، فلا بد من إشاعته، ويهابون رواية حديث رسول الله ﷺ.

پھر دوسرے مدرسہ فقہاء کا تذکرہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

ان لوگوں کے پاس احادیث و آثار ایسے نہ تھے جس سے وہ محدثین کی طرح مسائل استنباط کر سکتے۔ ان کے سینے اس بات کے لئے بھی نہ کھل سکے کہ دوسرے علاقوں کے علماء کے اقوال میں بھی غور و فکر کیا جائے۔ یا انہیں جمع کیا جائے اور اس میں صحیح کو تلاش کیا جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے خود کو متہم بھی کیا تھا۔ اپنے ائمہ کرام کے بارے میں ان کا یہ اعتقاد تھا کہ وہ بحث و تحقیق کی بلندیوں کو چھوتے ہیں۔ ان کا میلان بھی حد درجہ اپنے اساتذہ کرام کی طرف تھا۔ جیسے علقمہ نے کہا: کہ عبداللہ بن مسعود سے بڑھ کر بھی کوئی ثقہ ہے؟ اور امام ابوحنیفہ نے کہا: ابراہیم خنقی، سالم سے بڑھ کر فقیہ ہیں۔ اگر فضل صحابی کی بات نہ ہوتی تو میں کہتا کہ علقمہ، عبداللہ بن عمر سے زیادہ بڑے فقیہ ہیں۔

لم يكن عندهم من الأحاديث والآثار ما يقدرون به على استنباط الفقه على الأصول التي اختارها أهل الحديث ولم تنشرح صدورهم لتنظر في أقوال علماء البلدان، وجمعها، والبحث عنها. واتهموا أنفسهم في ذلك، وكانوا يعتقدوا في أئمتهم أنهم في الدرجة العليا من التحقيق، وكان قلوبهم أميل شيء إلى أصحابهم كما قال علقمة: هل أحد منهم أثبت من عبد الله، وقال أبو حنيفة: إبراهيم أفقه من سالم ولو لا فضل الصحبة لقلت: علقمة أفقه من ابن عمر.

اسی طرح اگر ہم مذاہب اربعہ کی فقہ کو قیاس اور رائے کے استعمال کے لحاظ سے ترتیب دیں تو حنفی مذہب کو سب سے اول اور ظاہری مذہب کو سب سے آخر میں رکھنا پڑے گا اور اگر نصوص اور صحیح احادیث سے استدلال کے لحاظ سے ترتیب دیں تو حنفی مذہب کو سب سے آخر میں اور شافعی و حنبلی مذہب کو اولین حیثیت دی جاسکتی ہے۔

واقعہ رائے: امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ائمہ اربعہ کا اپنا دور زمانہ اخیر کا ہے۔ اپنے مشائخ اور اساتذہ کے علم سے یہ بھی منور ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کا دین ان کے قلوب و نگاہ میں اس بات سے بلند تھا کہ وہ رائے، عقل یا قیاس کو اس پر ترجیح دیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اخلاص کو مقبولیت بخشی اور ان کا شہرہ چارہنگ عالم میں پھیل گیا۔ ان کا ذکر جمیل جاری ہو گیا۔ ان کے بعد ان کے عقیدت مند و اعتبار سے سامنے آئے:

ایک جماعت تو ان کے اتباع میں انہی کے مطابق رہی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں توفیق دی کہ انہوں نے وہی طریقہ جاری رکھا جس پر ان بزرگوں کو پایا تھا کسی کی جانب داری ان میں نام کو نہ تھی۔ وہ اپنے بزرگوں کی طرح حجت و دلیل کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ حق کا رخ جدھر پاتے اپنا منہ فوراً اسی طرف پھیر لیا کرتے

تھے۔ حق کا دامن تھامتے رہے اور اسی کے گرد گھومتے رہے۔ صحیح دلیل ثابت ہوتے ہی اکیلے یا باجماعت اس کی طرف لپک جاتے۔ حدیث رسول ﷺ سنتے ہی پروانہ وار جھومتے جھومتے آتے اور اسے قولاً و عملاً اپناتے۔ یہی ان کا عقیدہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ قرآن و حدیث کے مقابلے میں کسی انسان کا قول و حجت کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ قرآن و حدیث کا مقابلہ رائے یا قیاس سے کرنا گویا ان کی توہین و حقارت کے مترادف ہے۔

دوسری جماعت نے تقلید پر ہی قناعت کر لی جس نے تعصب کو جنم دیا۔ اس سے پھوٹ اور تفریق پیدا ہو گئی۔ جدا جدا گروہ بندیاں ہو گئیں اور اپنے اپنے جدا گانہ اصول و فروع ایجاد کر لئے گئے۔ ہر کوئی ان پر بخوشی جم گیا۔ ان میں سب سے بڑا دین دار اسے سمجھا جانے لگا جو سب سے زیادہ اپنے امام کی تقلید میں متعصب ثابت ہوا اور یوں ان لوگوں نے یہ نعرہ لگایا: **وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَائُنَا وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم لَمُقْتَدُونَ**۔ اعلام الموقعین: ۲۶۱/۱

فقہ اسلامی کی انواع

وہ مسائل جن کا تفصیلی تذکرہ فقہ اسلامی میں ہوتا ہے علماء نے ان کی کچھ انواع و اقسام متعارف کرائی ہیں تاکہ یہ علم ہو سکے کہ شریعت اسلامیہ نے انسانوں سے متعلق معاملات کو کس قدر اہمیت دی ہے اور اس میں کتنی جامعیت اور ابدیت ہے۔ اور مسائل کی گتھیاں سلجھانے میں کس طرح ہر دور میں راہنمائی کرتی ہے۔ یہ وہ عملی مسائل ہیں جو محدثین کرام نے رسول اکرم ﷺ سے صحیح احادیث پر مشتمل کتب میں جمع کر دیے ہیں۔ اور فقہاء کرام نے انہی کے منج کو اپنا کر اپنی کتب مرتب کی ہیں۔ ان کتب کے ذیلی ابواب میں مزید اجتہادی کاوشیں ہیں جو احادیث سے مستنبط کی گئی ہیں۔ مگر جو نئے مسائل احادیث میں نہیں ہیں ان میں پھر فقہاء کرام کے نقطہ نظر کو دلائل کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے۔ ان مسائل فقہ میں یا تو آخرت سے متعلق احکام ہیں جو عبادات کہلاتے ہیں یا دنیوی امور سے متعلق احکام ہیں جن کی اقسام یہ ہیں:

۱۔ مناکحات ۲۔ معاملات ۳۔ عقوبات

کچھ دوسری اقسام بھی کتب فقہ میں ملتی ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم:

۱۔ مخاصمات ۲۔ سیر ۳۔ احکام سلطانیہ

ہیں۔ ہر ایک کی مختصر تعریف درج ذیل ہے:

۱۔ **فقہ العبادات**: اس میں نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ کے فقہی مسائل ہیں۔

۲۔ **فقہ المناکحات**: (شخصی مسائل) اس میں نکاح، طلاق، لعان، اولاد، نسب، ولدیت، ظہار، عدت، نفقہ، ولایت، حضانت اور وراثت کے مسائل ہیں جنہیں جدید اصطلاح میں عائلی یا شخصی قوانین کہا جاتا ہے۔

۳۔ **فقہ المعاملات**: (مالی و مدنی مسائل) ان احکام کا تعلق لوگوں کے مالی و اقتصادی معاملات سے ہے جیسے بیع، رہن، ہبہ، اجارہ، معاہدے، تجارت، اور شراکت وغیرہ کے احکام ہیں۔ جنہیں موجودہ اصطلاح میں دیوانی قوانین کہا جاتا ہے۔

۴۔ **فقہ العقوبات**: (جنائی مسائل) جرم و سزا سے متعلق احکام، جن کا مقصد لوگوں کی جان، مال اور عزت کی حفاظت ہے۔ یہ اسلام کا فوجداری قانون ہے۔

۵۔ **فقہ المخاصمات**: اسے فقہ القضاء والشہادۃ بھی کہہ دیتے ہیں۔ ان کا مقصد عدالتی کارروائیوں کو جن میں عدالتی مسائل، دعویٰ اور شہادت شامل ہیں ان سب کو منظم کرنا ہے۔ تاکہ لوگوں کے درمیان انصاف قائم ہو سکے۔ دور حاضر میں اسے قانون عدل کا نام دیا جاتا ہے۔

۶۔ **فقہ السیر**: (داخلی و خارجی حربی مسائل) سیر، سیرۃ کی جمع ہے ان میں احکام جہاد، مال غنیمت، امان، ذمیوں کے عہد و پیمان، اختلاف مذہب دار السلام اور دار الحرب جیسے مسائل ہوتے ہیں۔

۷. **احکام سلطانیہ:** جسے فقہ الدستوری بھی کہتے ہیں اس میں خلافت، عام حکومتیں، وزارت، عمال، فوج وغیرہ سے متعلق مسائل ہوتے ہیں۔ اس میں مختلف قسم کے محاصل مثلاً جزیہ، عشر اور خراج وغیرہ ہوتے ہیں۔ حاکم و محکوم کے حقوق و فرائض اور دونوں کے درمیان تعلقات کی وسعت کے متعلق یہ احکام دستوری قانون میں داخل ہیں۔ یہ تمام مسائل آج کل دستوری، اداری اور مالی قانون سازی میں داخل ہیں۔

۸. **فقہ القانون الدولی اسلامی:** سلطنت کا دوسری سلطنتوں کے ساتھ معاملہ، ان تعلقات کی حدود، زمانہ جنگ و امن میں ان تعلقات کی نوعیت اور ان تعلقات کے نتیجے میں مرتب ہونے والے نتائج، یہ سب انٹرنیشنل لاء کا حصہ ہیں۔ جدید قوانین میں بھی تقریباً یہی تقسیم پائی جاتی ہے جو بحیثیت مجموعی عملی طور پر مفید ہے اور بعض لحاظ سے فقہ اسلامی کی تقسیم کے مشابہ ہے۔

فہم دین میں کوتاہی

اہل اسلام میں جب تک اجتہاد اپنے مشروط منہج پر قائم رہا اور جب تک مجتہدین نے اس کی حدود اور قیود کی پابندی کی۔ اس وقت تک اجتہاد باعث رحمت رہا۔ اختلاف رائے میں رواداری، حوصلہ اور درگزر کا پہلو غالب رہا۔ تعصب کی بجائے فکر و نظر کو تازگی ملتی رہی اور اسلام اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ جلوہ گر رہا۔ مگر جو نہی ان شرائط کو نظر انداز کیا گیا۔ مذہبیت بتدریج غالب آ گئی اور مسلمان اپنے اسلاف کے منہج سے بھی بتدریج ہٹتے گئے۔ اس کے آغاز کے بارے میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی حجتہ اللہ البالغہ: ج ۱ ص ۴۳۸ فرماتے ہیں:

اعلم أن الناس قبل المائة الرابعة كانوا غير
مجمعين على التقليد الخالص لمذهب
واحد بعينه
آپ کے علم میں یہ بات ہونی چاہئے کہ مسلمان چوتھی
صدی ہجری سے قبل کسی ایک مذہب کی تقلید خالص پر
متفق نہ تھے۔

آپ فرماتے ہیں کہ جو نہی حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی کی اصطلاحات متعارف ہوئی ہیں ہمارا یہ خیال ہے کہ اسلامی فقہ کا عظیم دور گزر گیا اور اس کی جگہ مذہبی دور آ گیا۔ ہو سکتا ہے کئی سیاسی اور عقلی عوامل اس مذہبیت کے پیچھے ہوں مگر بعد میں شخصیت پرستی (تقلید) کی روح عوام میں بتدریج سرایت کر گئی۔ جس میں علماء بھی شامل ہو گئے۔

فقہی مذاہب کا آغاز:

دوسری صدی ہجری کے آخر میں فقہ اسلامی کا رنگ بدلا اور انہی علمی سرگرمیوں کے نتیجے میں ماحول و شخصیات کی فکر کے تعلق سے دو مدارس وجود میں آ گئے: جو مدرسہ حدیث (Hadith School) اور مدرسہ رائے (Anology School) کہلائے۔ امام شہرستانی (۵۴۸ھ) جو امت اسلامیہ میں مختلف فرقوں اور مذاہب کے بننے اور بگڑنے پر گہری نظر رکھتے ہیں وہ اس موضوع پر لکھی گئی اپنی مستند کتاب الملل والنحل میں فرماتے ہیں:

ائمہ مجتہدین کی دو ہی قسمیں ہیں تیسری کوئی قسم نہیں:
اصحاب حدیث اور اصحاب رائے۔

ثم المجتهدون من أئمة الأمة محصورون
في صنفين، لا يعدان إلى ثالث، أصحاب
الحديث وأصحاب الرأي.

۱۔ اصحاب حدیث کا مسکن حجاز ہے جن میں امام مالک
اور ان کے تلامذہ، امام شافعی اور ان کے شاگرد،
سفیان الثوری اور ان کے رفقاء، امام احمد کے ساتھی
اور امام داؤد اور ان کے خدام، انہیں اصحاب حدیث
اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کی زیادہ تر توجہ حدیث اور
اخبار کی طرف ہے، یہ لوگ احکام کی بنیاد نصوص پر
رکھتے ہیں۔ جب حدیث موجود ہو تو یہ لوگ قیاس جلی
ہو یا خفی اس کی پروا نہیں کرتے۔

أصحاب الحديث هم أهل الحجاز
وأصحاب مالک بن أنس وأصحاب محمد
بن إدريس الشافعي وأصحاب سفیان
الثوری وأصحاب أحمد بن حنبل وأصحاب
داؤد بن علی بن محمد الإصفهانی، وإنما
سموا أصحاب الحديث لأن عنايتهم
بتحصيل الأحاديث ونقل الأخبار وبناء
الأحكام على المنصوص ولا يرجعون إلى
القياس الجلی والخفی ما وجدوا خبرا.

۲۔ اہل عراق کو اصحاب رائے کہا جاتا ہے جو امام
ابو حنیفہؒ اور ان کے تلامذہ ہیں، انہی میں امام محمد، امام
ابو یوسف قاضی، زفر بن ہذیل، حسن بن زیاد، ابن
سماہ، قاضی عافیہ، ابو مطیع البلخی اور بشر المریسی وغیرہ
شمار ہوتے ہیں۔ انہیں اصحاب رائے اس لئے کہا
جاتا ہے کہ ان کی زیادہ تر توجہ قیاس اور معانی کے
استنباط کی طرف ہے یہ لوگ احکام کی بنیاد قیاس پر
رکھتے ہیں اور بسا اوقات قیاس جلی کے سامنے خبر
واحد کی بھی پروا نہیں کرتے۔

وأصحاب الرأي وهم أهل العراق: هم
أصحاب أبي حنيفة النعمان بن ثابت ومن
أصحابه محمد بن الحسن وأبو يوسف
يعقوب بن محمد القاضي وزفر بن هذيل
والحسن بن زياد الوائلوي وابن سماعة
وعافية القاضي وأبو مطيع البلخي والبشر
المریسی، وإنما سموا أصحاب الرأي لأن
عنايتهم بتحصيل وجه من القياس والمعنى
المستنبط من الأحكام وبناء الحوادث
عليها، وربما يقدمون القياس الجلی على
أخبار الآحاد.

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی معروف کتاب حجۃ اللہ البالغۃ میں باب الفرق بین اہل الحدیث و اہل الرائے میں شہرستانی کی اسی بات کی شرح بھی
فرمائی ہے۔

تقسیم کی وجہ: تاریخ کے امام مشہور مورخ و ناقد علامہ ابن خلدون (۸۰۸ھ) کا یہ اقتباس بھی قابل غور ہے۔ فرماتے ہیں:

فقه کی دو قسمیں ہو گئیں: فقہ اہل رائے، جن کا مرکز عراق تھا۔ اور فقہ اہل حدیث جن کا مرکز حجاز تھا۔ اہل عراق میں حدیث کا چرچا بہت کم تھا اور وہ قیاس میں ماہر تھے اس لئے انہیں اہل رائے کہا جاتا ہے۔ جن کے سرخیل و راہنما امام ابوحنیفہؒ ہیں۔ (مقدمہ ابن خلدون: ۳۸۹)

وانقسم الفقه فيهم إلى طريقتين: طريق أهل الرأي والقياس وهم أهل العراق، وطريق أهل الحديث وهم أهل الحجاز، وكان الحديث قليلا في أهل العراق لما قدمناه، فاستكثروا من القياس ومهروا فيه، فلذلك قيل أهل الرأي، ومقدم جماعتهم الذي استقر المذهب فيه وفي أصحابه: أبو حنيفةؒ

خیر القرون میں ہر فقیہ کا یہ حق تھا کہ وہ صورت مسئلہ کا جواب دے اس لئے کہ لوگ اس سے فقہی سوالات کا حل مانگتے تھے۔ اور جب اس نے اجتہاد کیا تو اپنے علم کے مطابق یہی سمجھا کہ میری نظر میں یہی حق ہے۔ بعد میں فقہاء کرام کی یہ کوششیں انفرادی حیثیت اختیار کر گئیں جو ہر شہر میں اپنے اپنے مسلک کی تھیں۔ وہ اپنے ماحول اور حالات کے لحاظ سے معذور بھی تھے۔ مکہ کے فقہاء ہوں یا مدینہ کے، عراق کے ہوں یا یمن کے، مصر کے ہوں یا شام کے سب کی فقہی جزئیات اور قابل اعتماد ذرائع علیحدہ علیحدہ تھے۔ کوئی جامع ضابطہ نہ تھا جو حدیث کی صحت و ضعف کا معیار قائم کر سکتا اور نہ ہی کوئی اصول و قاعدہ تھا۔ بلکہ ہر شہر کا فقیہ اور فقہ علیحدہ علیحدہ تھی۔ اجتہاد، افتاء اور استنباط مسائل کے لئے احادیث صحیحہ کے مقابلے میں مرسل، منقطع اور موقوف روایات پر اعتماد و انحصار تھا۔ اسی بناء پر امام زرکشیؒ نے المحصول میں مسلکی فقہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

جدید مسائل کے احکام کو نصوص استنباط کے ذریعے سے کسی بھی مذہب کی روشنی میں جاننا۔ ۹۲/۱۸۱

هو معرفة أحكام الحوادث نصا واستنباطا على مذهب من المذاهب.

ان تمام ائمہ کی طرف نسبت سے فقہ مدون و مرتب ہوئی اور یوں فقہ حنفی، فقہ مالکی، فقہ شافعی اور فقہ حنبلی وجود میں آئی۔ اس طرح ہر فقہ ایک ہی مسلک کی محدود فقہ بن گئی۔

مذہبی شدت کا غلبہ: شاہ صاحب نے تقلید کے زمانہ کی جو تحدید کی ہے ہمارا خیال یہ ہے کہ غالباً اس کا آغاز ائمہ حضرات کے دور میں ہی ہو چکا تھا۔ اس مذہبی فقہ کا قاری بآسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ مسئلہ اور اس کا رد عمل، اندلس میں مالکی فقہاء اور مشرق میں حنفی فقہاء کی اپنے اپنے قاضیوں کی مناصب پر تعین اور ان کی پیشگی شرائط، امام شافعیؒ اور امام محمدؒ کے فقہی مناظرے، امام شافعیؒ کے بارے میں مالکی فقہاء کی بد دعائیں، کتب فقہیہ میں مناظرانہ رنگ اور علمی احترام کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک دوسرے پر شدید ردود، اپنے فقہاء کے بارے میں غلو اور دوسروں کی اہانت، شاعرانہ چشمک نے یہ مذہبی عصبيت شروع ہی سے پیدا کر دی تھی۔

امام بخاری رحمہ اللہ کو ان کے آخری ایام میں بخارا سے بدر کروانے میں شاید یہی عوامل کارفرما تھے کہ امام بخاریؒ کے فتاویٰ نصوص پر تھے جن کے مقابلہ میں سلطنت عباسی کے سایہ شفقت میں جہاں بخارا و سمرقند میں فقہ حنفی کا تسلط تھا۔ حنفی علماء کے فتاویٰ اپنے مسلک کے مطابق تھے۔ فقہاء و علماء کے درمیان ایسی صورت حال پیدا ہوتی رہی جو ایک دوسرے کے لئے پریشان کن تھی۔ مثلاً بعض فقہاء کا یہ فتویٰ تھا کہ مدہوشی کی حالت میں طلاق مؤثر ہوتی ہے ان کے مقابل یہ فتویٰ دیا گیا کہ حالت نشہ میں دی گئی طلاق غیر مؤثر ہوتی ہے۔ فقہاء نے وجہ یہ بتائی کہ لفظ طلاق کی ساتھ نیت ضروری نہیں۔ دوسروں نے کہا: نہیں بلکہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: إنما الأعمال بالنيات۔ عمل کے مؤثر ہونے کا دار و مدار نیت پر ہے۔ مے نوش جب حالت نشہ میں طلاق دیتا ہے تو اس کی نیت طلاق دینے کی نہیں ہوتی لہذا اس کے الفاظ، لغو الفاظ ہیں اور طلاق مؤثر نہیں۔

اسی طرح ایک فتویٰ یہ بھی سامنے آیا کہ جبر، تشدد اور اکراہ سے حاصل کی گئی طلاق مؤثر ہے۔ یہ فتویٰ بھی یہ کہتے ہوئے رد کر دیا گیا کہ یہ طلاق غیر مؤثر ہے اس

لئے کہ نبی ﷺ نے فرمایا جبری طلاق نہیں ہوتی۔

فقہاء نے کہا: نکاح کے لئے لڑکی کی رضا ضروری نہیں ہے۔ دوسروں نے فتویٰ دیا: نکاح کے لئے لڑکی کی رضا ضروری ہے آپ ﷺ نے اس لڑکی کا نکاح کا عدم قرار دیا تھا جس نے اظہار کراہت کیا تھا۔ اور کراہت کا ضد لفظ رضا ہے، اجازت نہیں ہے۔

یہ فتویٰ بھی سامنے آیا: نکاح سے قبل طلاق دینا جائز ہے۔ دوسرے فقہاء نے فرمایا ایسا کرنا درست نہیں اس لئے یہ قرآن کے حکم کے خلاف ہے نکاح سے قبل طلاق کا جواز ہی نہیں بلکہ ایسی طلاق لغو ہے۔

فقہاء نے کہا: نکاح و طلاق میں قاضی کا فیصلہ ظاہر و باطن میں نافذ ہوتا ہے۔ دیگر فقہاء نے فتویٰ دیا یہ بھی درست نہیں۔ عمداً جھوٹ بول کر، عمداً جھوٹے گواہ بنا کر اگر عدالت کا فیصلہ لے لیا جائے تو عورت بیوی نہیں بنتی۔ جب کہ پہلوں نے کہا وہ بیوی بن جاتی ہے۔

یہ بھی فتویٰ سامنے آیا: ایک قطرہ دودھ پینے سے عورت رضاعی ماں بن جاتی ہے۔ جواب میں کہا گیا یہ بھی غلط ہے اس لئے کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ایک دو گھونٹ پینے سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔

مذہبی شدت کے یہ امنٹ آثار ہماری ان کتب کی زینت ہیں جنہیں ہمارے ہاں قابل قدر اثاثہ و سرمایہ سمجھ کر پڑھایا جاتا ہے۔ امام خطیب بغدادی حنبلی مسلک رکھتے تھے کسی مسئلہ پر تحقیقی و علمی انداز سے سوچا تو امام شافعیؒ کی رائے و قیاس و مدلل نظر آئی چنانچہ انہوں نے اس کے مطابق فتویٰ دے دیا۔ صبح جب اپنے کمرے سے باہر آنا چاہا تو حنبلیوں نے راتوں رات ان کے دروازے پر دیوار چن دی۔ مالکیوں نے امام قسطلانیؒ بن مخلصؒ کے ساتھ جو کچھ کیا کہ اندلس میں اس عالم حدیث کا وجود تک برداشت نہ کر سکے۔ ماضی میں معمولی فقہی مسائل پر شوافع اور احناف کے درمیان باقاعدہ میدان جنگ سجے اور بزعم خود شہادتوں کے ڈھیر لگے۔ تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کے تاخت و تاراج کے پس منظر میں یہی فرقہ واریت ہی تو ہے۔ ہاتھ چھوڑ کر نماز مالکی پڑھتے ہیں۔ پوچھا جائے کہ اس کی دلیل تمہارے پاس کیا ہے جب کہ امام محترم اپنی کتاب مؤطا میں ہاتھ باندھنے کی حدیث بطور دلیل کے پیش فرماتے ہیں اور وہ خود بھی اس پر عامل رہے؟ ان کا جواب یہی ہے کہ چونکہ ہمارے امام کا یہ آخری عمل ہے۔ اس لئے ہم اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ بعض کتب فقہ میں بڑے بڑے ائمہ مجتہدین کے خلاف ایسا تلخ و ترش لب و لہجہ استعمال ہوا ہے جو کسی بھی طرح ایک طالب علم کو علماء و فقہاء اور محدثین کے ادب و احترام کا خوگر نہیں بناتا بلکہ دیگر مسالک سے تعصب اور نفرت کا داعیہ پیدا کرتا ہے۔ کسی کو گمراہ قرار دینے یا کفر تک پہنچانے کے رجحانات بھی بہت تیز و شدید پائے جاتے ہیں۔ عموماً یہ رجحان فروعات کے بارے میں ہے جب کہ فروعی مسائل میں اختلاف کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

اسی طرح مسانید ابی حنیفہؒ کے نام سے ایک کتاب ساتویں ہجری میں ایک حنفی عالم ابوالمؤید الخوارزمی نے مرتب کی۔ اولاً تو اس کتاب کی ثقاہت بیشتر علماء و محدثین کے نزدیک محل نظر ہے جس کی تفصیل ہمیں حجتہ اللہ البالغہ میں مل جائے گی۔ نیز اس کی بیشتر احادیث سند اور متن دونوں اعتبار سے محدثین کے ہاں ضعف اور وضع سے بھرپور ہیں۔ پھر بھی مؤلف مرحوم کا تصنیفی داعیہ ملاحظہ فرمائیے لکھتے ہیں:

زعم أنه ليس لأبي حنيفة رحمه الله مسند،
كان لا يروى إلا عدة أحاديث فلحقنتي حمية
دينية ربانية، وعصبية حنفية نعمانية فأردت أن
أجمع بين خمسة عشر من مسانيدہ.....
مقدمه جامع المسانيد از خوارزمی
مخالف یہ دعویٰ کرتا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی کوئی
مسند نہیں ہے۔ نیز یہ کہ وہ چند احادیث ہی کو روایت
کرتے تھے۔ تو مجھے دین کی ربانی غیرت نے اور حنفی
نعمانی عصبیت نے لکا را اور جوش دلایا۔ اس بنیاد پر
میں نے چاہا کہ ان پندرہ مسانید کو جمع کر ڈالوں۔۔۔

جس فقیہ کے یہ الفاظ ہوں اس نے کیا جمع کیا ہوگا؟۔

ہونا یہ چاہئے تھا کہ تمام فقہاء کی کاوشوں اور اجتہادات سے بھرپور فائدہ اٹھایا جاتا اور یوں فقہ محدود ہونے کی بجائے وسیع ہوتی، جسے عین اسلامی فقہ کا نام بھی

دیا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ ان فقہاء کرام نے یہ سب کاوشیں دین اسلام کے لئے اور مسلمانوں میں اٹھنے والے مسائل کے حل کے لئے کی ہیں نہ کہ اپنی اپنی ذات یا اپنے اپنے مسلک کو رواج دینے کے لئے۔ جب چاروں فقہاء برحق ہیں تو ایک مسلک سے جڑ کر ان کی فقہ کو اسلامی فقہ کس طرح کہا جاسکتا ہے نیز اختلافات سے بچنے اور تمام فقہاء کرام کا مقام و احترام بحال کرنے کی آخر سبیل کیا ہے؟ اس سلسلے میں شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کا ایک صائب مشورہ: ہے کہ ہر مذہب کے تین حصے کر لیجئے۔ وہ حصہ جس میں حق واضح ہو اور کتاب و سنت کے موافق ہو شرح صدر سے اس کے مطابق فتوے دیجئے۔ دوسرا وہ حصہ جو مرجوح ہے اور دلائل کے اعتبار سے بہت کمزور۔ اس کے مطابق نہ فتویٰ دیا جائے اور نہ ہی مسائل بتائے جائیں بلکہ اس حصے کو تو ذہن سے ہی نکال دینا چاہئے۔ تیسرا حصہ وہ جس میں دلائل کی کشش دونوں طرف موجود ہے اس میں جیسے طبیعت چاہے فتویٰ دیا جاسکتا ہے یا اسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

یہ بھی خیال میں رہے کہ مذہبی فقہ کے مراتب مختلف ہیں۔ نیز بیشتر مسائل میں استاذ شاگرد کا اصولی و نظری اختلاف بھی موجود ہے جو اس کی استدلالی حیثیت کو مشکوک بنا دیتا ہے اس لئے یہ مذہبی فقہ کسی بھی مقام پر رد و قبول کے لئے معیار نہیں قرار پاسکتی۔ ہاں اگر مقدار و پیمانہ کا تعین ہو جائے تو درایت کے اعتبار سے مذہبی فقہ قابل قبول ہو سکتی ہے۔

مسلمی فقہ کی اشاعت کے اسباب

۱۔ قاضیوں کا کردار: ان مذاہب کی فقہی اشاعت میں اپنے اپنے علاقے میں متعین قاضیوں کا بڑا کردار تھا۔ جو چیف جسٹس کی طرف سے متعین ہوتے تھے۔ اس بات کو ذرا تفصیل سے شاہ عبدالعزیز دہلوی بستان المحمدؒ ثین صفحہ ۱۱ میں یوں فرماتے ہیں:

این دو مذهب در عالم از راه ریاست و
سلطنت رواج و اشہار گرفته اند؟ مذهب
ابو حنیفہ و مذهب مالک۔ زیرا کہ قاضی
ابو یوسف قضاء کل ممالک بدست
آوردہ، از طرف او قضاۃ میرفتند۔ پس ہر
قاضی شرط میکرد کہ عمل و حکم
بمذہب ابو حنیفہ نمایند.....

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے گو اس کی وجوہات کچھ اور بتائی ہیں ان کی زبانی سنئے:

وکان وأشہر أصحابہ ذکراً أبو یوسف، فولی
قضاء أيام ہارون الرشید، فکان سببا لظہور
مذہبہ، والقضاء بہ فی أقطار العراق وخراسان
وما وراء النہر الخ"۔ (حجة اللہ البالغہ، 151)

امام ابو حنیفہؒ کے شاگردوں میں بڑے مشہور و معروف
شاگرد امام ابو یوسفؒ تھے۔ جنہیں ہارون رشید کے
عہد میں چیف جسٹس کا منصب ملا۔ یہی منصب ہی
ان کے مذہب کو عام کرنے اور اسی مذہب کے
مطابق عراق و خراسان اور ماوراء النہر کے علاقوں
میں قضاء و فیصلہ جات نافذ ہوئے۔

۲۔ فقہاء کے میلانات: ماضی میں کچھ فقہاء ایسے پیدا ہوئے۔ جن کے پاس اتنی احادیث نہ تھیں جن سے وہ مسائل کا استنباط کرتے۔ بلکہ وہ اپنے اساتذہ کے بارے میں بہت خوش گمان اور معتقد تھے اور انہی کے بتائے ہوئے قواعد و اصول کے مطابق بے دھڑک فتوے دے دیا کرتے تھے۔ اور دوسرے علماء کے اقوال دیکھنا، سننا بھی ان کو پسند نہ تھا۔ (حجة اللہ البالغہ) اس رجحان کا تذکرہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی درجہ بالا کتاب میں کیا ہے۔ اس سے

فقہی مسائل کی حقیقت کا اور ان کے معیار کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس پر مزید روشنی اندلس کے ایک معروف عالم علامہ ابن خلدونؒ اپنے مقدمہ تاریخ میں یوں ڈالتے ہیں۔

﴿انقسم الفقہ إلى طریقین، طریقة أهل
الرأى و القیاس و هم أهل العراق - و طریقة
أهل الحدیث و هم أهل الحجاز. و كان
الحدیث قلیلاً فی أهل العراق لما قدمناه
فاستكثروا من القیاس و مهرؤا فیہ، فلذلك
قیل: أهل الرأى - و مقدم جماعتهم الذی
استقر المذهب فیہ و فی أصحابه أبو حنیفة.
و إمام أهل الحجاز مالک بن أنس
و الشافعی من بعد.﴾

پہلوں میں فقہ کے دو طریقے رائج ہو گئے۔ ایک
طریقہ اہل عراق (کوفہ وغیرہ) والوں کا ہے اور دوسرا
محدثین کا جو حجاز عراق (مکہ و مدینہ) والوں کا ہے۔
اہل عراق میں جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ حدیث کا
ذوق کم تھا۔ لہذا انہوں نے بکثرت قیاس سے کام لیا
اور اسی میں مہارت حاصل کی۔ جس کی وجہ سے انہیں
اہل الرأى کہا گیا۔ اس جماعت کے سرخیل امام
ابو حنیفہؒ قرار پائے۔ ان میں اور ان کے شاگردوں
میں مذہب نے قرار پکڑا۔ اہل حجاز (مکہ و مدینہ)
والوں کے پیشوا امام مالک اور پھر امام شافعیؒ
ٹھہرے۔

ان شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ:

..... کچھ فقہاء قرآن و حدیث کو ہی اپنے استنباط (deduction) کا محور سمجھتے۔ ان کا زیادہ میلان حدیث رسول ﷺ کی طرف رہا۔
..... بعض فقہاء، حدیث و سنت کا مزاج نہ رکھنے کے باعث عقل و رائے کے ذریعے استنباط کیا کرتے۔
..... کچھ فقہاء نے ان مسائل کے بارے میں اپنی بروقت فقہیات پیش کیں۔ جو وقوع پذیر ہو چکی تھیں۔ یا ہورہی تھیں۔
..... بعض فقہاء نے مفروضہ مسائل یا مستقبل میں امکانی حد تک پیش آنے والے مسائل کے بارے میں اپنی فقہیات پہلے سے ہی پیش کر دیں۔ اور ہر دور میں
تخریج و تدریج کرتے گئے۔

بعض فقہاء نے اس خوش گمانی میں کہ ہمارے اسلاف کے وضع کردہ فقہی قواعد و اصول ہی بہتر ہیں۔ انہیں یہ درجہ دے دیا:

أن كل آية تخالف قول أصحابنا فإنها تحمل
على النسخ أو على الترجيح، والأولى أن تحمل
على التأويل من جهة التوفيق. من مسائله أن من
تحرى عند الاشتباه واستدبر الكعبة جاز عندنا
لأن تأويل قوله تعالى ﴿فولوا وجوهكم شطره﴾
إذا علمتم به، وإلى حيث وقع تحريككم عند
الاشتباه. اصول كرخي: ۱۲

ہر وہ آیت قرآنیہ جو ہمارے فقہاء کے اقوال کے
خلاف ہے اسے یا تو نسخ پر محمول کیا جائے گا یا ترجیح
پر۔ زیادہ بہتر یہی ہے کہ اسے تاویل پر محمول کیا جائے
تا کہ موافقت پیدا ہو جائے۔ مثلاً کوئی شخص شک کی
وجہ سے کعبہ کا صحیح رخ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے
اور پشت کر کے بیٹھ جاتا ہے تو یہ بیٹھنا جائز
ہوگا۔ کیونکہ اللہ کے اس فرمان (اپنے چہرے اسی کی
طرف پھیر لو) کی تاویل یہی ہوگی کہ جب تم اس کی
سمت جان لو۔ تو اسی طرف رخ پھیر لو۔

قیاسی مسائل اور ان کی بے محل تخریج بھی ماضی میں عام رہی۔ جس کی وجہ سے ان فقہاء کے پاس ایسا ذخیرہ جمع ہو گیا جس کا پڑھنا اور جاننا یا اس سے مستفید ہونا وقت کا ضیاع ہی محسوس ہوتا ہے۔ بلکہ ایک سعی لا حاصل بھی۔

۳۔ غلو: ان ائمہ کرام کو رب ذوالجلال نے علمی اور فقہی مقام عطا فرمایا جس اخلاص اور محبت الہی میں ڈوب کر دین کی اشاعت و ترویج اور فقہ و اجتہاد کا کام ان بزرگوں نے کیا یہی انشاء اللہ تعالیٰ روز قیامت، میدان محشر میں ان کی سرخروئی اور جنت میں رفع درجات کا باعث ہوگا۔ ان سے محبت، ان کا احترام ایمان کی علامت ہے اور ان سے بغض، نفرت اور ان کی ذرہ برابر توہین کا ارتکاب اپنی عاقبت کو تباہ کرنے کا نام ہے۔ اسی طرح ان ائمہ کرام کو ان کے مقام و مرتبہ سے اٹھا کر نبوت کے مقام پر لے جانا، اور انہیں معصوم عن الخطا سمجھنا اور ان کی ہر بات کو وحی کا درجہ دینا یا ان ائمہ میں سے کسی ایک کے علم کو حرف آخر سمجھنا اور دیگر ائمہ کرام کے علم سے خود بھی اور دوسروں کو بھی محروم کرنا، یہ سب کچھ بھی شرعی، اخلاقی اور دینی اعتبار سے ہرگز ہرگز درست نہیں۔ قرآن مجید کا دیا ہوا یہ سبق ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہے کہ: فوق کل ذی علم علیم۔ ہر عالم کے اوپر ایک اور عالم ہوتا ہے۔ جس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ علم کی حد بندی نہیں کی جاسکتی اور نہ علماء کرام کی۔ ہمارے اسلاف نے اور معاصر معتدل علماء نے اس کو محسوس کرتے ہوئے اس بے اعتدالی اور غلو کا نہ صرف نوٹس لیا ہے بلکہ اعتراف کرتے ہوئے اس کی نشاندہی بھی فرمائی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:

وترى العامة سيما اليوم فى كل قطر يتقيدون
بمذهب من مذاهب المتقدمين، يرون خروج
الإنسان من مذهب من قلده ولو فى مسئلة،
كالخروج من الملة كأنه نبى بعث إليه،
وافترض طاعته عليه، وكان أوائل الأئمة قبل
المائة الرابعة غير متقيدين بمذهب واحد.

تفہیمات ج ۱ ص ۱۵۱

ہر علاقے کے عوام ائمہ متقدمین میں سے کسی نہ کسی کے مقلد اور اس کے پابند ہیں۔ اگر کوئی اپنے امام کے مذہب سے نکل جائے خواہ وہ معمولی سا مسئلہ ہی کیوں نہ ہو، تو لوگ سمجھتے ہیں گویا کہ وہ دین سے نکل گیا۔ لگتا ایسا ہے کہ گویا کہ وہ امام نہیں بلکہ ایک نبی ہے جو ان کی طرف مبعوث کیا گیا ہے اور ان پر اس کی اطاعت واجب ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ چوتھی صدی سے قبل عام مسلمان کسی ایک مذہب کے پابند تھے ہی نہیں۔

طلبہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ورب انسان منكم يبلغه حديث من احاديث
نبيكم فلا يعمل به، ويقول: إنما عملي على
مذهب فلان لا على الحديث، ثم اختال بأن
فهم الحديث والقضاء به من شأن الكمل
المهرة، وأن الأئمة لم يكونوا ممن يخفى
عليهم هذا الحديث فما تركوه إلا لوجه
ظهر لهم فى الدين من نسخ و مرجوحية.

(تفہیمات ج 1، ص 215)

تم میں بہت سے طالب علموں کو رسول کریم ﷺ کی حدیث مل جاتی ہے لیکن وہ اس پر عمل نہیں کرتے بلکہ یہ کہتے ہیں: اس حدیث کے ہوتے ہوئے پھر بھی میرا عمل فلاں امام کے مذہب پر ہے۔ پھر بہانہ یہ بناتے ہیں کہ حدیث سمجھنا اور اس کے مطابق فیصلہ کرنا کامل اور ماہر لوگوں کا کام ہے نہ کہ ہمارا۔ اور یہ بھی کہ ان ائمہ کرام سے یہ حدیث پوشیدہ نہ تھی کوئی وجہ ضرور ہوگی جس کی بناء پر ان ائمہ نے اس پر عمل نہیں کیا۔

آگے نتیجہ میں فرماتے ہیں: بھائی یہ قطعاً دینی رویہ نہیں اور نہ ہی علم کی شان ہے بلکہ تم صرف جناب رسالت مآب ﷺ کی اطاعت کرو خواہ وہ مذہب کے

مخالف ہو یا موافق۔ کیونکہ اللہ کی مرضی یہی ہے کہ تم کتاب و سنت کی اطاعت کرو۔

مستقبل میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بارے میں غلو کی مذہبی داستانیں کچھ یہ بھی ہیں مثلاً:

☆ یہ کہ جناب خضرؑ نے پانچ سال تک جناب امام ابوحنیفہؒ کے در اقدس پہ روزانہ صبح حاضری دے کر علم حاصل کیا۔

☆ سیدنا امام ابوحنیفہؒ کی وفات پر سیدنا خضرؑ نے نہایت تضرع و زاری سے بارگاہ خداوندی میں مزید علم کے حصول کی درخواست کی۔ صرف اتنی اجازت ملی کہ ان کی قبر پہ جا کر سیکھ آیا کرو۔ چنانچہ پچیس سال تک قبر مبارک پر حاضر ہو کر علم حاصل کرتے رہے۔

☆ سیدنا خضر علیہ السلام نے جو علم شریعت امام عالی مقام سے حاصل کیا تھا۔ وہ انہوں نے سیدنا امام قشیریؒ کو سکھا دیا۔ امام قشیریؒ نے اسے لکھ کر ایک صندوق میں بند کر کے دریائے جیحون میں ڈال دیا۔ تاکہ جب سیدنا عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نزول فرمائیں تو انہی کتب کو نکال کر اس پر عمل درآمد فرمائیں۔

۴۔ **ایک اور نمونہ:** برصغیر میں معاصر علماء احناف کے سرخیل مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی یہ آہ اور حسرت بھی اس قابل ہے جس پر غور کیا جاسکتا ہے۔ مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ ایک تحریر میں فرماتے ہیں: میں نے ایک مرتبہ جناب سیدنا انور شاہ کشمیریؒ کو مغموم حالت میں سحری کے وقت سر پکڑے دیکھا تو عرض کی: حضرت مزاج کیسا ہے۔؟ فرمانے لگے کیا مزاج پوچھتے ہو، عمر ہی ضائع کر دی۔ میں نے عرض کی حضرت بات کیا ہے؟ فرمایا: ہماری عمر کا، ہماری تقریروں کا اور ہماری ساری کد و کاوش کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کر دیں اور امام ابوحنیفہؒ کے مسائل کے دلائل تلاش کریں۔ یہ رہا ہے محور ہماری کوششوں کا، تقریروں کا اور علمی زندگی کا۔ اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی؟ (وحدت امت ص: ۱۶)

۵۔ **تلخ یادگاریں:** حرم پاک میں جب ترکی بادشاہ فرح بن برقوق نے نویں صدی ہجری کے اوائل میں جب چار مصلے قائم کیے تو دنیا یہ تماشہ دیکھتی تھی کہ شوافع اگر نماز باجماعت پڑھ رہے ہیں تو احناف ایک طرف بیٹھے ہیں۔ اس لئے کہ ابھی ان کی نماز کا وقت نہیں ہوا جب وقت آئے گا تو ان کا امام ہی نماز پڑھائے گا۔ بعینہ اسی طرح حنبلی، مالکی بھی اپنی اپنی امامت میں نماز پڑھنے کا شوق رکھتے تھے۔

۶۔ **تقلید:** ہماری سادہ دل مسلمانوں کی اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ لفظ تقلید بھی شائد اس طرح کی ایک دینی اصطلاح ہے جس طرح صلاة وصیام یا اطاعت و اتباع کی اصطلاح۔ جب کہ یہ اطاعت و اتباع کے معنی و مفہوم سے کوسوں دور کی اصطلاح ہے۔ نیز یہ دینی نہیں بلکہ ایک مذہبی اصطلاح ہے۔ ایک باشعور آدمی اس کے معنی و مفہوم کو اگر جان لے تو لفظ تقلید، مقلد و غیر مقلد جیسی اصطلاحات کے استعمال سے نہ صرف گریز کرے گا بلکہ ایسی اصطلاح کے استعمال پر فخر محسوس کرے گا جسے قرآن مجید نے استعمال کیا ہے یا رسول اکرم ﷺ نے۔

لغوی معنی: لفظ "تقلید" کا مادہ ق ل د ہے۔ اسی سے لفظ "قلادہ" ہے جو گلے کے پٹے کو کہتے ہیں۔ اور اسی سے باب تفعیل کے وزن پر تقلید کا لفظ ہے۔ عربی زبان میں تقلید کا مطلب ہے گلے میں پٹہ ڈالنا۔ اور مقلد اس جانور کو کہتے ہیں جس کے گلے میں پٹہ ہو اور رسی کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہو جو اسے کھینچتا جائے اور جانور اس کے پیچھے چلتا جائے۔ عربی زبان کی تمام قدیم و جدید لغات و قواعد میں یہی معنی بتاتی ہیں۔

اصطلاحی معنی: علمائے فقہ میں ملا علی القاریؒ نے شرح قصیدہ آمالی میں اس کی تعریف یہ کی ہے:

التقلید: قبول قول الغير بلا دلیل۔ کسی غیر کی بات کو دلیل کے بغیر قبول کر لینا تقلید کہلاتا ہے۔

امام غزالیؒ نے کہا:

هو قبول قول بلا حجة کسی کی رائے کو بغیر دلیل کے قبول کرنا تقلید ہے۔

اور کسی نے کہا:

هو العمل بقول من ليس قوله إحدى الحجاج بلا حجة کسی شخص کے ایسے قول پر جو حجت نہ ہو بلا کسی دلیل کے عمل کرنا تقلید کہلاتا ہے۔

مقلد: کسی کی بات کو بغیر دلیل کے قبول کئے عمل کرنے والا شخص مقلد کہلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاریؒ نے تقلید شخصی کو ناجائز قرار دیتے ہوئے اس آیت کو دلیل بنایا: ولا تقف ما ليس لك به علم کہ جس چیز کے بارے میں تمہارے پاس علم ہی نہیں تو اس کے پیچھے مت پڑو۔ اس لئے کہ عمل سے قبل علم ضروری ہے۔ جب کہ مقلد بے علم ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی شخص کی بات کو صحیح یا غلط جانے بغیر ماننا درست نہیں۔ دین کے معاملے میں تو مزید احتیاط کرنا پڑتی ہے۔ مقلد جب قول امام پر عمل کرتا ہے تو اسے کچھ علم ہی نہیں ہوتا۔ کہ کیا غلط ہے اور کیا صحیح۔

تبصرہ: اس میں اب کوئی معقولیت ہے؟ کہ ایک مسلمان کو کسی امتی عالم یا فقیہ کے ساتھ ایسے الفاظ سے جوڑ دیا جائے جس میں اس کے شعور، شخصیت، احترام اور اشرف المخلوقات ہونے کا تصور ہی ختم ہو جائے؟ ایسا تو رسول اللہ ﷺ کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے نہیں چاہا۔ اور نہ آپ ﷺ نے چاہا۔ اگر کسی عالم یا فقیہ کے ساتھ کسی کو جوڑنا بھی تھا تو کوئی اور مناسب لفظ ہو سکتا تھا جس میں انسانی توقیر تو ہوتی۔ ہماری رائے ہے کہ اگر اس لفظ کا استعمال انسانی عزت، شرافت اور وقار کے مناسب حال ہوتا تو قرآن مجید میں یا رسول اکرم ﷺ کی زبان میں اس کا استعمال ضرور ملتا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ لفظ کے نامناسب مفہوم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے نہ قرآن مجید میں استعمال کیا ہے اور نہ رسول کریم ﷺ نے اپنی زبان میں، بلکہ اس جیسی اصطلاحات تو بقول شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ”خیر القرون“ کے بعد کی پیداوار ہیں۔

تقلید کی ابتداء: تقلید کی ابتداء کب اور کیسے ہوئی؟ اسے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے لفظوں میں ملاحظہ کیجئے۔ حضرت قدس سرہ فرماتے ہیں:

اعلم أن الناس كانوا قبل المائة الرابعة غير
مجمعين على التقليد الخالص لمذهب
واحد بعينه. (حجة الله البالغة: 1/ 120)

تمہارے علم میں یہ بات ہونی چاہئے کہ چوتھی صدی
ہجری سے بیشتر جملہ اہل اسلام کسی ایک معین مذہب
کی خالص تقلید پر نہ تھے۔

یعنی جناب رسالت ﷺ اصحاب کرامؓ، اور اسلاف کی ان ساری چار صدیوں میں موجودہ تفریق نہ تھی۔ سب قال اللہ و قال الرسول کے متلاشی اور اسی پر عمل پیرا تھے۔ بالفرض اگر تقلید کا جواز فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون اہل علم سے پوچھ لیا کرو اگر تمہیں علم نہ ہو۔ سے بھی لے لیا جائے جب کہ آیت میں اہل علم یعنی علماء کی بات کی گئی ہے نہ کہ ایک عالم کی۔ تو بھی سوال یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ سیدنا امام ابوحنیفہؒ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ امام مالکؒ ۹۳ھ میں پیدا ہوئے۔ امام شافعیؒ ۱۵۰ھ اور امام احمدؒ ۱۶۲ھ میں پیدا ہوئے۔ ان بزرگوں کی پیدائش سے قبل کے مسلمان اپنے آپ کو کیا کہلواتے تھے؟ اور وہ کس کی اقتداء کرتے تھے؟ خود یہ ائمہ کرام کس کی اقتداء کرتے تھے؟ اس اقتداء کو کیا کہا جاتا تھا؟ یہ الزام کہ اگر یہ اقتداء جسے تقلید کہا جاتا ہے، نہ کی جائے، تو آدمی خواہش کا غلام بن جاتا ہے۔ توفیق، مالکی، حنفی، شافعی اور حنبلی کی تمام معتبر کتب میں بے شمار مسئلے ایسے پائے جاتے ہیں جو ان ائمہ کرام اور ان کے عظیم شاگردوں کے مابین مختلف فیہ ہیں۔ یعنی شاگرد اپنے استاذ کی تقلید نہیں کرتا بلکہ اپنی مستقل رائے رکھتا ہے۔ ان کے بارے میں کیا رائے دی جائے؟ بتائیے یہ خواہش نفس ہے اور کیا ان شاگردان خاص نے اپنے استاذ محترم کے خلاف رائے دیکر کوئی جرم کیا ہے؟ اگر نہیں تو پھر یہ پابندی و ناراضگی کیوں؟

تقلید کا حکم: یہ بحث بھی فضول لگتی ہے کہ تقلید ضروری ہے یا نہیں۔ آپ مقلد ہیں یا غیر مقلد۔ علماء نے بنیادی طور پر شریعت میں تقلید کو مذموم بنایا ہے۔ کوئی مسلمان یہ حیثیت نہیں رکھتا کہ امت کے کسی بڑے عالم یا مجتہد کو یہ مقام دے دے کہ اس کی پیروی بے سوچ سمجھے شروع کر دی جائے؟ تقلید کا لفظ ہی دوسرے کے بارے میں تعصب پیدا کرتا ہے۔ مزید یہ کہ جن کی تقلید کی جا رہی ہے انہوں نے کب اور کہاں فرمایا ہے کہ میری تقلید کرو؟

تقلید کے بارے میں علماء دورائے رکھتے ہیں۔ جو فریق اس کو بالکل ناجائز سمجھتا ہے۔ وہ قرآنی آیات و احادیث رسول ﷺ کو پڑھ کر کپکپا اٹھتا ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے ہم کیسے اپنے آپ کو کسی بھی عالم یا مفتی کے حوالے کر دیں؟ اور اگر کرنا بھی ہے تو کیوں نہ رسول ﷺ ہی کے حوالے کریں؟ کیوں نہ ہم اطاعت و اتباع کے الفاظ و اصطلاحات کے استعمال پر فخر کریں جو اللہ تعالیٰ و رسول ﷺ نے ہمیں عطا کئے ہیں۔ جن کے معنی ہیں افعال و احکام میں اسوۃ رسول ﷺ کی فرمانبرداری۔ پھر یہ الفاظ صرف اللہ تعالیٰ و رسول ﷺ کیلئے مستعمل ہوئے ہیں۔ نہ کہ دوسروں کیلئے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ﴾
 ﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي﴾
 اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔
 آپ کہئے! اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری
 اتباع کرو۔

ان الفاظ کی اتنی زبردست اہمیت ہے کہ پچاس سے زائد مقامات پر قرآن مجید میں آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ و رسول ﷺ کی اطاعت و اتباع کا اس لئے کہا گیا ہے کہ دین خالص رہے اور اس میں کسی قسم کی ملاوٹ نہ ہونے پائے۔ مزید یہ کہ رسول معصوم ہوتا ہے اور غلطیوں سے مبرا بھی۔ کہاں رسول اور کہاں امت کا بڑا عالم؟ چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک۔ مزید یہ کہ کوئی اور رسول جیسا بننے کی کوشش نہ کرے کیوں کہ رسول کے علاوہ کوئی معصوم نہیں۔ دوسرے سے غلطی کا امکان ہے اور بلاشبہ اس سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ شاہ صاحبؒ دو لوگ الفاظ میں فرماتے ہیں:

إن آمنتم بنبيكم فاتبعوه خالف مذهبا أو وافقه. (تفهيمات 1/202)
 اگر تم اپنے نبی ﷺ پر ایمان لائے ہو تو پھر آپ ﷺ
 ہی کی اطاعت کرو خواہ وہ مذہب کے خلاف ہو یا
 موافق۔

تقلید کا لفظ اگر اچھا معنی دیتا یا کسی بھی انسان کی عزت و خودداری کے لئے بہتر ہوتا تو اس لفظ کے اللہ تعالیٰ و رسول ﷺ زیادہ حق دار تھے جب ان کے لئے مستعمل نہیں ہوا تو دوسروں کے لئے کیسے جائز ہو گیا کہ وہ کسی امتی یا عالم کے لئے ایسی اصطلاحات کو متعارف کرائیں جب کہ اس نے کہا بھی نہ ہو؟ اس لئے رسول ﷺ کی پیروی کے لئے یہ لفظ ہی پسند نہیں کیا گیا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ اس میں انسانی آزادی اور ذہنی اثر ان پر پابندی ہے۔ جب کہ دین اللہ و رسول کے ذریعے بھی یہ پابندی نہیں لگانا چاہتا۔ ﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ﴾ دین میں کوئی جبر نہیں۔ بلکہ تدبر اور تفکر کی دعوت دیتا ہے۔ مزید یہ کہ لفظ تقلید، شخصیت پرستی کے مفہوم کو اجاگر کرتا ہے جبکہ لفظ اطاعت و اتباع شخصیت پرستی کی جڑ کاٹتا ہے۔ اس لیے خود کو تبع رسول کہنا ہی زیادہ موزوں ہے۔
تقلید کے نتائج: چونکہ تقلید شخصیت پرستی کا نام ہے اس لئے جب شخصیات کو ایک دوسرے پر فوقیت دی جائے گی تو لامحالہ حب علیؑ اور بغض معاویہؓ کی کیفیت تو پیدا ہوگی۔ اس تقلید کی گرویدگی نے جو کام مسلمانوں سے کروائے وہ درج ذیل تھے:

وترى العامة سيما اليوم فى كل قطر
 يتقيدون بمذهب من مذاهب المتقدمين
 يرون خروج الإنسان من مذهب من قلده
 ولو فى مسألة كالخروج من الملة كأنه نبى
 بعث إليه وافترض طاعته عليه. وكان
 أوائل الأمة قبل المائة الرابعة غير متقيدين
 بمذهب واحد.
 ہر علاقہ کے عوام مروجہ مذاہب میں سے کسی ایک کی
 تقلید کرتے ہیں۔ ایک معمولی سے مسئلہ میں بھی تقلید
 سے آزاد ہو کر کسی کا سوچنا ان کے نزدیک ایسا ہے
 جیسا کہ کوئی ملت اسلامیہ سے نکل گیا ہو گویا ان کا امام
 ایک نبی مبعوث ہے جس کی اطاعت اس پر فرض
 ہے۔ ایک ہی مذہب کی پیروی کا یہ انداز قرون اولی
 میں نہیں تھا۔

یہ عبارت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تفہیمات ۱/۱۵۱ سے لی گئی ہے اصل دین کو اجاگر کرنے کی وہ کوشش جو شاہ صاحب مرحوم نے ایک تحریک کی صورت میں چلائی تھی افسوس ان کے معتقدین میں باقی نہ رہی۔

..... سلف صالحین کے طریقہ کار کو چھوڑ دیا گیا جنہیں قرآن کریم نے خود متعارف کرایا تھا کہ والسابقون الأولون من المهاجرين والأنصار والذين اتبعوهم بإحسان رضى الله عنهم ورضوا عنه (التوبة: 100) یعنی یہ تین قسم کے لوگ تھے۔ اولاً: مهاجرین میں سابقون الاولون ثانیاً: مهاجرین کے مددگار۔ انصار اور ثالثاً: وہ جو انہی کی احسن طریقے سے پیروی کرتے رہے۔ اور انہی کے منہج پہ چلتے رہے اور چلتے ہیں۔

..... ہم نے اپنے فقہاء کی دوسرے فقہاء پر برتری ثابت کی۔

..... انہیں معصوم قرار دے کر اپنے عقیدے کو خراب کیا۔

..... دوسرے فقیہ کو کم تر جانا۔

..... ان کے نام سے گروہ بندیاں کیں۔

پھر جو بھی نیک نتائج سامنے آئے وہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ کی زبانی سنئے:

فقہ کے مذاہب اربعہ جب مشخص و مدون ہو گئے اور تقلید شخصی کا التزام ہو گیا تو سوال پیدا ہوا کہ ان چاروں اماموں میں افضل کون ہے حضرت امام ابوحنیفہؒ یا حضرت امام شافعیؒ؟ اب بحث شروع ہوئی اور بحث نے جنگ و قتال کی شکل اختیار کی۔ چنانچہ ہلاکو خان کو اسلامی ممالک پر حملہ کی سب سے پہلی ترغیب خراسانیوں کے اسی جھگڑے سے ملی تھی۔ حنفیوں نے شافعیوں کی ضد میں آ کر بلاوا بھیجا اور شہر کے پھاٹک کھول دیئے۔ جب تاتاریوں کی تلوار چل گئی تو اس نے نہ شافعیوں کو چھوڑا نہ حنفیوں کو۔“ ﴿فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ وَكَانَ وَعْدًا مَفْعُولًا﴾ (ملخص ترجمان القرآن: 2/494)

گروہ بندیاں: ان کی تعداد تو اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم ہے مگر صرف اہل سنت میں اہل حدیث اور حنفی حضرات کے تفرقے کو ہی اگر دیکھا جائے تو بناؤ کی جگہ بگاڑ آخر تک پھیلتا ہوا نظر آتا ہے۔ اہل حدیث مختلف جماعتوں میں بٹ گئے۔ حنفی حضرات دیوبندی، بریلوی اور حنفی میں تقسیم ہو گئے۔ اس لئے کہ کچھ حنفی ایسے ہیں جو اپنے آپ کو دیوبندی اور بریلوی کہلوانا پسند نہیں کرتے۔ جن میں نامور مذہبی جماعتیں اور ان کے امراء شامل ہیں۔ پھر دیوبندی حضرات حیاتی اور مماتی کے عقیدے میں ایسے الجھے کہ ان میں واضح طور پر تقسیم ہو گئی۔ عقائد ہی بدل گئے۔ رسول اللہ ﷺ کو قبر میں زندہ ثابت کرنے کے لئے یہ تک مبالغہ کیا گیا کہ آپ ﷺ نے قبر مبارک سے ہاتھ نکال کر فلاں سے مصافحہ کیا۔ بریلوی حضرات تصوف کے ہی گرویدہ ٹھہرے، انہیں ذکر و وظائف کا ہر نیا طریقہ ایک نئے سلسلے کی طرف لے گیا جو بالآخر مفاخرت سلاسل پر جا کر نقشبندی، قادری، چشتی، سہروردی وغیرہ پر منتج ہوا۔ ان گروہ بندیوں میں ہر ایک کے الگ الگ امیر بنے، اپنی اپنی مساجد قائم ہوئیں اور مدارس بنے۔ اس تفریق کے ہوتے ہوئے یہ کہنا بھی بڑی عجیب بات ہوگی کہ چونکہ ہم مسلمانوں میں اکثریتی ہیں لہذا ہمارا ہی مذہب یا فقہ بہتر ہے۔

اسی طرح جب بھی کوئی نئی جماعت بنتی ہے اس کی کوئی نہ کوئی ایسی توجیہ پیش کی جاتی ہے جس سے نئی لیڈر شپ یا نئی جماعت کا جواز فراہم کیا جاسکے۔ اسلام میں کہیں بھی اور کسی بھی حیثیت سے یہ پسند نہیں کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت پر جماعت بنتی جائے اور یوں وہ افتراق در افتراق کا شکار ہوتے چلے جائیں۔ اگر حدیث میں یہ آیا ہے: لا جماعة إلا بإمرة..... جماعت امیر کے بغیر نہیں ہوتی۔ یعنی امراء نہیں ہوتے بلکہ ایک امیر ہوتا ہے۔ تو آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے: إذا بويع لخليفتين فاقتلوا الآخر منهما (مسلم)..... جب ایک امیر منتخب کر لیا جائے تو بعد والے کو قتل کر دو۔ خواہ وہ کتنا ہی نیک اور پارسا کیوں نہ ہو۔ کیونکہ وہ افتراق کا سبب بن رہا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کا پہلا امیر جب منتخب ہوگا تو بعد والے امیر اس حدیث کے بارے میں کیا کہیں گے؟

اس ضمن میں آپ کا یہ ارشاد بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ الامير الضعيف ملعون۔ (سنن بیہقی)..... کمزور امیر ملعون ہے۔ کچھ کر نہیں سکتا نہ ہی اس کا کوئی کہنا مانتا ہے تو کیوں وہ امارت کی کرسی سے چمٹ کر بیٹھا ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ کرسی چھوڑ دے تاکہ اہل لوگ آئیں اور دینی کام کو آگے بڑھائیں۔ اور یوں ان کی صلاحیتیں کام آئیں۔ یا اپنی جماعت کے جواز کے لئے ایک دلیل یہ بھی فراہم کی جاتی ہے: يد الله على الجماعة..... کہ اللہ کا جماعت پر ہاتھ ہوتا ہے۔ مگر اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہوتا ہے، جماعتوں پر نہیں۔

ہمیں اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان تمام فرقہ بندیوں سے توبہ کر کے قرآن مجید و سنت رسول ﷺ کی بنیاد پر ایک ہو جانا چاہئے۔ حکومت تمام مکتب فکر کے ان علماء پر مشتمل ایک اعلیٰ اختیاراتی بورڈ بنائے، جس کے ارکان غیر متعصب، دین دار اور معتدل مزاج ہوں، روادار ہوں، صحیح معنوں میں عالم ہوں

اور قدیم وجدید پر گہری نظر رکھتے ہوں۔ یہ سب ہر فرقہ سے فائدہ ضرور اٹھائیں مگر قرآن مجید و سنت رسول ﷺ کو زندہ کریں۔ یہ نہ اجتہاد کی دعوت ہے اور نہ مذاہب خمسہ کے خلاف علم بغاوت۔

مقلد و غیر مقلد؟ یہ سوال بھی کہ مقلد کون ہوتا ہے اور غیر مقلد کون؟ اس کا جواب صرف یہی ہے کہ یہ سب اصطلاحات رد عمل کے طور پر ابھری ہیں نہ کہ کسی قابل فخر جد و جہد کا ثمرہ ہیں۔ اب جواب ملاحظہ فرمائیے:

مقلد: وہ ہوتا ہے جو کسی بھی امام، یا مجتہد یا قائد کے افکار و نظریات کی روشنی میں قرآن و حدیث کو سمجھے۔ اور اسی امام یا مجتہد کی فکر کا پابند رہے اور اپنے آپ کو اسی کی طرف منسوب کرے۔

غیر مقلد: وہ ہوتا ہے جو ایسا نہ کرے۔ یہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔

۱۔ وہ غیر مقلد جو قرآن و حدیث کے ہوتے ہوئے کسی امام یا مجتہد کی فکر کا پابند نہ ہو۔ بلکہ اسلاف کا جو دین کو اخذ کرنے کا طریقہ کار رہا ہے اس کا بھی وہی معروف طریقہ ہو۔ قرآن مجید کے بعد صحیح حدیث ہی اس کا مرکز ہو۔ وہ اپنے آپ کو عالم کا مقلد نہیں کہلاتا بلکہ اس کی بات جو قرآن مجید یا صحیح حدیث رسول ﷺ سے ثابت ہے۔ اس کا متبع کہتا ہے۔ عوام کا تو یہ کام ہی نہیں کہ وہ اجتہاد کریں یہ تو علماء کا کام ہے کہ وہ دین کو اس کے اصل سرچشمہ سے لے کر انہیں دیانتداری سے بتائیں۔

۲۔ یہ غیر مقلد وہ ہوتا ہے جو نہ کسی امام یا مجتہد کی فکر کا پابند ہوتا ہے اور نہ ہی قرآن مجید و حدیث رسول ﷺ کو سمجھنے اور جاننے کے ثابت شدہ اصولوں کا۔ بلکہ اس کی اپنی ایک آزاد فکر ہوتی ہے اور نادر قسم کا اجتہاد اس سے اگلاتی ہے۔ جو سبیل المؤمنین نہیں ہوتا۔ وہ نصوص یعنی قرآن مجید و حدیث رسول ﷺ کے مفہوم کو بدلنے کے لیے لغت کا سہارا لیتا ہے۔ اور قرآنی تفسیر ہو یا حدیث رسول ان دونوں کے فہم میں اس کا طرز استدلال معروف تفسیری و حدیثی اصول و قواعد سے ہٹ کر ہوتا ہے تاکہ وہ دور کی کوئی کوڑی لاسکے جو تفسیری و حدیثی انحراف ہے۔

۷۔ فروعی مسائل: فقہ میں فروعیات پر مباحث بے شمار ہیں۔ جو ہر فقیہ کے دینی فہم کی عکاس ہیں۔ ان فروعیات کے بارے میں نہ مجتہد کوئی حتمی رائے دے پاتا ہے اور نہ ہی کوئی اور۔ مگر یہ ایک واضح بات ہے کہ فروعیات پر مجتہد کے کام نے اور استدلالی طریقہ کار نے سوچنے سمجھنے اور دلائل کو جاننے کا ذوق فقہ کے طالب علم میں ضرور پیدا کر دیا ہے۔ فروعیات وہ مخفی مگر زیادہ تر معمولی مسائل ہوتے ہیں جو آیات قرآنی و احادیث رسول ﷺ کو سامنے رکھ کر مستنبط (inference or deducing a somewhat hidden meaning from a given text) کئے جاتے ہیں۔ فقہی کتب کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کی تدوین تین انداز سے ہوئی۔

۱۔ مسئلہ اٹھنے کے بعد: مثلاً کسی نے نماز شروع کی۔ اور نماز میں کسی بات پر قہقہہ آ گیا۔ ایسی نماز کا کیا ہوگا کیا یہ نماز ٹوٹ گئی یا اسے اپنی نماز جاری رکھنی چاہئے؟ قرآن مجید کی آیات کی طرف دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ نماز میں خشوع و خضوع کے ساتھ کھڑے ہونے کا کہا گیا ہے۔ تو کسی فقیہ نے کہا کہ نماز جاتی رہی۔ دوسرے فقیہ کی نظر حدیث پر پڑی تو اس نے کہا کہ نماز نہیں بلکہ وضو بھی جاتا رہا۔ دلائل کو دیکھا گیا تو عقلی طور پر پہلے کی بات درست نظر آئی کیونکہ قہقہہ خشوع کی کیفیت سے مکمل متضاد کیفیت ہے اس لئے زیادہ سے زیادہ اس کی نماز ہی ٹوٹ گئی۔ دوسرے فقیہ کی دلیل یہ نظر آئی کہ کوئی نابینا جماعت میں شامل ہونے کے لئے صف کی طرف آرہے تھے کہ اچانک ہی ایک کھڑ جو راستہ میں تھا اس میں جا گرے۔ صحابہ کرامؓ جو آپ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے انہوں نے جب یہ منظر دیکھا تو نہ صرف ہنسی آئی بلکہ ان کے قہقہے نکل گئے۔ آپ ﷺ نے نماز کے بعد انہیں فرمایا: جاؤ تم لوگ دوبارہ اپنا وضو کرو۔ محدثین نے اس حدیث کو دیکھا تو درایت کے اعتبار سے جہاں یہ حدیث گئی گذری انہیں محسوس ہوئی وہاں نقلی اعتبار سے بھی انہوں نے اسے موضوع قرار دیا۔

۲۔ مسئلہ اٹھنے سے پہلے: ایسے فروعی مسائل میں یہ فرض کر لیا گیا کہ مستقبل میں اگر ایسا ہو جائے تو؟ مثال کے طور پر شادی شدہ خاتون کا شوہر لاپتہ ہو گیا۔

تلاش بسیار کے باوجود کچھ علم نہیں ہو سکا کہ وہ کہاں ہے؟ یا آیا وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے؟ سوال یہ اٹھایا گیا کہ ایسی عورت اب کیا کرے؟ آیا وہ انتظار کرے یا دوسری شادی کر لے؟ اگر وہ انتظار بھی کرتی ہے تو کب تک؟ کسی فقیہ نے کہا: گم شدہ خاوند اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی نہیں کرائی جائے گی۔ ہاں جب اس پر ایک سو بیس سال گزر جائیں گے تو اس کی موت کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔ اس کی تائید میں انہوں نے یہ دلیل پیش کی: وَلَنَا قَوْلُهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: امْرَأَةُ الْمَفْقُودِ امْرَأَتُهُ حَتَّى يَأْتِيَهَا الْبَيَانُ۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: مفقود کی بیوی اسی کی بیوی ہے جب تک کہ اس کی موت کا پروانہ نہیں آتا۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ انسان کی طبعی عمر اتنی ہی ہو سکتی ہے اس دوران اگر وہ آگیا تو خیر ورنہ وہ عورت عدت گزارے گی بعد از عدت جہاں چاہے وہ شادی کر سکتی ہے۔ اس فرعی مسئلے کی دلیل کو دیکھا گیا تو محدثانہ اعتبار سے نہ صرف ضعیف منکر و باطل نظر آئی بلکہ امام العینیؒ نے العنایہ میں اس حدیث کو دلیل بنانے پر سر پکڑا ہے۔ اور شیخ عبدالحی لکھنویؒ نے اس حدیث کو بطور دلیل پیش کرنے پر کہا ہے کہ ایسے لوگوں کا جب یہ میدان ہی نہیں تو اتنی خامہ فرسائی کیوں؟

اس فتوے کے بارے میں ہمارا حسن ظن یہی ہے جس فقیہ نے بھی یہ فتویٰ دیا اس کا علم و فضل، زہد و تقویٰ، دقت نظر، وسعت ادراک، اسلام اور اس کے مصالح کے متعلق اس کے گہرے احساسات، امت اسلامیہ کے نزدیک ایک مسلمہ حقیقت ہیں۔ لیکن معلوم نہیں کیا حالات تھے؟ یا کیا اصل صورت حال تھی جو اس عظیم فقیہ نے اس وقت اپنی صواب دید کے مطابق فتوے کی شکل میں اپنی رائے دی۔ بہر حال وہ اپنے اجتہاد میں مخلص تھے۔ درست اور صحیح تھے۔ ان کا اجتہاد اگر صحیح بھی نہیں تو بھی اللہ تعالیٰ انہیں اجر و ثواب سے از روئے حدیث محروم نہیں فرمائے گا۔

دوسرے فقیہ نے اس مسئلہ میں اپنی اجتہادی رائے یہ دی کہ آیات و احادیث میں تو ایسے مسئلے کی چونکہ وضاحت نہیں ملتی ہاں جناب امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ اجتہادی فیصلہ ہے کہ عورت کے صبر اور خاوند کے بیوی سے دوری پر صبر کی مدت زیادہ سے زیادہ چار سال ہو سکتی ہے اس لئے وہ چار سال تک انتظار کر لے بصورت دیگر وہ عدت گزار کر شادی کر لے۔ اس رائے سے نہ صرف ام المؤمنین جنابہ حفصہؓ کا اتفاق ہے بلکہ جناب عثمان، ابن مسعود، ابن عمر، ابن عباسؓ کا بھی اتفاق ہے۔ پھر امام مالکؒ نے نہ صرف مؤطا میں اس کی تائید کی بلکہ دیگر ائمہ امام شافعی و امام اوزاعی نے بھی اسی مسئلہ کو قبول کرنے کی نصیحت کی ہے۔

لیکن یہ سوال بھی قابل غور ہے کہ اگر جوان عورت کے لئے چار سال کا عرصہ ناقابل برداشت ہے تو وہ کیا کرے؟ اُس زمانہ میں تو دینی بیداری تھی۔ خدا خونی تھی۔ آج کا دور تو فتنوں کا دور ہے۔ خدا نخواستہ کسی غلط رجحان کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ حج اپنی صواب دید پر خاتون کے حالات اور عمر کے تقاضوں کا صحیح اندازہ کر کے جلدی فیصلہ کر دے؟ آخر مجاہدین کو بھی سیدنا فاروق اعظمؓ نے چار ماہ بعد چھٹی کر کے گھر آنے کی اجازت بھی تو مرحمت فرمائی تھی۔

۳۔ ذاتی رائے اور فرعی مسئلہ: بعض فروعی مسائل محض اپنے خیال و تجربہ کی بناء پر حکمت سمجھ کر بیان کئے گئے کہ شاید لوگ اس طرح نیکی کی طرف مائل ہوں اور برائیوں سے اجتناب کرنے لگ جائیں۔ مثال کے طور پر ایک مسلمان عمر بھر نماز نہیں پڑھتا۔ آخری عمر میں اسے خیال آتا ہے کہ نماز پڑھنی چاہئے۔ اب وہ اپنی گذشتہ ترک کی ہوئی نمازوں کا کیا کرے؟ کسی عالم یا فقیہ نے کہا کہ وہ قضاء عمری دے یعنی وہ اپنی چھوڑی ہوئی نمازوں کی قضاء دے اور طریقہ یہ بتایا کہ اپنی ہر نماز کے ساتھ وہ ایک گذشتہ نماز پڑھتا جائے۔ اور اگر مر گیا ہے تو اپنی ان نمازوں کا فدیہ دے جو فی نماز تقریباً پچیس روپے ہیں۔ کسی اور فقیہ نے کہا کہ قضائے عمری کا ہماری کتب فقہ میں ذکر ہی نہیں ہاں فوت شدہ نمازوں کی قضاء کا تو ذکر ہے مگر وہ بھی قلت و کثرت کو سامنے رکھ کر قضاء و عدم قضاء کا کہا جائے گا۔ مثلاً:

یعنی بے ہوش کی پانچ نمازیں یا کم رہ جائیں تو وہ ہوش میں آنے کے بعد ان کی قضاء دے دے گا اور اگر زیادہ رہ گئیں تو ان کی قضاء نہیں۔

من أغمى عليه خمس صلوات فما دونها
قضاها إذا صح، فإن فاتته بالإغماء أكثر من
ذلك لم يقض.....

اس کی وجہ دوسرے فقیہ نے یہ بتائی کہ یہ ایک اصول ہے کہ جب مدت مختصر ہو تو اس کی قضاء میں حرج یعنی تکلیف نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے جیسے سوئے ہوئے کے لئے نماز قضاء پڑھنا اس لئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک دن سو لے گا مگر جب مدت طویل ہو تو پھر ایسی قضاء باعث حرج ہوتی ہے۔ جیسے حائضہ عورت کی نماز، اگر وہ حیض سے فراغت کے بعد اپنی نمازوں کی قضاء دیتی تو اس کے لئے باعث حرج تھا اس لئے وہاں قضاء کی بات ہی نہیں۔ (دیکھئے: اللباب فی شرح الکتاب، آخر باب صلاة المريض، ج ۱، ص ۱۰۱، مؤلف شیخ عبدالغنی المیدانی)

فقیہ نے یہ بھی کہا: فقہاء و محدثین کے ہاں ایسے نام نہیں پائے جاتے اور نہ ہی ان کا یہ طرز عمل ہے کہ بات ہو فوت شدہ نمازوں کی اور قیاس کرتے ہوئے انہوں نے اسے قضاء عمری کا نام دیا ہو۔ محدثین کرام نے بے شمار مسائل احادیث سے مستنبط (Deduce) کر کے ابواب سازی (Headings) کی ہے۔ مگر کسی محدث نے قضاء المتروکات کا باب (Heading) نہیں باندھا۔ ہاں ایک موضوع حدیث ضرور ملتی ہے جس میں یہ نام مستعمل ہے۔ مگر محدثین میں یا چاروں فقہاء میں سے کسی نے کسی کتاب میں اس نام کی نماز کا تذکرہ تک نہیں کیا۔ المختصر قدوری جو فقہ حنفی کی ایک اساسی و بنیادی کتاب ہے اس میں باب قضاء الفوائت کے حاشیہ نمبر تین میں قضاء الفوائت اور دوسری نمازوں کے درمیان ایک اور باریک فرق بتایا گیا ہے جو اہل علم کیلئے قابل غور ہے:

”إنما قال قضاء الفوائت ولم يقل قضاء المتروکات لأن الظاهر من حال المسلم أنه لا يترك الصلاة عمدا بل تفوته باعتبار غفلة ونوم ونسيان“

مؤلف نے قضاء الفوائت کہا ہے نہ کہ: قضاء المتروکات یعنی چھوڑی ہوئی نمازیں۔ کیونکہ مسلمان بظاہر نماز کو جان بوجھ کر ترک نہیں کیا کرتا بلکہ اس سے غفلت، نیند یا بھول کی وجہ سے نماز چھوٹ جایا کرتی ہے۔

رہا قضاء عمری کا فدیہ تو اولاً تو کسی حدیث میں اس کا ثبوت ہی نہیں بلکہ لا کفارة إلا ذلك میں بھی آپ ﷺ نے فوت شدہ نماز کے بارے میں یہی فرمایا کہ جب اسے یاد آ جائے وہ اسی وقت فوت شدہ نماز کو پڑھ لے اس کا کفارہ ہی یہی ہے۔ دیگر یہ کہ کسی قابل ذکر فقیہ یا امام نے اس کی تائید ہی نہیں کی جو شذوذ ہے۔ مزید یہ کہ فدیہ کے تعین پر بھی اتفاق نہیں کہ وہ کتنا ہو؟ نماز کی قضاء پر تو ہمارا اتنا اصرار ہو آخرا یہاں بھی تو ہوتا ہے کہ ایک مسلمان مال دار ہوتے ہوئے زکوٰۃ ادا نہیں کرتا۔ کیا اس کی بھی کوئی قضاء عمری ہے؟ وغیرہ۔

فقہاء کے ان فروعی مسائل کے بارے میں ان کے خلوص و تقویٰ پر شک کئے بغیر ہمیں ہمیشہ یہ حدیث پاک سامنے رکھنی چاہئے کہ المجتہد قد یخطئ ویصیب فإن أصاب فله أجران وإن أخطأ فله أجر واحد۔ مجتہد خواہ وہ امام ہو یا فقیہ، اپنے اجتہاد میں کبھی خطا بھی کر سکتا ہے اور کبھی نہیں کرتا۔ اگر اس کا اجتہاد درست ہو تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں دوہرا اجر ہے اور اگر خدا نخواستہ اس کے اجتہاد میں خطا ہوئی ہے تو پھر بھی اس کے لئے ایک اجر ضرور ہے۔ ان فروعی مسائل میں صحابہؓ و تابعینؓ اور ائمہ فقہاء کے بھی مختلف اقوال و فتاویٰ ہو سکتے ہیں اور ہیں۔ ظاہر ہے سب پر بیک وقت عمل ناممکن ہے۔ اس لئے ان پر عمل کے لئے چند جانچنے کے اصول ہیں جو ہمارے پیش نظر ہیں:

فروعی مسائل جانچنے کے اصول

- ۱۔ قرآن مجید اور صحیح و حسن احادیث کے مخالف وہ فتویٰ یا اجتہاد نہ ہو۔
- ۲۔ وہ فروعی مسئلہ قرآن مجید اور صحیح و حسن حدیث میں نہ ہو۔
- ۳۔ اکثر صحابہ و تابعین اور ائمہ کرام کا اس پر اتفاق ہو۔
- ۴۔ اقوال ائمہ و فقہاء میں سے عادل فقیہ کا صحیح ترین قول لے لیا جائے۔

فروعات کا صحیح منہج اور معیار دیکھنا ہو تو کتب حدیث کی وہ فہارس ملاحظہ فرمائیے جو ابواب میں مزین کر دی گئی ہیں۔ یہ وہ فروعات ہیں جو ہر مؤلف کے دور میں اٹھے جن کا حل واضح اور صحیح نصوص سے پیش کیا گیا۔ شاہ صاحبؒ تفہیمات ۲/۲۴۰ میں لکھتے ہیں:

در فرع پیروی علماء محدثین کہ جامع باشند میان فقہ و حدیث کردن۔
و دائماً تفریعات فقہیہ را بر کتاب و سنت عرض نمودن و آنچه موافق باشد در حیز قبول آوردن والا کلائی بد یرش خاوند دادن۔ امت را ہیچ وقت از عرض مجتہدات بر کتاب و سنت استغناء حاصل نیست و سخن متقشفہ فقہاء کہ تقلید عالمی را دستاویز ساختہ تبع سنت را ترک کردہ اند۔ نہ شنیدن و بدیشان التفات نہ کردن و قربت خدا جستن بدوری اینان۔

فروع میں علماء محدثین جن کی فقہ حدیث دونوں پر نظر ہو۔ کی پیروی کرنا۔ فقہ کے فروعی مسائل کو ہمیشہ کتاب و سنت پر پیش کرنا، جو ان کے موافق ہو اسے قبول کرنا اور جو مخالف ہو اسے رد کر دینا چاہئے۔ امت کو اپنے اجتہادی مسائل کتاب و سنت پر پیش کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں متقشف فقہاء کی بات قطعاً نہ سنے۔ جن لوگوں نے اہل علم کی تقلید کر کے کتاب و سنت کو ترک کر دیا ہے ان کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھے۔ ان سے دور رہ کر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرے۔

نتیجہ: درجہ بالا تجزیہ سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ یہ سب خود ساختہ (Fabricated) واقعات و حادثات ہیں۔ جنہیں علمائے احناف نے بھی قطعاً پسند نہیں فرمایا۔ اس غلو نے جو انتہائی رنگ دکھایا اور جسے لغزش ہی کہا جاسکتا ہے کہ ائمہ کی محبت نے اور اپنے اساتذہ اور بزرگوں کی عقیدت نے مخالفین پر تنقید کی راہیں کھول دیں۔ اور ایک دوسرے کے علم و فہم پر حملے ہونے لگے۔ احناف نے امام شافعیؒ کے علم و فضل سے متعلق ایسے الفاظ استعمال کئے جو حضرت امام شافعیؒ کے مقام کے لحاظ سے قطعاً نامناسب تھے۔ اسی طرح امام ابو حنیفہؒ کے علم و فضل پر دوسری جانب سے حرف گیری کی گئی۔ جس سے امام ابو حنیفہؒ کا مقام کہیں بلند تھا۔ ماکلیوں اور حنبلیوں میں بھی بعض اہل علم اس حرف گیری سے نہ بچ سکے۔ انہی جھگڑوں میں اپنی ساکھ بحال رکھنے کے لئے احادیث تک گھڑ لی گئیں اور کچھ پختہ اصول بھی ایسے بنا دیے گئے جس میں یہ کہہ دیا گیا کہ اگر قرآن کی کوئی آیت یا حدیث رسول ہمارے امام محترم کے قول کے مخالف ہوگی تو اس کی کچھ نہ کچھ تاویل ہوگی۔ اسلام کی واضح صورت ان اختلافات کی نذر ہوگئی اور ہمارے یہاں یہ پنپ نہ سکا۔

فقہ اسلامی کے محاسن:

۱۔ دین و دنیا: شریعت میں دین و دنیا دونوں کے احکام نازل فرمائے گئے۔ فقہ اسلامی اس اعتبار سے مالا مال ہے کہ جناب رسالت مآب ﷺ کی ذات گرامی نے اپنی حیات طیبہ میں دین و دنیا دونوں کے بارے میں بے شمار فقہی احکامات ارشاد فرمائے۔ حدیث و فقہ کا لٹریچر ان دونوں موضوعات کو زیر بحث لاتا ہے۔ عبادات اور معاملات دونوں موضوعات فقہ اسلامی کا حصہ ہیں۔ ان کے علم کا حصول دونوں دینیہ میں شمار ہوتے ہیں۔

۲۔ فقہی برکتیں: معاملات کو چلانے میں اسلام کے آفاقی اصول، اس کے مصادر قرآن و سنت اگر پیش نظر رہیں اور ان کو بغیر کسی تاثر و تاثیر کے مناسب تفسیر و اجتہاد سے نمٹایا جائے تو اسلامی فقہ کی برکتیں اسی طرح آج بھی نمایاں طور پر سامنے آسکتی ہیں۔ جس طرح قرون اولیٰ میں یہ سب کچھ دیکھا گیا۔ ان برکتوں کے مظاہر میں ہم دیکھتے ہیں کہ:

ائمہ اربعہ کے علاوہ بہت سے دیگر فقہاء بھی ہیں جنہوں نے اپنی اپنی مصطلحات، قاعدے، اصول اور استنباطات واجتہادات پیش کئے ہیں۔ یہی وہ بنیادی محاسن ہیں جو فقہ اسلامی کے ہیں کہ اس نے ہر باشعور، معتدل مزاج اور ماہر علم کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی جس نے اپنے فہم اور عقل سلیم کے ذریعے دین پر نہ صرف تدبیر کیا بلکہ غور و خوض کر کے نئی نئی فقہی، اصطلاحی اور استدلالی راہیں نکالیں۔

۳۔ دین میں توسع: فقہی کاوشوں کا مطالعہ یہی باور کراتا ہے کہ بذات خود دین میں بہت توسع ہے اور دین اپنی خدمت کے لئے معتدل سوچ کو کھپانے کا اہتمام ہر دور میں کرتا آیا ہے۔ اسی نعمت کو پا کر دین ہر دور میں سرخرو ہوا اور مسلمان فقہاء نے حالات، درپیش چیلینجز کا مقابلہ اجتہاد اور غور و فکر سے آخر کر ہی ڈالا۔ اس کی وسعت کا اندازہ صرف اس فقہی لٹریچر کو دیکھ کر ہو سکتا ہے جس میں مفروضہ مسائل نہیں۔

۴۔ مجتہد معصوم نہیں: فقہ اسلامی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے اسلام کے چشمہ صافی قرآن مجید و سنت رسول ﷺ سے سیراب ہونا سیکھا ہے جس کا دینے والا اللہ وحدہ لا شریک لہ ہے۔ اہل اسلام کو متحد و متفق رکھنے کے لئے جو سرمایہ اطاعت و اتباع دیا وہ رسول اکرم ﷺ کی ذات بابرکات ہے۔ شریعت اور اس کے فہم میں اطاعت و اتباع اپنے آخری رسول ﷺ کی کرائی گئی ہے۔ تاکہ استنباط واجتہاد میں اختلاف رائے کو اتباع رسول سے ختم کر دیا جائے۔ جو ایمان کا لازمہ ہے۔ آپ ﷺ کے علاوہ شریعت میں کسی اور کو معصوم قرار نہیں دیا۔ اور نہ ہی کسی کو اس کی اجازت دی ہے کہ اپنی طرف سے کسی کو معصوم قرار دے۔ اس لئے فقہی اختلافات میں کسی عالم، مجتہد یا امام وغیرہ کو معصوم نہیں گردانا جاسکتا۔ اجتہادی مسائل میں مجتہدین کرام کے اپنے علمی ظرف اور بصیرت میں نمایاں فرق ہوتا ہے اور اختلاف رائے بھی۔ ان آراء کو پڑھنے کے بعد کسی نہ کسی مجتہد کی کسی خاص پہلو میں لاعلمی، غلطی، خطا کا علم ہو جاتا ہے لہذا مجتہد سے غلطی ہونے کا امکان ہے۔ جب کہ فقہ اسلامی میں فقہائے کرام کی کثرت رائے سے خیر کہیں نہ کہیں مل جاتا ہے۔

۵۔ ضرورت اجتہاد: ائمہ اسلاف کی تاریخ اور ان کے فقہی مناجح کو بغور پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شروع شروع میں فقہاء کا فقہی مسلک یہ تھا کہ اجتہادی امور میں تقلید اور جمود کو پنپنے کا موقع ہی نہ دیا جائے بلکہ صحابہ کرام اور ائمہ اسلام کے اجتہادات سے وقتی مصلحتوں کے مطابق فائدہ اٹھایا جائے۔ اور فقہی فروع میں جمود اور فرقہ پرستی کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ بس اصل نظر کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ پر ہی مرکوز رہے۔ اسلاف کو کتاب و سنت میں اگر کسی مسئلہ یا وقتی حادثہ کے متعلق صراحت نہ ملتی تو اس کا فیصلہ محض شخصی رائے کے مطابق نہ کرتے۔ کسی علاقہ کے علماء نے اپنے مخصوص حالات و اذکار کو امت پر زبردستی مسلط نہیں کیا۔ بلکہ صحابہ کرامؓ اور اسلاف کی وسعت نظر پر حاضر فقہاء کی نگاہ رہی اور یہی اصل ہدف رہا۔ جمود اور شخصیت پرستی سے انہوں نے امت پر تنگی اور مشکل پیدا نہیں کی۔

نیز جب نصوص نہ ہوں اور کتاب و سنت سے نئے مسائل کا حل صراحتاً نہ ملے تو پھر اجتہاد کے سوا چارہ نہیں۔ صحابہ کرامؓ نے بھی اجتہاد فرمایا، ائمہ اربعہ اور دیگر ائمہ مجتہدین نے بھی بوقت ضرورت اجتہاد سے کام لیا۔ لہذا آج بھی اہم معاملات و مسائل کو اجتہاد ہی کے ذریعے سمجھنے اور حل کرنے کی کوشش ہونی چاہئے۔ محدثین و فقہاء کرام کا یہی مسلک تھا۔

فقہ اسلامی کی قبولیت کی چند شرائط

یہ وہ شرائط ہیں جن سے نہ صرف فقہ اسلامی کی صحیح پہچان ہوتی ہے بلکہ اس کی ثقاہت و متانت اور شرع سے ہٹے ہوئے مسائل کا بھی ادراک ہوتا ہے۔ فقہ چونکہ ایک فرعی مسئلہ کو دلیل سے بیان کرنے کا نام ہے اس لئے علمی ثقاہت ہی اجتہادی کوشش کی بنیاد ہوگی۔ اور اسی کو اولین حیثیت حاصل ہوگی۔ اس لئے وہ اجتہادات جو دلائل سے مزین نہیں ان کی عدم قبولیت پر ہی اجماع ہے۔ فقہاء کرام کے اجتہادات میں دلائل دیکھنا اور تلاش کرنا ان کے فقہی مرتبے اور علمی شان کو دوبالا کر دے گا۔ اور صحیح مدلل فقہی مسائل امت میں خیر کا باعث بنیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بالکل درست ہے:

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ
تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ۝

اس پر جھوٹ کا حملہ نہ آگے سے ہو سکتا ہے اور نہ پیچھے سے یہ دانا و خوبیوں والے اللہ کی نازل کردہ ہے۔

(حم السجده: 42)

آپ ﷺ کا بھی ارشاد ہے:

قد تركتكم على البيضاء، ليلها كنهارها، لا يزيغ عنها بعدى إلا هالك .
میں تمہیں ایک واضح اور روشن دین دے کر جا رہا ہوں جس کی رات بھی اس کے دن کی مانند ہے اس سے پھرنے والا ہی میرے بعد ہلاک ہوگا۔ کتاب السنۃ

لابن ابی عاصم: ۳۳

اس لئے معتدل رویہ یہی ہونا چاہئے کہ جن مسائل و استنباطات پر علماء و فقہاء کی کثرت نے دلائل سے نکیر فرمائی ہے انہیں ترک کر دیا جائے اور جو فقہی مسئلہ دلائل کی بنیاد پر بیان فرمایا ہے اسے قبول کر کے اختلاف کو ختم کر دیا جائے۔ یہ وہ ضابطے ہیں جو قرآن مجید نے ہمیں عطا کئے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

... فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا (النساء: 59)

پھر اگر تم کسی مسئلہ میں اختلاف کرنے لگو تو اگر تم اللہ تعالیٰ پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا لے جاؤ۔ ایسا کرنا

ہی خیر ہے اور انجام کے لحاظ سے بہتر ہے۔

۱۔ اطاعت و اتباع: قرآن مجید نے اپنی وضاحت، اللہ تعالیٰ کی عبادت، احکام شریعت پر عمل اور اس کے صحیح فہم کے لئے رسول اکرم ﷺ کی اطاعت و اتباع کرنے کا مطالبہ تقریباً چالیس سے زائد مقامات پر کیا ہے۔ اطاعت کا مطلب یہ ہے کہ وہ احکام و عقائد جو جناب رسالت مآب ﷺ ایک مسلمان کو ارشاد فرمائیں تو مسلمان تسلیم و رضا کا پیکر بن کر نہ صرف دل و جان سے انہیں مانے بلکہ ان پر عمل بھی کرے۔ جب کہ اتباع کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے احکامات کو قبول کرنے کے علاوہ جو آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کے نمایاں خدوخال تھے انہیں بھی حرز جاں بنائے۔ تاکہ مسلمان رنگ و نسل، علاقہ و عادات کی تمیز کے بغیر ایک ہی کلچر اور تہذیب میں رنگے جائیں اور اسی کے خوگر رہیں۔ اطاعت کا مطالبہ اس لئے بھی ہے کہ آپ ﷺ کی رسالت دراصل دینی سیادت کا نام ہے اس کی راہنمائی میں آپ ﷺ کا کوئی شریک و سہم نہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے علاوہ ہم کسی اور کی عصمت کا اعتقاد بھی نہیں رکھ سکتے۔ اطاعت و اتباع کے یہ دونوں لفظ یا تو اللہ تعالیٰ کے لئے مستعمل ہوتے ہیں یا پھر ہادی برحق رسول اکرم ﷺ کے لئے ان الفاظ میں پیروی ایمان، محبت اور یقین کامل سے کرائی گئی ہے۔ جس میں جبر کا مفہوم نہیں۔ اطاعت رسول کا آسان ترین نسخہ یہ ہے کہ اپنے تمام تر میلانات کو آدمی ذہن سے نکال کر اگر سیرت رسول

ﷺ اور احادیث رسول ﷺ کا مطالعہ کرے تو خود بخود یہ جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ مزید یہ کہ فقہی اختلاف کی صورت میں مسلمان صحیح حدیث کو ہی بہر حال ترجیح دیتا ہے۔

تقلید کا لفظ اس کا بدل نہیں اور نہ ہی اس کا استعمال کوئی شرعی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک عام مسلمان اسے صلوٰۃ، صیام اور زکوٰۃ کی طرح ایک شرعی اصطلاح سمجھتا ہے جب کہ یہ ایک مذہبی اصطلاح ہے جو بہت بعد میں ایجاد کی گئی۔ لہذا مقلد یا غیر مقلد یا تقلید جیسے الفاظ کی بجائے ایک بندہ مومن اپنے لئے لفظ اطاعت یا اتباع کے استعمال کو معمول بنائے۔ کیونکہ اتباع میں بات دلیل سے ہوتی ہے اور تقلید میں بغیر دلیل کے۔

۲۔ صحیح حدیث: ائمہ اربعہ کا رجحان: اسلامی فقہ کا خوگر بننے کے لئے شرعی تقاضا یہ بھی ہے کہ ایک مسلمان کو جب حدیث رسول ﷺ مل جائے یا وہ اس کے سامنے آجائے تو پھر فقہی مسئلہ حدیث رسول ﷺ سے لے اور ہر قسم کے میلانات و گفتگو ترک کر دے۔ کیونکہ حدیث رسول ﷺ کا تعلق کسی مسلک سے نہیں بلکہ یہ تو سب مسالک کی مشترکہ دولت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہر مسلک نے اپنے ذوق اور فہم کی بنیاد پر چند احادیث کا انتخاب کر کے اپنی راہ متعین کی ہے۔ اس لئے ہماری رائے میں چند نہیں بلکہ تمام احادیث سے مستفید ہونا ضروری ہے تاکہ مسالک و مذاہب کا اختلاف اپنی اپنی خواہش کے مطابق نہ رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر فقہاء کرام کے فقہی مسائل اور اجتہادات و استنباطات ان کے بتائے ہوئے اصولوں پر ہی پرکھ لئے جائیں تب بھی ایک اصولی بات ضرور واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ یہ مسئلہ ان ائمہ کرام کے ہاں بھی اجماعی ہے۔ کہ اگر صحیح حدیث مل جائے تو وہ خود کیا بلکہ تمام صحابہ کرام کے لئے لازمی ہوگا کہ وہ صرف اسے ہی قابل عمل سمجھیں اور اپنے اپنے اجتہادات کی طرف مت دیکھیں۔

امام ابو حنیفہ کا نقطہ نظر: امام محترم فرماتے ہیں:

حرام علی من لم یعرف دلیلی أن یفتی
بکلامی۔
جسے میرے اجتہاد و استنباط کی دلیل (قرآن و حدیث سے) معلوم نہ ہو اس کے لئے حرام ہے کہ میرے کلام سے فتویٰ دے۔ میزان شرعی: ۳۸

در مختار میں ہے:

إذا صح الحدیث فهو مذهبی إن توجه لكم
دلیل فقولوا به۔
میرے قول یا اجتہاد کے مقابلے میں جب کوئی صحیح حدیث آجائے تو میرا مذہب بھی وہی ہوگا۔ اگر تمہیں کوئی دلیل قرآن و حدیث سے مل جائے تو اسی پر عمل کرو اور اسی کے مطابق فتویٰ دیا کرو۔ ج ۱ ص ۵۰

امام مالک کا نقطہ نظر: اپنے بارے میں ان کا یہ قول بہت مشہور ہے۔

إنما أنا بشر أخطئ وأصيب فانظروا فی رأیی
فكل ما وافق الكتاب والسنة فخذوه وکل
ما لم یوافق فاتر کوہ۔
لوگو! میں ایک انسان ہوں کبھی میری بات ٹھیک ہوتی ہے اور کبھی غلط۔ تم میری اس بات کو لے لو جو کتاب و سنت کے مطابق ہو اور جو اس کے خلاف ہو اسے چھوڑ

دو۔ ایقاظہم: ۱۰۲

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نقل فرماتے ہیں:

ما من أحد إلا وما أخذ من كلامه ومردود
عليه إلا رسول الله ﷺ .
دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں کہ اس کی تمام باتیں قبول
کی جاسکیں سوائے جناب رسالت مآب ﷺ کے۔

(الإنصاف: 13 عقد الجيد: 80)

امام شافعی کا نقطہ نظر: صحیح حدیث کے بارے میں امام شافعی کا قول یہ ہے:

إذا صح الحديث فهو مذهبي، وإذا رأيتم كلامي يخالف الحديث فاعملوا بالحديث واضربوا كلامي الحائط. (عقد الجيد: 81)	صحیح حدیث ہی میرا مذہب ہے۔ جب تم میرے اجتہاد و استنباط کو حدیث کے خلاف پاؤ تو حدیث پر عمل کرو اور میرے قول کو دیوار پر دے مارو۔
---	---

امام احمد کا نقطہ نظر: امام اہل السنۃ ہیں مگر پھر بھی فرماتے ہیں:

ليس لأحد مع الله ورسوله كلام.
(عقد الجيد: 81)
اللہ اور اس کے رسول کے مقابلے میں کسی کا کلام کوئی
حقیقت نہیں رکھتا۔

ان کا یہ ارشاد بھی ہے:

لا تقلدوني ولا تقلدنا مالكا ولا الأوزاعي
ولا الثوري، وخذوا الأحكام من حيث
أخذوا من الكتاب والسنة. (عقد الجيد: ٨١)
خبردار! کبھی میری تقلید نہ کرنا اور نہ امام مالک کی، نہ
اوزاعی اور نہ ثوری کی بلکہ جہاں سے یہ بزرگ احکام
لیا کرتے تھے وہیں سے تم بھی لیا کرو۔ یعنی قرآن
و حدیث سے۔

یہ بیانات ائمہ کرام کی طرف سے اعلان عام ہیں کہ لوگوں کی طرف سے عائد کردہ یہ تقلیدی روش اور اس کی دعوت ہمارا منشأ نہیں اور نہ ہی ہم اس کے داعی
ہیں۔ ان کے نزدیک حدیث صحیح ہی ایک سپریم لاء کی حیثیت رکھتی ہے جس نے فقہی مسائل کو نہ صرف حل کیا ہے بلکہ ان کے حل کا راستہ بھی دکھا دیا ہے۔ یہی
وجہ ہے کہ سب علماء و فقہاء کا اس کی اس حیثیت پر اجماع و اتفاق بھی ہے۔

غیر واقع مسائل سے اجتناب: انسانی مسائل کی چونکہ حدود متعین نہیں ہیں بلکہ وقتاً فوقتاً یہ پیش آتے رہتے ہیں مثلاً کلوننگ، تبدیلی اعضاء وغیرہ۔ اس لئے
ان کے حل کے لئے شریعت کی طرف ہی رجوع کرنا پڑتا ہے۔ البتہ یہ سوال بر محل ہے کہ کیا مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے مسائل کا ابھی سے ادراک
کر کے، ان کا فقہی حل تلاش کر لیا جائے۔ کیا ایسا کرنا صحیح ہوگا؟ اس بارے میں عموماً دو آراء سامنے آتی ہیں:

۱۔ پہلی رائے کے مطابق اگر ان مسائل کا ادراک فقہاء و علماء کر لیں تو انہیں زیر بحث لانے اور ان کا حل پیش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس لئے کہ علم
روز بروز زوال پذیر ہے۔ علماء و فقہاء رخصت ہو رہے ہیں ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں ایسے علماء پیدا نہ ہوں جو اس قابل ہوں کہ فقہی استنباط کر سکیں اس لئے
موجود فقہاء اگر لو کان کی بنیاد پر مفروضہ مسائل کا حل پیش کر دیں تو یہ امت پر بڑا احسان ہوگا اور ان کے آسمان علم سے دنیا مستفید ہوگی۔

۲۔ دوسری رائے یہ ہے کہ جب تک انسانوں میں وہ مسئلہ پیدا نہ ہو اس وقت تک اس تکلف کی ضرورت ہی نہیں کہ کوئی رائے دی جائے اور فرضی مسائل
بنائے جائیں۔ وہ یہ کہتے ہیں: کہ علم ما لم يقع والجهل عما وقع جو واقع نہیں ہوا اس کا جاننا اور جو واقع ہو چکا ہے اس سے لاعلم رہنا فقہ نہیں۔
ہاں جب وقوع پذیر ہوں گے تو ان شاء اللہ امت ان علماء و فقہاء سے بانجھ نہیں ہوگی جو اپنے علم کی حد تک ان کا اسلامی حل پیش نہ کر سکے۔ اس لئے کہ اللہ

تعالیٰ نے اس دین کو باقی رکھنا ہے اور اس کے خادین کو بھی۔ ماضی میں جو مسائل بھی ابھرے فقہ اسلامی نے اپنی تازگی اور شگفتگی کے سبب ان کا جواب دیا۔ مگر جب سے یہ تکلف سامنے آیا کہ غیر وقوع مسائل بھی موضوع بحث بنے ان سے کتب کی ضخامت تو بڑھ گئی مگر ان سے مستفید ہونا تو کجا ایک عام مسلمان بھی انہیں جان نہ سکا اس لئے کہ مفروضہ دور میں ان جدید مسائل کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بیشتر علماء و فقہاء محض عقلی اور مفروضہ مسائل کے بیان کرنے کو فقہی حدود سے تجاوز سمجھتے ہیں۔

فقہ اسلامی پر کھنے کے معیارات:

فقہی مسائل کی تشہیر کے وقت ہمارے ہاں مختلف گروہی انداز سامنے آتے ہیں۔ مسئلہ پوچھنے پر یا تو صراحتاً یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ہماری فقہ میں اس کا حل یہ ہے۔ یا بعض دفعہ سواد اعظم ہونے کی دلیل دی جاتی ہے کہ چونکہ اکثریت ہماری ہے اس لئے یہ مسئلہ اس فقہ کے مطابق یوں ہے۔ مگر حدیث رسول ﷺ جو وضاحت سے مسئلہ کو پیش کر رہی ہوتی ہے اس سے صرف نظر عام دیکھنے یا سننے میں آتا ہے۔ یہ مذہبی اور گروہی تعلیمی انداز تو اسلاف کے نہ تھے اور نہ ہی انہیں اقلیت و اکثریت کا ضبط تھا۔ تلاش حق کے لئے یہ ذریعہ بھی انتہائی کمزور ہے اس لئے کہ ہر مسلک مختلف مسائل و نظریات کا پرچارک ہے اور ہر ایک تقسیم در تقسیم ہو چکا ہے۔ دینی اعتبار سے ایک مسلمان معیار حق اکثریت کو نہیں بلکہ مدلل بات کو بناتا ہے جو قرآن مجید و سنت رسول ﷺ میں کہہ دی گئی ہے اس لئے ان دونوں مآخذ سے مستنبط مسائل ہی کو فقہ اسلامی کہا جاسکتا ہے نہ کہ ان بے جادعوں کو۔ ایسی فقہ اسلامی ہمیں درج ذیل طریقوں سے معلوم ہو سکتی ہے۔

معیاری کتب کا مطالعہ: فقہاء نے کتب فقہ میں وارد مسائل کو ثقاہت کے اعتبار سے تقسیم کیا ہے۔ ظاہر ہے یہ سب مسائل کتب حدیث سے ہی ماخوذ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان مسائل کی حقیقت جاننے اور صحیح و غلط میں تمیز کرنے کے لئے کسی بھی مسئلہ کا ریفرنس ضرور دیکھنا ہوگا۔ تاکہ قاری کو مسئلہ کی صحت اور ضعف کا اندازہ ہو سکے۔ ریفرنس دیکھتے وقت درج ذیل کتب کی catagories کو ہمیشہ یاد رکھئے اور انہی کا ہی مطالعہ کیجئے یہ آپ کو رسول اکرم ﷺ کے ساتھ ڈائریکٹ جوڑ دیں گی۔ انہی کی روشنی میں فقہی مسئلہ کو فہرست کتاب میں تلاش کیجئے اور باسانی پر کھئے۔ واضح رہے یہ تقسیم کتب ہر مکتب فکر کے فقہاء و علماء کے ہاں مسلمہ ہے۔

پہلا درجہ (First Catagory): کتب متفق علیہ اور مؤطا کا ہے۔ یعنی صحیح بخاری و صحیح مسلم کی وہ احادیث جنہیں دونوں مؤلفین نے اپنی کتب میں روایت کیا ہے۔ اس لئے کہ علماء امت کا اتفاق ہے کہ یہ دونوں کتب قرآن مجید کے بعد مسلمانوں کیلئے صحیح ترین کتب ہیں۔ مؤطا امام مالک بھی اسی درجہ کی کتاب ہے۔ اس میں مسند مرفوع احادیث کے علاوہ اقوال و فتاویٰ صحابہ و تابعین بھی ہیں۔ مگر ہمارے لئے صرف متصل مسند مرفوع احادیث ہی اولین حیثیت رکھتی ہیں۔

دوسرا درجہ (2nd Catagory): اس درجہ میں سنن ابی داؤد، سنن ترمذی، سنن نسائی اور ابن ماجہ کی کتب شامل ہیں جنہیں سنن اربعہ کہا جاتا ہے۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں مرتب فقہی مسائل ہیں۔ جہاں ان مؤلفین نے حدیث کے ضعیف ہونے کی نشاندہی کی ہے اسے ہم ظاہر ہے ترک کر دیں گے۔ اور جو مسئلہ دوسرے درجہ کی کتب میں با وضاحت نہیں تو ان کتب سے ہم مدد لیں گے۔ مسند احمد کو بھی اس درجہ میں رکھا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ چند وہ احادیث قابل اعتناء نہ سمجھی جائیں جو امام احمد کے بیٹے عبداللہ اور ان کے شاگرد ابو بکر قطیبی نے اضافہ کی ہیں۔

تیسرا درجہ (3rd Catagory): یہ کتب مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف عبدالرزاق، امام طحاوی کی کتب و دیگر غیر معروف کتب ہیں جن میں ہر قسم کی موضوع، ضعیف، مرسل روایات بکثرت ہیں۔ مگر صحیح بہت کم۔

چوتھا درجہ (4th Catagory): ان کتب کا ہے جو مختلف مسائل کے فقہاء کرام نے لکھی ہیں۔ ان میں چونکہ مسلکی مسائل کی تفصیل اور ان کی دیگر مسائل کے مسائل و دلائل پر ترجیح قائم کی جاتی ہے نیز استاذ و شاگرد کا اختلاف بھی ان میں نمایاں ہوتا ہے اس لئے صحیح اور ثابت دلیل کی بنیاد پر فقہی مسئلہ کو قبول کیا جائے گا خواہ وہ کسی بھی امام کا ہو۔

فقہی مسائل کی جانچ

۱۔ کسی بھی فقہی مسئلے کے انتخاب میں ریفرنسز دیکھنا مت بھولئے۔ ریفرنس اگر مندرجہ بالا کتب میں سے چوتھے درجے کی کتب کا ہو تو اسے اس صورت میں قبول کیجئے جبکہ پہلے تین درجوں کی کتب میں وہ مسئلہ نہ ہو۔ اسی طرح تیسرے درجے کی کتب کا ریفرنس ہو تو اسے اس صورت میں قبول کیجئے جبکہ پہلے دو درجوں کی کتب میں وہ مسئلہ موجود نہ ہو۔ اسی طرح آگے بھی یہی صورت اختیار کرنا ہوگی۔ یہ وہ درجات ہیں جو محدثین و فقہاء نے طے کئے ہیں۔ اور ان درجات سے ملتے جلتے ہیں جو فقہاء کے مابین پائے جاتے ہیں کہ کسی فقہی مسئلے میں اختلاف کی صورت میں کس درجے کے فقیہ کی رائے کو ترجیحاً لینا ہوتا ہے۔

۲۔ طلاق کا مسئلہ ہو یا نکاح کا، نماز کا ہو یا وضو کا۔ جو مسائل صحیح احادیث میں واضح ہوں انہیں لیجئے اور اس کے مقابل میں قیاس، قول اور فتویٰ وغیرہ سے حتی الامکان اجتناب کیجئے۔ کیوں کہ صحیح حدیث ہی تمام فقہاء کرام کا چناؤ ہے۔ اور مسلک ہے۔

۳۔ بزرگوں کے تجربے، باتیں اور خواب وغیرہ کو فقہ کا درجہ نہ دیجئے۔ یہ نہ دین ہیں اور نہ ہی عمل صالح۔

فقہی مسائل کی حقیقت جاننے کے لئے یہ ترتیب ملحوظ رہے تو کسی بھی مسئلہ کا حوالہ دیکھ کر بآسانی اس کی وقعت جانی جاسکتی ہے۔

نوٹ: براہ راست قرآن مجید سے استنباط مسائل کا دعویٰ فقہاء نے کیا ہے اور نہ ہی کوئی کر سکتا ہے۔ استنباط کا ملکہ حدیث سے بے نیاز ہو کر قطعاً حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایسے استنباطات کا معیار تو ایک طرف، کسی ضعیف حدیث سے بھی مستنبط مسئلہ کو فقہی مسئلہ کہنا ایک منصف عالم کے لئے بہت دشوار ہوتا ہے۔

فقہ سے مستفید ہونے کے دو اہم گر

اسلامی فقہ شریعت کا وہ علم ہے جس کی واقفیت سے آپ بآسانی اپنے اعمال کو پرکھ سکتے ہیں کہ وہ حلال و حرام، جائز و ناجائز اور مسنون و غیر مسنون وغیرہ میں کس درجے کے ہیں۔ فقہ دراصل کسی بھی مسئلے کی ایک مربوط و مرتب وضاحت کا نام ہے۔ اس لئے ایک عام آدمی کو فقہ جب مربوط صورت میں ملتی ہے اور وہ اسے پڑھتا ہے۔ تو فقہ کا سمجھنا اس کے لئے آسان تر ہوتا ہے۔

فقہ اسلامی بذات خود مستقل موضوع نہیں بلکہ قرآن مجید و سنت رسول ﷺ اس کی اساس ہیں اور اس کے تمام موضوعات انہی دونوں سے ہی مأخوذ ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں چونکہ فقہی مضامین خال خال مگر جابجا بکھرے ہیں۔ اس لئے اس سے بیک وقت کسی مسئلے سے تفصیلی طور پر آگاہ ہونا عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہاں قرآن مجید کی مطبوعہ موضوعاتی فہارس سے مستفید ہونا ممکن ہے۔ مگر حدیث رسول ﷺ کی وہ کتب جو سنن کے نام سے معروف ہیں۔ ان میں دینی مسائل کو فقہی ترتیب دے دی گئی ہے۔ اس لئے پہلا گریہی ہے کہ ان سنن کی کتب کا مطالعہ کیجئے۔ فقہاء حدیث رسول ﷺ کے استنباطات کو دیکھئے جو ابواب حدیث سے پہلے صاحب کتاب نے لکھے ہیں، اور اصول و قواعد فقہیہ جو زبان رسول ﷺ سے ماخوذ ہیں نوٹ کیجئے۔ اور اس انداز استدلال کے خوگر بنئے جو محدثین نے اپنائے ہیں۔ جہاں دلائل ہیں نصوص ہیں قیاسات نہیں ہیں۔ صحیح بخاری بھی اس سلسلے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔

امام بخاری کے بارے میں یہ قول بہت مشہور ہے۔ فقہ البخاری فی تراجمہ بہت مشہور ہے۔ یعنی امام بخاری کی فقیہانہ شان دیکھنی ہو تو ان کی کتاب کے ابواب (chapters) پر نگاہ ڈالئے۔ ان کتب کا مختلف زبانوں میں ترجمہ بھی مارکیٹ میں دستیاب ہے۔ ایسی کتب کا مطالعہ شاید ان کتب سے مفید ہو جو صرف اردو میں تو لکھی گئی ہوں مگر Original نہ ہوں اور شاذ و نادر ہی ان میں کسی مسئلے کی دلیل دی گئی ہو۔ اگر دی بھی گئی ہے تو وہ بھی ایسی کتب سے جن کا محدثین کیا علماء فقہ کے ہاں بھی کوئی مقام نہیں۔ ان میں زیادہ تر ضعیف و موضوع احادیث کا سہارا لیا جاتا ہے۔ جن پر عمل کرنا تمام اہل علم کے ہاں ناجائز بلکہ بعض صورتوں میں حرام ہوتا ہے۔ ریفرنس کے سلسلے میں بھی انہیں کتب کو اپنا اولین مأخذ بنائیے۔

دوسرا آسان گریہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو اقوال رجال سے یا ان کتب سے حتی الامکان دور رکھئے جن میں ائمہ مجتہدین کی طرف منسوب ایسے غیر ضروری عجیب و غریب مسائل بیان کئے گئے ہیں جو انہوں نے نہیں کہے۔ آخر وہ کیسے کہہ سکتے ہیں جب کہ سنت رسول ﷺ میں صراحۃً ان مسائل کے برعکس ایسی احادیث مذکور ہیں۔ جن کا رنگ یا معنی و مفہوم ان سے بالکل مختلف ہے۔ اور اگر بالفرض ان سے منسوب کچھ مسائل ہیں بھی سہی تو وجہ صاف ظاہر ہوتی ہے کہ ایسے

مجتہدین و فقہاء کرام کو احادیث نہیں مل سکیں۔

کتب فقہ کا انتخاب: بے شمار کتب فقہیہ اس وقت مارکیٹ میں دستیاب ہیں۔ ان کے انتخاب میں ان دو امور کا ضرور خیال رکھیے۔

- ۱۔ ہمیشہ ایسی کتب کا انتخاب کیجئے جن میں مسائل کو آیات قرآنیہ و احادیث رسول ﷺ یا اقوال صحابہؓ سے مدلل کیا گیا ہو۔ ان کتب کا انتخاب مت کیجئے۔ جو محض مفروضہ مسائل، غیر مستند اقوال اور غیر ضروری باتوں پر مبنی ہوں۔ اس لئے کہ ایسی کتب کے پڑھنے سے دین اور رسول ﷺ کی محبت میں کمی آ جاتی ہے۔ اور آدمی و سوسوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ معمولی اور غیر اہم باتیں پھر اہم ہو جاتی ہیں۔ اور اہم مسائل کی کوئی قدر نہیں رہتی۔
- ۲۔ اگر فقہی مسئلہ حدیث میں واضح نہ ہو تو پھر ایسی فقہی کتب کا انتخاب کیجئے جن میں صرف ایک ہی مذہب کی باتیں نہ ہوں۔ بلکہ چاروں مذاہب و دیگر علماء و فقہاء کی علمی کاوشوں اور دلائل کا ذکر بھی ہو۔ تاکہ سب علماء کے علمی و فکری نکتہ نظر و استدلال سے مستفید ہوا جاسکے۔ کیونکہ سبھی علماء و فقہاء برحق تھے۔ ایک کو سختی سے اختیار کرنے کا کہیں یہ مطلب نہ لے لیا جائے کہ دیگر علماء و فقہاء حق پر نہیں تھے یا وہ علم و فقہ میں دوسرے سے کہیں کم تر تھے۔ بلکہ سبھی کو یکساں مقام دے کر سبھی سے مستفید ہوا جائے۔

چند مفید فقہی کتب:

- ۱۔ فقہ السنۃ (اردو) مؤلف: عاصم الحداد، لاہور
- ۲۔ فقہ السنۃ (عربی، انگلش) مؤلف: سید سابق
- ۳۔ عمدۃ الأحکام (اردو) مؤلف: عبدالغنی المقدسی (اردو شرح: ضیاء الکلام از محمود احمد غضنفر)
- ۴۔ بلوغ المرام (اردو) مؤلف: ابن حجر عسقلانی (اردو ترجمہ محمد سلیمان کیلانی) (انگلش ترجمہ از دار السلام۔ ریاض)
- ۵۔ منہاج المسلم کا اردو ترجمہ اسلامی طرز زندگی کے نام سے چھپ گیا ہے۔ انگلش میں بھی منہاج المسلم کے نام سے چھپا ہے۔ دور حاضر کی بہترین کتاب ہے۔ اس کے مؤلف عالم اسلام کی معروف شخصیت اور حرم نبوی کے مدرس جناب ابو بکر الجزا ئری ہیں۔
- ۶۔ اسلامی تعلیم (اردو) مؤلف: مولانا عبدالسلام بستوی۔ یہ ایک بہت ہی شاندار اور انتہائی مفید فقہی کتاب ہے۔ تمام کتب حدیث کا مواد اس میں موجود ہے۔ اور باب باندھ کر یعنی Headings دے کر اس مسئلے سے متعلق تمام احادیث کا اردو ترجمہ کر کے جمع کر دیا گیا ہے۔ مثلاً اگر آپ عقیقہ کے بارے میں جاننا چاہیں تو صحیح احادیث پر مبنی تمام مرتب مسائل عقیقہ کے باب میں مل جائیں گے۔
- ۷۔ اسی طرح فقہ اسلامی کی آسان اور سادہ سی مطبوعات میں تفہیم السنۃ کا پورا سیٹ، جو اردو، انگلش وغیرہ میں اب مارکیٹ میں دستیاب ہیں۔ یہ وہ کتب ہیں جن کی ہر گھر کو ضرورت ہے۔ جہاں ایک چھوٹی سی فقہی لائبریری بھی بنائی جاسکتی ہے۔

فقہ اسلامی کے چند مطالبات:

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب شریعت ایک ہے اس کا سرچشمہ ایک ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے اسے لوگوں تک پہنچانے والا بھی ایک ہے تو اس میں اختلاف کیوں کر رونما ہوا؟ یہ شریعت تو صرف اس لئے آئی ہے کہ لوگ اس پر عمل کریں اور اپنے تمام امور میں اس کے مطابق فیصلہ کریں تو پھر اختلاف کے کیا معنی؟ بسا اوقات یہ انداز تنقید کا بھی ہوتا ہے۔ بہر حال یہ وہ شریعت ہے جس کی شان میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

...وَأَنَّهُ لَكُنْتُ عَزِيزٌ ۝ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ۝

یہ تو ایک عالی رتبہ کتاب ہے اس پر جھوٹ کا حملہ نہ آگے سے ہو سکتا ہے اور نہ پیچھے سے۔ یہ دانا اور

خوبیوں والے اللہ کی نازل کردہ ہے۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَفِظُونَ ۝ بے شک یہ کتاب ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی

(الحجر: 9) اس کے نگہبان ہیں۔

شریعت کی اساسیات کو جاننے اور فقہ اسلامی کو سمجھنے، اس پر عمل کرنے کے لئے ضروری ہوگا کہ اس اعتراض سے قبل ہم ذیل میں دیئے گئے چند شرعی مطالبات کو سمجھیں:

کون سی فقہ مراد لی جائے: آیات و احادیث میں جہاں فقہ کا لفظ آیا ہے وہی معنی ہی مراد لینا چاہئیں جس سے وہ قرون اولیٰ پر منطبق ہو سکے۔ مگر جو فقہیں اس وقت موجود نہ تھیں انہیں مراد لینا دھوکا ہوگا۔ مسلکی فقہیں تو بہت بعد وجود میں آئیں۔ اسلامی فقہ کی گہرائی اور گیرائی کے مقابلے میں دیگر فقہیں بہت محدود ہیں۔ مسلکی فقہ اپنے چند اصول یا فروع کے گرد گھومتی ہے جب کہ فقہ اسلامی میں ہر علاقے، قوم اور احوال و حوادث پر فرد واحد کی نہیں بلکہ بے شمار افراد کی متفقہ بصیرت و فہم کا عمل دخل ہوتا ہے۔

فقہی لٹریچر: ہمارے ہاں موجود فقہ اسلامی پر مہیا لٹریچر دو قسم کا ہے۔ ۱۔ عمومی انداز۔ ۲۔ خاص مجتہدانہ انداز۔

عمومی انداز: اس لٹریچر میں فقہی مسائل کو عنوانات کی ترتیب سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ بھی دو قسم کے ہیں:

۱۔ مسلکی: جس سے مراد وہ کتب فقہ ہیں جن میں کسی ایک فقیہ کی فقہ سے مستفاد مسائل کو مربوط و مرتب شکل میں لکھا گیا۔ اور دوسرے فقہاء کرام کی فقہ کی طرف توجہ اس لئے نہیں دی گئی کہ ان کا مسلک یا فقہی نکتہ نظر مؤلف سے مختلف ہے۔ اس قسم کی فقہ تقلیدی اور جامد کہلاتی ہے جو محض متون و شروح اور فروع کے ظواہر پر قناعت کرنے کا نام ہے۔ ان عبارات کو صحیح یا غیر صحیح دیکھے بغیر من و عن قبول کر لیا گیا ہے اور مسائل لکھ دیے گئے ہیں۔ عام فہم ہے۔ عربی، اردو، انگلش میں بھی یہ دستیاب ہے۔ ان کتب میں مسلکی چھاپ ایسی نمایاں ہے۔ کہ آدمی ادھر سے ادھر نہیں ہو پاتا۔ ان کے مطالعہ کے دوران ایک قاری اصل مصادر (قدیم و جدید) سے بمشکل آگاہ ہو پاتا ہے۔ بہر حال ان کے مطالعے سے دیگر فقہاء کرام کے علم و استدلال سے قاری محروم رہتا ہے۔

۲۔ غیر مسلکی: اس قسم کے لٹریچر میں تقریباً بیشتر فقہاء کی فقہ سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ اور دیانت دارانہ طور پر سب فقہاء و مجتہدین کے طریق استدلال اور دلائل پر بحث کی گئی ہے۔ ایسا مواد یقیناً اہل تحقیق کے لئے بہت ہی دل چسپ و مفید ہے۔ کسی بھی اختلافی مسئلے کی حقیقت کو باسانی جانا جاسکتا ہے۔ اور عام افراد کو اس سے آگاہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ اور یوں اپنی دینی ذمہ داری کو ادا کرنے کا صحیح لطف آتا ہے۔ قاری اس مرتب و مربوط فقہ سے جہاں مستفید ہوتا ہے وہاں وہ فقہاء کرام کی وسعت نظری، عدم تعصبی اور دلائل کو جان کر اپنے علم، عادات اور فکر میں ایک گونہ اضافہ کرتا ہے۔ ایسے لٹریچر سے متاثر عوام اور خواص دونوں تعصبات و باہمی نفرت کو خیر باد کہنے کا ضرور سوچتے ہیں اور اس کا عزم بھی کرتے ہیں۔ صحیح احادیث سے مستفاد فقہی مسائل پر مبنی لٹریچر بھی اسی میں داخل ہے۔ جن میں فروعی و اصولی مسائل کو احادیث سے مستنبط کیا گیا ہے۔ فقہ السنہ و دیگر کتب طہارت، نماز، روزہ، حج وغیرہ کے مسائل پر مبنی کتب بازار میں اب دستیاب ہیں۔ جن سے فرقہ واریت کی بونہیں آتی۔ اس لٹریچر کی اساس قدیم آخذ پر رکھی گئی ہے۔

مجتہدانہ انداز: جدید صنعتی اور فکری انقلاب نے امت مسلمہ کے سامنے جن مسائل کا انبار کھڑا کر دیا ہے۔ ان میں علماء و فقہاء کرام کے لئے یہ بھی لمحہ فکریہ ہے کہ بے شمار چیلنجز کے ہوتے ہوئے وہ ان جدید مسائل کا شرعی حل کیونکر تلاش کریں۔ گویہ ایک انتھک اور دشوار گزار کام ہے مگر علماء کے کرنے کا کام ہے یہی۔ نہ کہ معمولی مسائل کی طرف توجہ دینے کا جیسے نماز جنازہ یا نکاح پڑھانے کا یا وضوء کے معمولی مسائل کو دقیق بنا کر پیش کرنے کا۔ اس کام میں علماء کو قرآن مجید و حدیث رسول ﷺ اور فقہاء اسلاف کی کاوشوں کو مد نظر رکھ کر ان جیسی یا ان سے قریب صورتیں تلاش کرنا ہونگی۔ احکام کی علتوں (Effective Causes) اور اسباب (Causes) پر بڑے تحمل اور بردباری سے غور و مناقشہ کرنا ہوگا۔ اور زمانے کے عرف و رواج (Known Customs) کے مقابلہ میں دینی مفاد اور اس کی اصل روح کو باقی رکھنے کا بھی سوچنا ہوگا۔ قدیم زمانہ کے مسائل بھی اس دور میں اجتہادی تھے اور آج اس دور کے مسائل بھی اجتہادی نوعیت کے ہیں۔ اس لئے جیسے ماضی میں فقہاء کرام کے درمیان فکر و نظر کا اختلاف ہوا آج بھی ان متعدد مسائل میں

اختلاف رائے ہو سکتا ہے۔ فقہ کی ہر کتاب ماضی کا یہی نقشہ پیش کرتی ہے اور آج بھی اس موضوع پر لکھی جانے والی کتب اس نوع کے اختلافات سے خالی نہیں ہوں گی۔ تاہم یہ مخلصانہ کوشش قابل تحسین ہوگی اور مسلمانوں کی مشکلات کے حل کیلئے ایک مثبت سمت اٹھنے والا قدم بھی۔ ایسا مجتہدانہ لٹریچر کسی خاص نوعیت کے مسائل پر مبنی ہوتا ہے۔ جو وقتاً فوقتاً مسلمانوں میں متنوع ضروریات (Various Neccessities) کے تحت سامنے آیا ہے۔ یہ فقہی مواد بھی ترقی پذیر ہے۔ اور مزید اجتہادی کوشش کا مستحق بھی۔ بیشتر لٹریچر جن میں بطور خاص بینکنگ، سود، طب، اقتصاد وغیرہ کے مسائل ہیں جو انفرادی رائے پر مبنی ہیں۔ جن میں استدلال (Arguments) کی ابھی مزید ضرورت ہے۔ ان علوم کے ماہرین ابھی دیگر امکانات کی وجہ سے اپنے اجتہادات سے مطمئن نہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ ایسے مسائل میں علماء کی مشترکہ کاوشوں کا مسلسل دخل ہو۔ اور کوئی بھی رائے قائم کرنے میں غور و تأمل اور وسیع الصدوری (Wider & More Patient) کا عنصر غالب ہو۔ یہ فقہی مواد عام افراد کی ضرورت کا نہیں۔ خواص ہی اس میں رائے دیتے ہیں اور اس سے مستفید ہوتے ہیں۔

فقہاء ہمارا عظیم سرمایہ: ہم مسلمانوں کی قیادت، اتباع اور اطاعت کے ذریعے رسول اکرم ﷺ کے ہاتھ میں تھادی گئی ہے آپ ﷺ ہی کی ذات گرامی ایسی ہے جو معصوم ہے باقی سب خطا کے پتلے ہیں۔ اور ان کی خطا دین و شریعت کی خطا نہیں بلکہ وہ ان کی ذاتی خطا ہے۔ اسی طرح ان کی اجتہادی خطا بھی دین نہیں بلکہ ان کی ذاتی سوچ و فہم کی عکاس ہے۔ چشم بصیرت رکھنے والا ان خطاؤں کی اندھی پیروی کبھی نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ خود ان ائمہ محترمین نے اس سے منع فرمایا ہے۔ مختلف فقہاء کرام کو پڑھئے یہ سب ہمارا عظیم سرمایہ ہیں۔ ان کے وہ اجتہادات ہمارے لئے مشعل راہ ہیں جو دین کی صحیح تعبیر اور مقاصد شریعت سے ہم آہنگ و قریب ترین۔ ورنہ صحیح احادیث تو اختلافی صورت میں ہماری راہ بر ہیں ہی۔

تصب سے دور رہئے: فقہ اسلامی ایک الہی نعمت ہے اللہ تعالیٰ کی نعمت پانے میں ہمیں اللہ تعالیٰ کی رضا کو ہی سامنے رکھنا چاہئے۔ اس کا حکم سر آنکھوں پر اور رسول اکرم ﷺ کی محبت ہر قسم کی محبتوں پر قربان۔ آپ ﷺ ہی کے لئے نارنگی اور آپ ﷺ ہی کے لئے رضامندی یہی ہمارے ایمان کا حصہ ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ آخرت میں اسی کی قدر ہے۔ مگر دیکھایہ گیا ہے کہ دین کی اطاعت کے معاملے میں شخصیت پرستی جب سے درآئی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے کسی بندے کی فکر کو عام کرنے کا نظریہ اور اسی میں ہی ہمہ وقت استغراق، اس نے ہمارے معاشرے میں کوئی بہتر نتائج نہیں چھوڑے۔ بلکہ اس چیز نے تو قبولیت حق یا اس کے اعتراف کے لئے بسا اوقات آنکھوں پہ پردہ ڈال دیا ہے۔ اس نقطہ نظر کو درست قرار دینے کے لئے عموماً دو آراء پائی جاتی ہیں۔

ایک رائے تو یہ ہے کہ کسی ایک امام کو یا فقہ کو ضرور پکڑ کر چلنا چاہئے۔ اس لئے کہ خواہشات نفس کو روکنے کا یہی ہی ایک طریقہ ہے۔ پھر اس کے بارے میں غلو (Exaggeration) اختیار کر لیا جاتا ہے مثلاً یہی امام و فقیہ ہیں جن کی بات مانی جاسکتی ہے اس لئے کہ ان سے بڑھ کر کوئی عالم و فقیہ نہیں۔ عام آدمی جو دین کو صحیح شکل میں دیکھنا اور جاننا چاہتا ہے وہ اس بات پر پریشان ہے کہ کیا ایک کو پکڑنا واقعی ضروری ہے؟ کیا ہماری فقہی کتب میں ایسے مسائل کی کوئی شہادت نہیں کہ امام ابوحنیفہؒ ہوں یا امام شافعیؒ، ان سے ان کے شاگردوں نے تمام مسائل میں سو فیصد اتفاق کیا ہے؟ اگر اتفاق نہیں کیا تو کیا یہ جرم ہے؟ کیا ان مسالک میں ایک مسئلے سے دوسرے مسئلے کو نکالنے اور اس کی طرف جانے کی گنجائش، اصول اور قاعدے نہیں ہیں؟ شرعی حیلے آخر کیا ہیں؟ کیا جب سبھی فقہاء کرام دین کی خدمت کر گئے تو سبھی سے فائدہ اٹھانا ہمارے لئے بہتر ہوگا یا سب کو جھٹک کر صرف ایک سے مستفید ہونا ہی افضل ہے۔ کیا یہ علم سے محرومی تو نہیں؟ اور کیا واقعی ایک فقیہ نے مسلمانوں کے سارے مسائل کا حل پیش کر دیا ہے؟

کیا آج جو مسائل زندہ ہیں ان کے دور میں تھے؟ مزید یہ کہ ایک کو پکڑنے کا کون کہتا ہے؟ قرآن مجید؟ سنت رسول ﷺ؟ صحابہ کرامؓ؟ یا ائمہ کرامؒ کا خود یہ کہنا ہے؟ نیز اس میں کوئی خواہش پرستی ہے اگر ایک مسلمان یہ اصول بنا لے کہ میں ہر اس فقیہ کی بات ماننے کو تیار ہوں جس کی تائید صحیح حدیث کرتی ہو۔ دوسرے الفاظ میں صحیح حدیث اور رسول اللہ ﷺ سے ثابت شدہ مسئلہ خواہش پرستی نہیں بلکہ اطاعت، محبت اور ایمان بالرسول کا متقاضی ہے۔ جو ہر مسلمان کو رسول اللہ کی اطاعت میں مقید کر دیتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر یہ مسائل جو صحیح احادیث میں آگئے ہیں ان کا کیا کیا جائے؟ کیا ان احادیث رسول ﷺ کو

کتب حدیث سے نکال دیا جائے یا کتب حدیث کو ہی ختم کر دیا جائے؟ شاید اس نقطہ نظر میں شدت اس لئے بھی اختیار کر لی گئی ہے کہ حدیث رسول ﷺ کو اختیار کرنے سے شخصیت پس پردہ چلی جاتی ہے اور یوں مسلک کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے۔ جب کہ مسلمان کے لئے قابل فخر بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ دین رسول ﷺ کو زندہ رکھے اسی کے لئے جئے نہ کسی مذہب کو زندہ رکھی اور نہ اس کے لئے جئے۔ دین تو تعصب ختم کرنے کی اور اتفاق پیدا کرنے کی علامت ہے اور شخصیت پرستی مذہبی تعصب جنم دینے کی اور افتراق و انتشار کی!

دوسری رائے یہ ہے کہ سب حق پر ہیں اور یہ سب مظاہر دراصل اللہ تعالیٰ کی ایک منشا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی ہر سنت کو زندہ رکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے اس نے ہر ایک کو توفیق بخشی ہوئی ہے وغیرہ۔ یہ رائے گویا سیاسی ہے مگر پھر بھی ایک مسلمان اپنے معاشرے میں جب معمولی مسائل پر اختلافات کی ایک خلیج دیکھتا ہے تو اسے دین بجائے رحمت کے ایک زحمت نظر آتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ کیا رسول رحمت نے ہمیں ایسا دین عطا کیا جس میں ایک کام کے لئے مختلف عمل ہوں؟ اور ان مختلف اعمال کی بنیاد پر شدید تعصبات ہوں؟ کیا یہ سنت رسول ﷺ کی خدا نخواستہ کارستانی ہے جس کے تکلیف دہ مناظر آج ہم اپنے مخلوں کی مساجد وغیرہ میں دیکھتے ہیں یا شخصی خیالات کی افضلیت کی لڑائی ہے؟ کیا یہ وسعت ہمیں وہاں نظر آتی ہے جو ہماری مسجد میں آ کر نماز پڑھ لے یا ہمارے اجتماع میں آ شامل ہو؟ کتنی عجیب بات ہے کہ خیالات امتیوں کے ہوں اور انہیں جامہ سنت رسول ﷺ کا پہنا دیا جائے! اپنے اپنے محدود علم، فہم اور میلانات و احساسات کے اعتبار سے فقہاء کرام کے اجتہادات و مسائل میں گونمایاں تفاوت موجود ہے مگر یہ شارع کا اختلاف نہیں کیونکہ اس نے نصوص کو اس لئے وضع نہیں کیا کہ ان میں اختلاف پیدا ہو۔

تعصبات کو ختم کرنے کی ولی الہی تجویز

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اپنی دوراندیشی و صاحب بصیرت نگاہ سے ان تعصبات کو ختم کرنے کی مثبت تجاویز دیتے ہیں، جو آج بھی مسلم امہ کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر سکتی ہیں، تجاویز درج ذیل ہیں۔

پہلی تجویز: حنفی و شافعی اختلافات قرآن مجید و حدیث رسول ﷺ کے ظواہر (Apparent Indications) پر پیش کئے جائیں۔ جو ان کے مطابق ہوں یا ان کے قریب ترین ہوں، انہیں تسلیم کر لیا جائے۔ اور جو مسائل فقہی قرآن و حدیث کے خلاف ہوں انہیں ترک کر دیا جائے۔

دوسری تجویز: فقہائے محدثین، قرآن مجید و حدیث رسول ﷺ کے ظواہر کو تقدس کا اتنا درجہ نہ دیں، کہ تفقہ بالکل نظر انداز ہو جائے۔ جیسے اہل ظاہر نے کیا۔ اور فقہائے احناف اقوال ائمہ کو اتنی اہمیت نہ دیں کہ قرآن مجید و حدیث رسول ﷺ کی نصوص (Texts) سے بھی وہ فائق تر ہو جائیں۔ بلکہ بین بین راستہ اختیار کیا جائے۔ فقہاء کرام کی فقہی کاوشوں سے بھی پورا استفادہ کیا جائے لیکن نصوص صریحہ کا بھی پورا احترام و تقدس ملحوظ خاطر رکھا جائے۔

(القیہات الالہیہ 1/279)

بلاشبہ ہم آج بھی ان تجاویز سے فائدہ اٹھا کر صدیوں سے مبتلا اس امہ میں فقہی جمود کو توڑنے اور مذہبی منافرت کو ختم کرنے میں کچھ مثبت کردار ادا کر سکتے ہیں۔

اختلاف کے باوجود رواداری: بعض لوگ ان احادیث اختلاف امتی رحمة اور أصحابی کالنجوم سے احتجاج کرتے ہیں کہ فقہاء کرام کا اور مجتہدین کا اختلاف باعث رحمت ہے۔ جب کہ پہلی حدیث تو بے اصل ہے جس کا سراغ محدثین بھی نہیں نکال سکے۔ اور دوسری حدیث بھی صحیح نہیں۔ امام ابن عبد البرؒ اور ابن حزمؒ نے اسے ناقابل احتجاج سمجھا ہے اور شیخ البانیؒ نے اسے سلسلۃ الأحادیث الضعیفۃ میں ذکر کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ضعیف احادیث پر اتنا اصرار کیوں؟ کیا کہیں اپنی اختلافی بات کو اہمیت دینا تو مقصود نہیں تا کہ مسلمان متحد نہ ہوں؟ اور اپنی فقہی حیثیت برقرار رہے؟ یا پھر ہمارے جو حالات ہیں ان میں اگر اختلاف رحمت کا موجب ہوتا تو اتفاق غضب خداوندی کا سبب بنتا! مسائل میں اختلاف عہد صحابہ ہی سے شروع ہو گیا تھا تاہم

یہ اختلاف کسی وقت بھی ان کے مابین بغض و عناد کا موجب نہیں بنا تھا۔ چونکہ یہ لوگ حق کو اپنے ہی اقوال کے اندر محدود کرنے کے عادی نہیں تھے اس لئے اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے یہ دوسروں کو بھی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کے مسلک و مذہب کی قدر کیا کرتے تھے۔ آج کتنے حنفی اور اہلحدیث ہیں جو ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں سمجھتے ہیں؟ مگر دوسری طرف معاملات یعنی آپس میں لین دین ہوتا ہے۔ رشتے ناٹے بھی ہو رہے ہیں۔ کیا ہمارے اسلاف کا یہی طریقہ تھا؟ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے اصحاب برابر مدینہ کے مالکی ائمہ کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے حالانکہ یہ لوگ بسم اللہ نہ تو سر اُڑھتے اور نہ جہراً۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ لکھتے ہیں:

خليفة هارون الرشيد نے امام مالکؒ کے فتویٰ پر فصد کے بعد وضوء کے بغیر نماز پڑھائی۔ قاضی ابو یوسفؒ نے ان کے پیچھے نماز پڑھ لی اور ہر انی نہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ تکبیر پھوٹنے اور جسم سے خون نکلوانے کی صورت میں وضوء کے قائل تھے۔ ان سے سوال کیا گیا کہ امام کے جسم سے خون نکل آئے اور وہ وضوء نہ کرے تو کیا آپ اس کے پیچھے نماز پڑھ لیں گے؟ انہوں نے فرمایا: بھلا امام مالکؒ اور سعید بن المسیبؒ جیسے لوگوں کے پیچھے نماز پڑھنے سے کس طرح انکار کر سکتا ہوں؟۔ قاضی ابو یوسفؒ اور محمد بن الحسن کے متعلق روایت ہے کہ یہ لوگ عیدین میں تکبیر ابن عباسؓ کے مذہب کے مطابق کہتے تھے اس لئے کہ ہارون الرشید کو اپنے جد امجد کی تکبیر زیادہ پسند تھی اور وہ ان کے پیچھے نماز پڑھا کرتا تھا۔ امام شافعیؒ نے ایک مرتبہ صبح کی نماز امام ابوحنیفہؒ کے مقبرہ کے قریب مسجد میں پڑھی اور امام صاحب کے مسلک کے احترام میں دعائے قنوت نہیں پڑھی اور فرمایا: ہم بھی کبھی کبھی اہل عراق کے مذہب کو اختیار کر لیتے ہیں۔ قاضی ابو یوسفؒ کے متعلق روایت ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے حمام میں غسل کر کے جمعہ کی نماز پڑھائی جب لوگ چلے گئے تو پتہ چلا کہ حمام کے کنویں میں چوہیا مری ہے۔ ان سے ذکر کیا گیا تو فرمایا کچھ مضائقہ نہیں آج ہمارا عمل اہل مدینہ کے مذہب پر ہوگا کہ پانی کی مقدار جب دو قلعہ ہو جائے تو وہ پلید نہیں ہوتا۔ (الانصاف) مگر کیا امام حرمین کے پیچھے نماز پڑھتے وقت ہمارا جذبہ رواداری بھی جاگتا ہے؟

فقہاء امت سے استفادہ: یہ ایک اصول ہے کہ اولاً صحیح حدیث سے ہی مسئلہ کا حل تلاش کیا جائے اگر صحیح حدیث میں مسئلہ کا حل نہ ملے تو حسن حدیث ہی سہی اگر اس میں بھی نہیں ملتا تو پھر قیاس سے بہتر ضعیف حدیث ہے۔ ورنہ فقہاء کرام کے استنباطات اور اجتہادات سے مستفید ہوا جائے۔

کیونکہ فقہی استنباطات اور اجتہادات علم حدیث کے بغیر نہیں ہو سکتے اور نہ ہی اس علم کے بغیر ایسے اجتہادات و استنباطات کی کوئی حیثیت ہے۔ ہر فقیہ حدیث رسول کا محتاج ہوتا ہے اس لئے محتاط فقہاء کرام اپنا اجتہاد اور استنباط بتاتے وقت حدیث رسول کا ضرور سہارا لیتے جہاں نہ ہوتی وہاں اپنے استنباط و اجتہاد کے بعد احتیاطاً یہ فرما دیا کرتے کہ اُتر کو اقوالی بخبر رسول اللہ۔ میری بات کو حدیث رسول کے مقابلے میں ترک کر دو۔ اضربوا قولی بحائط، میری بات کو دیوار پہ دے مارو۔ إذا صح الحديث فهو مذهبی جب حدیث صحیح مل جائے تو میرا مذہب بھی وہی ہوگا۔ یا کل یرد إلا صاحب هذا القبر سب کو چھوڑا جاسکتا ہے مگر اس قبر والے (نبی کریم ﷺ) کی بات نہیں چھوڑی جاسکتی۔ اس لئے کہ حسب ارشاد نبوی ﷺ المجتهد یخطئ ویصیب کو اپنے اوپر وہ لاگو کرتے تھے۔ اور یہی ہمیں تسلیم کرنا چاہئے۔

فقہی اختلافات کو ختم کرنے اور فقہی جمود کو توڑنے کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ تمام فقہاء کی فقہی کاوشوں کو سامنے رکھ کر ان سے مستفید ہوا جائے۔ کسی ایک کے علم کو کلی نہ سمجھا جائے اور نہ ہی ایک پر اکتفاء کیا جائے اور نہ ہی اس کے اجتہاد کو ناگزیر سمجھا جائے۔ ایسا کرنے کی نہ کسی فقیہ محترم نے تلقین کی۔ اور نہ ہی وحی الہی نے۔ کیونکہ حسب فرمان الہی و فوق کل ذی علم علیم۔ ہر عالم کے اوپر ایک عالم ہوتا ہے۔ یہی شریعت تو اس کی وسعت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ آج تک کے فقہاء کرام کا علم مجتمع کر دیا جائے تب بھی وہ فقہ اسلامی کی تکمیل نہیں کر سکتے۔ جب ہم سختی سے ایک کو اپنا پیشوا بنالیں تو اس طرز فکر سے شاید ہم سب فقہاء کو حق پر جانتے ہوئے باقی ائمہ کرام کا انکار کر دیں گے۔ اور سب کو حق پر بھی نہ سمجھیں گے۔ نتیجہً ہم اپنے آپ کو ان کے علم سے محروم بھی کر دیں گے۔ سب کو ماننے کا ایک مزید فائدہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمام فقہاء کرام کے استنباطات یا اجتہادات کا تقابلی مطالعہ بھی ہو جائے گا۔

اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ بعض فقہاء کرام کے کچھ فقہی استنباطات اور اجتہادات صحیح حدیث کے خلاف بھی ہیں۔ جس کا یہ مطلب ہرگز نہ لیا جائے کہ

خدا خواستہ انہوں نے صحیح حدیث کی مخالفت کر ڈالی۔ بلکہ ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ ان فقہاء محترم کو حدیث رسول ﷺ نہیں پہنچی ہوگی ورنہ وہ کبھی ایسا اجتہاد واستنباط نہ کرتے۔ مجتہدین کرام اور فقہاء عظام آخر انسان تھے اس لئے ان کے پاس جو بہتر دلیل ان کے علم کے مطابق ہوتی وہ استنباط کر کے مسئلہ دلیل سمیت بتا دیا کرتے تھے۔ اس لئے کہ اجتہاد ہو یا استنباط بغیر کسی دلیل کے نہیں ہوا کرتا صرف دلیل کا معیار ہی بتا دیتا ہے کہ اجتہاد کس معیار کا ہے تاکہ اسے قبول یا رد کیا جاسکے۔ اجماعی اجتہاد اور استنباط بھی دلیل کا محتاج ہوتا ہے اس لئے کہ یہ ناممکن ہے کہ مجتہدین کرام کسی، کمزور، بے اصل یا کسی دلیل کے بغیر کسی اجتہاد پر اتفاق کر لیں۔

لہذا ایسے فتاویٰ یا اجتہادات جو لوگوں میں معروف ہیں اہل علم پر فرض ہے کہ ان کے حدیثی دلائل کو تحقیق کے بعد بیان کریں کیونکہ فقہ کی عام کتب جن سے ہمارا عام طبقہ زیادہ تر رجوع کرتا ہے ان میں بے شمار منکر، بے اصل اور موضوع روایات بھی ہیں مثلاً الہدایہ فقہ مرغینانی کی کتاب، المدونہ فقہ ابن القاسم کی کتاب، شرح الوجیز فقہ الرافعی کی کتاب، المغنی فقہ ابن قدامہ کی کتاب اور بدایۃ المجتہد فقہ ابن رشد کی کتاب جو فقہ المقارن کی ایک اچھی کوشش ہے۔ اسی طرح اردو میں موجود فقہی لٹریچر جو انہی کتب سے مستفاد ہے ان کی حدیثی تحقیق بہت ضروری ہے ورنہ مسائل کی حقیقت معلوم نہ ہو سکے گی۔

فروع کے استنباط کا مشغلہ ہر دور میں رہا ہے مگر خیر القرون میں کوئی شخص دوسرے کی فقہ کا پابند نہیں رہا۔ ابن القیمؒ فرماتے ہیں:

فإننا نعلم بالضرورة أنه لم یکن فی عصر
الصحابۃ رجل واحد اتخذ رجلاً منهم: 6
ہم بخوبی جانتے ہیں کہ عصر صحابہ میں کوئی شخص ایسا
نہیں تھا جس نے ان میں سے کسی ایک کو پکڑ رکھا ہو
۔ یعنی اس کی فقہ کو ماننا ہو یا اس کی تقلید کرتا ہو۔

بعینہ یہ سمجھنا کہ دور جدید کے پیدا شدہ مسائل کا حل، قدیم فقہی ذخیرہ میں ملتا ہے تو یہ بھی راست فکر نہیں اس لئے کہ:

من زعم أن الدین کله فی الفقہ بحیث لا
یبقی وراءہ شیء فقد عاد عن الصواب.
جو یہ سمجھتا ہے کہ سارے کا سارا دین فقہ میں اس طرح
آ گیا ہے کہ اب کوئی شے باقی نہیں رہی وہ صحیح سوچ

سے ہٹا ہوا ہے۔ فیض الباری ۱۰/۲

اجتہاد کا دروازہ بند نہ کیا جائے: عام لوگوں کو یہ سمجھا دیا گیا ہے کہ ائمہ اربعہ نے جو اجتہاد کرنا تھے کر لئے اور جو کچھ کہنا تھا کہہ گئے۔ وہی مجتہد مطلق تھے اس لئے اب انہی کا پابند رہ کر ایک مسلمان کو زندگی گزارنی چاہئے نہ کہ وہ اجتہادی کوششیں شروع کر دے؟ اس لئے بعد کے اہل علم حضرات انہی حضرات میں سے کسی ایک کے خوشہ چیں اور مقلد رہے ہیں۔ ہاں حسب مراتب ان میں بعض مجتہد منتسب ہیں اور بعض مجتہد فی المذہب۔ مگر مجتہد مطلق، مستقل کوئی نہیں رہا اور نہ رہے گا۔ اس دعویٰ محض کے بارے میں سوائے اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ امت محمدیہ ایسی بانجھ ثابت ہوئی کہ پندرہ سو سالوں میں اس نے صرف چار مجتہد ہی پیدا کئے؟۔ اس دعوے کی محققین حضرات نے تردید کی ہے مولانا لکھنویؒ اسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حاصل کلام یہ ہے کہ جو اس بات کا مدعی ہے کہ اجتہاد مطلق و مستقل کا مرتبہ ائمہ اربعہ کے بعد ختم ہو چکا ہے یہ مرتبہ اب کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا تو وہ غلطی اور خبط میں مبتلا ہے کیونکہ مرتبہ اجتہاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت نہ کسی زمانہ پر منحصر ہے اور نہ ہی کسی انسان پر رک سکتی ہے اور جو امکان کے باوجود اس کے انقطاع کا نفس الامر میں مدعی ہے تو اس کا منشا اگر یہی ہے کہ ائمہ اربعہ کے بعد کوئی ایسا مجتہد نہیں جس کے اجتہاد پر جمہور کا اتفاق ہو اور انہوں نے اسے اسی طرح مستقل مجتہد تسلیم کیا ہو جیسے ائمہ اربعہ ہیں تو یہ بات قابل تسلیم ہے ورنہ ائمہ اربعہ کے بعد بھی مجتہد مستقل ہوئے ہیں جیسے امام ابو ثور بغدادی، امام داؤد ظاہری، امام محمد بن اسماعیل بخاری وغیرہ کتب طبقات کا مطالعہ کرنے والا اسے اچھی طرح جانتا ہے۔

والحاصل أن من ادعى بأنه قد انقطع مرتبة الاجتهاد المطلق المستقل بالأئمة الأربعة انقطاعاً لا يمكن عوده فقد غلط وخط، فإن الاجتهاد رحمة من الله سبحانه ورحمة الله لا تقصر على زمان دون زمان، ولا على بشر دون بشر. ومن ادعى انقطاعها في نفس الأمر مع امکان وجود في كل زمان فإن أراد أنه لم يوجد بعد الأربعة مجتهد اتفق الجمهور على اجتهاد وسلموا استقلاله كاتفاقهم على اجتهادهم فهو مسلم وإلا فقد وجد بعدهم أيضاً أرباب الاجتهاد المستقل كأبي ثور البغدادی وداؤد الظاهري ومحمد بن إسماعيل البخاري وغيرهم على ما لا يخفى على من طالع كتب الطبقات. (النافع الكبير ص: 9)

استنباط: اس لفظ کے مفہوم کو بھی سمجھنا جائے۔ کنویں سے پانی کے ڈول کو نکالنا استنباط کہلاتا ہے۔ گویا ایک فقیہ، اپنے علم اور خدا داد بصیرت کی بناء پر کسی بھی نئے واقعے یا حادثے کا حکم قرآن مجید و حدیث رسول ﷺ کے الفاظ سے نکالتا ہے جو دوسرے پر مخفی رہا ہو۔ یہی اجتہاد بھی کہلاتا ہے۔ صرف لفظ کو سمجھ لینا استنباط نہیں کہلاتا اور نہ لفظ کا موضوع استنباط سے حاصل ہوتا ہے بلکہ علت سے، معنی سے، شبہ سے، نظیر سے اور متکلم کے مقصد سے ہی مسائل کا استنباط ہوتا ہے۔ صرف ظاہر لفظ کو سننا، انہیں اڑ دینا اور شائع کر دینا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مذموم فعل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل استنباط کی قرآن مجید میں تعریف فرمائی ہے اور انہیں اہل علم سے خطاب فرمایا ہے۔ دنیا میں نت نئے ان گنت حوادث و واقعات رونما ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔ یہ حوادث تغیر پذیر ہیں اور ہر لمحہ ان میں تبدیلی اور (Modification) ہوتی رہتی ہے۔ حیات انسانی کے وہ حوادث جن میں تغیر رونما نہیں ہوتا شریعت اسلامیہ نے ان کی تفصیل و توضیح کرنے کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں اختلاف کم پایا جاتا ہے مثلاً عقائد و عبادات، احکام وراثت، نکاح و وفات سے متعلق احکام و مسائل۔ یا وہ امور جن کو جدید اصطلاح میں احوال شخصیه (Personal Statute) کہا جاتا ہے۔ بخلاف ازیں جو امور تغیر پذیر ہیں ان کے بارے میں شریعت نے ایسے قواعد عامہ وضع کر دیے ہیں جن سے تمام حوادث و واقعات کے احکام استنباط کئے جاسکتے ہیں۔ مجتہدین عظام کا یہی کارنامہ ہے کہ واقعات کو نصوص پر منطبق کرتے ہیں اور ان سے احکام کا استنباط بھی کرتی ہیں۔

جرح و تعدیل: محدثین نے جرح و تعدیل کے جو اصول، صحابہ کرامؓ و الصحابة کلہم عدول کے اتفاقی اصول کے مطابق چھوڑ کر، تابعینؓ، تبع تابعین اور بعد کے علماء کے بارے میں بنائے یہ صرف حدیث کے راویوں کے لئے نہیں تھے بلکہ یہ ہر فقیہ، محدث، مفسر اور متکلم کے لئے تھے۔ سبھی کو ان اصولوں کے تحت پرکھنا ہوگا کہ وہ کیا علمی، عملی اور ذہنی معیار رکھتا ہے۔ فقہاء کرام کے بھی درجات ہیں۔ انہیں پڑھ کے اندازہ ہوتا ہے کہ جرح و تعدیل سے مبرا کوئی

نہیں۔ اس لئے کسی بھی اجتہاد، استنباط یا شرعی مسئلہ کی وضاحت میں کسی بھی فقیہ کی ثقاہت، عدالت، اس کے عقلی و فنی دلائل، اس کے اجتہادات، اس کا شذوذ وغیرہ ان اصولوں کے تحت پرکھنا ہوگا تا کہ فقہی مسائل کی چھانٹی ہو سکے اور صحیح مسائل والے فقیہ یا فقہاء کو ترجیح دی جاسکے۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ نقد و جرح کا پیمانہ ایک خاص گروہ کے لئے تو ہو مگر دوسرے کے لئے نہ ہو۔ اس لئے وہ فقہاء جو ثقاہت کے مقام کو چھوٹے ہیں ان کے فرمودہ فقہی مسائل میں ثقاہت، اجتہادات کے دلائل سرفہرست ہوتے ہیں۔ مگر غیر ثقہ فقیہ کو کوئی حیثیت نہیں دیتا۔

اس لئے فقہی مسائل میں بقول ائمہ کرام کے، کوئی مسئلہ یا اجتہاد قبول نہیں کیا جائے گا جب تک اس کی قوی دلیل فراہم نہ کر دی جائے۔ محض یہ کہہ دینا کافی نہیں ہوگا کہ فقہ میں ہے یا فلاں فقیہ کی فلاں کتاب میں ہے یا فلاں فقیہ نے فرمایا ہے۔ جس طرح کوئی حدیث بغیر سند اور اس کے راویوں کی ثقاہت کے قبول نہیں کی جاتی بلکہ اسے تنقیدی اعتبار سے بھی پرکھا جاتا ہے، بعینہ اسی طرح فقہاء کے ان اجتہادات و مسائل کی بھی دلائل اور سند کے ساتھ روایت ہوئی ہے۔ ان کو بھی بغیر کسی دلیل و روایت کے قبول نہیں کیا جاسکتا۔ ہمیں ضرور دیکھنا ہوگا کہ مسئلہ کیا ہے؟ اس کی دلیل کیا ہے؟ اور کون اس کا راوی ہے؟ درایتی اعتبار سے وہ کیسی ہے تا کہ آپ ﷺ کے ارشاد کی صحیح تعبیر مخاطب تک پہنچ سکے۔ غیر فقیہانہ مسائل، ائمہ حضرات کی طرف منسوب اقوال و اجتہادات تو ہونگے مگر ان کی حیثیت ایک ضعیف یا موضوع حدیث سے کم نہ ہوگی۔ امام عبد اللہ بن المبارکؒ نے دین کا صحیح ادراک کر کے پہلے ہی ہمیں الرٹ کر دیا تھا کہ یاد رکھنا: الإسناد من الدین، لو لا الإسناد لقال من شاء ما شاء۔ اسناد یعنی کسی کے قول یا مسئلے یا حدیث کے سلسلہ سند کو پیش کرنا دینی فریضہ ہے اگر اس سلسلے کو غیر اہم سمجھا جاتا تو جو شخص جو کچھ چاہتا کہہ دیتا۔ ملا علی القاری شرح فقہ الاکبر میں فرماتے ہیں: العلم ما فی الأسناد، وما لیس فیہ الأسناد فهو من وسوسة الشیاطین۔ علم یعنی فقہ، حدیث کا اصل علم وہ ہے جس میں سند ہو اور جس علم میں سند نہ ہو وہ وسوسہ شیطانی ہیں۔

تخریج سے اجتناب: کتب فقہ کے مطالعہ کے دوران یہ بکثرت محسوس کیا گیا ہے کہ فقہی مسائل میں ایک امام، ان کے شاگرد، پھر ان کے بعد تقریباً ہر صدی میں ظاہر ہونے والے فقہاء کرام کا فقہی نقطہ نظر کافی پھیلتا چلا گیا ہے۔ جب کہ مذہب کے امام نے اس قدر مسائل لکھے نہ بیان کئے۔ مسائل کی یہ وسعت عجیبہ اپنے اندر مختلف نقطہ ہائے نظر بھی رکھتی ہے۔ جس میں شاگرد اپنے شیخ سے اختلاف بھی کرتا ہے اور بعد کے فقہاء کرام اپنے مشائخ سے، مسائل کا حل بھی پیش کیا جا رہا ہے۔ لیکن ان میں جہاں عند ابی حنیفہ، وعند صاحبیہ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہاں کبھی کبھار عندنا کی اصطلاح بھی استعمال ہوتی ہے۔ فقہاء کرام نے اسے نہ تو تقلید کہا اور نہ ہی مذہب سے خروج۔

یہ بات بھی اکثر ذہن میں آتی ہے کہ امام محترمؒ کی طرف منسوب یہ مسائل نہ تو کوئی سند رکھتے ہیں اور نہ ہی امام محترمؒ کی اس سلسلے میں کوئی معروف فقہی کتاب ہے پھر یہ سب کچھ ایک مخصوص فقہ کیسے بن گئی؟۔ نیز اولین شاگردوں کے پاس اپنے استاذ محترم کا اتنا مواد کہاں تھا کہ وہ اس سب کچھ کو امام محترم کی طرف منسوب کرتے؟۔ ان تمام سوالوں کا جواب اسی مسئلہ تخریج میں ہے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ اپنے امام کے کسی قول کو یا فقہی فرعی مسئلے کو بنیاد بنا کر اس سے مسائل احکام کو اس طرح استنباط کرتے جانا اور مسائل سے مسائل کو تلاش کرتے جانا جیسے ایک مجتہد قرآن مجید و حدیث رسول ﷺ سے استنباط کرتا ہے۔ اور یوں انہیں امام مذہب کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔ یہ احکام بعد میں کتب کی زینت بنتے ہیں اور اپنے اپنے مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں اس طرح مذہب میں وہ معمول بہا ہو جاتے ہیں۔ معروف مذاہب میں اس کے باقاعدہ متخص لوگ ہیں۔

تخریج کا یہ انداز ایک طفیلی انداز ہے اس میں اگر تھوڑی سی وسعت یوں پیدا کر لی جاتی کہ ہر اچھے اور قابل فقیہ کے دلائل کو بھی شامل کر لیا جاتا اور پھر تخریج کی جاتی تو شاید سب کے لئے قابل قبول ہو جاتی۔ کیونکہ اس قسم کی تخریج سے ایسی تشریع و استنباط احکام شروع ہو جاتے ہیں جو براہ راست قرآن مجید و حدیث رسول ﷺ سے تو ماخوذ نہیں ہوتے بلکہ امام مذہب کے کلام سے مستنبط ہوتے ہیں۔ جو ایک اچھے مفہوم کو ذہن میں نہیں لاتی۔ اگر یہ سارا زور قرآن مجید و حدیث رسول ﷺ کی نصوص پر لگایا جاتا تو یہ سارے دین کی ایک خدمت ہو جاتی۔ اس پر بھی ایک بحث ہے کہ کیا ان مخرج مسائل کو امام مذہب کی طرف منسوب کرنا درست ہے؟ کچھ نے تو اس کی اجازت دی ہے اور کچھ نے تخریجی مسئلہ کے ساتھ قید لگانے کا کہا ہے تا کہ کذب کا واہمہ نہ ہو اور امام مذہب

کی نصوص سے یہ تخریج الگ رہے۔ بعض فقہاء نے اس کی اجازت نہیں دی۔ یہ ساری بحث جواز تقلید و عدم تقلید پر مبنی انداز کے دلائل جیسی ہے۔ سوال صرف اتنا ہے کہ احکام کا شارع اللہ تعالیٰ ہے جو ایک اجماعی بات ہے۔ چونکہ مفتی سے ان احکام کے بارے میں سوال پوچھا جاتا ہے جو شارع سے ثابت ہوں۔ انقطاع وحی کے بعد شرعی احکام کو صرف کتاب و سنت کی نصوص سے ہی سے ثابت کیا جاسکتا ہے یا پھر اجماع و قیاس سے۔ اس تخریج میں یہ اصول کہاں ہیں؟ اور مفتی کا یہ فرمانا کہ ہمارے امام کے نزدیک یہ ہے وغیرہ کہاں تک درست ہے؟۔ ہمارا مقصد صحیح اور اصولی بات کرنا ہے جو معتدل ائمہ نے اختیار کی ہے۔ باقی: وللناس فیما یعشقون مذاہب۔

فتویٰ اور مفتی

فتویٰ: فتویٰ کسی بھی مسئلے کے شرعی حل کو طلب کرنا ہوتا ہے۔ یہ حل زبانی طور پر بھی مانگا جاسکتا ہے اور تحریراً بھی۔ فتویٰ اپنی لاعلمی کو دور کرنے یا علم کو پختہ کرنے کیلئے اپنے سے بڑے عالم یا عالم دین سے مانگا جاتا ہے۔ چاہے اس کا تعلق عقائد و عبادات سے ہو یا اخلاق و معاملات سے یا باہمی نزاع سے۔ عالم دین کو رسوا کرنے یا زچ کرنے کے لئے استفتاء نہ ہو۔ کیونکہ یہ طریقہ اہل ایمان کا نہیں۔ جس سے یہ حل مانگا جاتا ہے اسے مفتی کہتے ہیں۔ اور مسئلے کا حل پوچھنا خواہ وہ زبانی ہو یا تحریری، اسے استفتاء کہتے ہیں۔ فتویٰ دراصل مفتی کی اپنی ایک علمی رائے (Opinion) ہے جسے وہ شرعی حکم بتا کر ظاہر کرتا ہے فتویٰ لینے اور دینے کا سلسلہ نزول قرآن مجید اور رسالت مآب ﷺ کے زمانہ سے ہی شروع ہوا۔ چونکہ اس عمل میں خود رسول اکرم ﷺ، صحابہؓ، اور علماء فقہاء امت پیش پیش رہے اس لئے "مفتی" کے لئے کچھ ایسے خصائص کا ہونا لازمی ہے جو اس کے منصب اور مقام کو مزید جلائیں۔

مفتی اور اس کی شرائط: مفتی ایک ایسا عالم دین ہو جو احکام شریعت میں بصیرت رکھنے والا، معتدل مزاج اور مسئلہ کی نوعیت و بار کی کو سمجھتے ہوئے دین کی تمام تر آسانوں اور گنجائشوں کو مد نظر رکھ کر، تعصب و مسلکی عناد و حب شخصیات سے بالاتر ہو کر مسئلہ کا حل شرعی دلائل کی روشنی میں پیش کرے۔ فتویٰ دینے کا منصب بہت ہی اہم اور ذمہ دارانہ ہے۔ یہ وہ منصب ہے جسے اللہ رب العزت نے اپنے لئے پسند فرمایا ہے۔ ارشاد بانی ہے:

يَسْتَفْتُونَكَ ۖ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ ط

لوگ آپ سے فتویٰ مانگتے ہیں۔ آپ کہیے اللہ تمہیں

کلامہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔ (النساء: 176) O...

مزید یہ کہ آپ ﷺ بھی فتویٰ دیا کرتے تھے۔ اس لئے مفتی کو یہ ضرور خیال رکھنا چاہیے کہ وہ کس کی نیابت کر رہا ہے۔ جو بات کہے سچ کہے، غلط تاویلات نہ کرے یا حیلے بہانوں سے اپنی جان نہ بچائے۔ اور اس یقین کے ساتھ فتویٰ دے کہ کل روز قیامت اس سے باز پرس ہونی ہے اور اسے رب ذو الجلال کے حضور کھڑا بھی ہونا ہے۔ احادیث رسول ﷺ کی روایت جو صحابہ کرامؓ نے کی، یہ کوئی محض ان کا شوق نہیں تھا۔ بلکہ بیشتر روایات، سائل کے سوال کا جواب ہوتی تھیں۔ اور یہی ان کے فتاویٰ تھے۔ ان فتاویٰ میں ان کی کمال احتیاط یہ تھی کہ جواب دیتے وقت انہیں الفاظ پر اکتفاء کیا جو آپ ﷺ نے ارشاد فرمائے یا انہی اعمال کی وضاحت کی جو آپ ﷺ کو کرتے دیکھی۔ اپنی طرف سے شاذ ہی کسی لفظ کو ارشاد رسول میں ڈالنے کی کوشش کی ہو۔ یہی منہج بعد کے اسلاف محدثین و فقہاء کے ہاں رہا۔

مفتی کی خصوصیات

علم و صداقت: علم اور مسئلے کا صحیح حل پیش کرنا مفتی کی اولین خصوصیات میں سے ہے۔ مفتی بننے کا مقام ایک طویل علمی و تحقیقی تجربہ کا متقاضی ہوتا ہے۔ اور وسعت نظری کا بھی۔ وہ شخص مفتی کہلانے کا کبھی مستحق ہی نہیں رہا جو نہ بہت کا شکار ہو کر صرف اپنے ہی خول میں محدود رہا اور دیگر فقہاء و علماء کی وقیع آراء کو یا اجتہاد کو کوئی وزن نہ دے سکا۔ اسلاف میں طویل عرصہ کی تدریس اور سالہا سال علماء و فقہاء سے علم حاصل کرنے کے باوجود افتاء کے مقام پر فائز ہونے کا رجحان نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ چند سالہ صحبت علمی اور معمولی سا ادراک پالینے سے فتویٰ نویسی یا افتاء کے عادی نہیں تھے۔ اور نہ ہی اس سلسلے میں وہ مخالف

کی خبر لینے میں مشتعل نفسیات کے مالک تھے۔ ان کے مقام عالی اور مرتبے کی عظمت کو دیکھ کر لوگ ان کے فتاویٰ کی قدر و قیمت جانتے تھے کہ یہ منصف مزاج ہیں فتویٰ دینے میں معتدل طبیعت کے مالک ہیں اور مسلکی تعصب کا شکار ہوئے بغیر فتویٰ دیا کرتے ہیں۔

اس لئے جو مفتی شرعی مسئلہ بتانا چاہتا ہے اس کے پاس کم از کم مسئلہ کا صحیح علم ہو اور ساتھ ہی ایمان و سچائی کا مادہ بھی۔ وہ قرآن مجید کی آیات اور صحیح احادیث کے ہوتے ہوئے بزرگوں کے اقوال یا غیر صحیح احادیث سے گریز کرے، کیونکہ یہ علم و صداقت نہیں۔ مفتی جو کچھ بھی اقتباس کے طور پر بتانا چاہے من و عن بتائے یا اس کی تلخیص کر دے۔ مگر اس میں تحریف یا تغیر نہ کرے۔ روایت اور فتویٰ دونوں کے لئے ایسی وصف کا ہونا بنیادی طور پر مسلم ہے۔ مفتی حق گوئی سے نہ تو دنیوی مصلحتوں کو سامنے رکھے اور نہ ہی دنیوی فتنوں کے خوف سے گھبرائے بلکہ حق بات کو واضح کر دے۔

اخلاق و کردار: مفتی اپنے معاملات میں درستی اختیار کرے، اور قول و فعل میں راستی پسند رہے۔ اندر، باہر، کھلے چھپے ہر حال میں دل کو زبان کے مطابق اور ظاہر و باطن کو یکساں رکھنے والا بنے۔ اگر حکومت کا ایک نمائندہ بڑی قدر سے دیکھا جاسکتا ہے اور اسے عزت و اکرام کے لائق سمجھا جاتا ہے۔ تو خالق کائنات کا یہ پیغامبر کتنے بلند مرتبہ والا ہونا چاہیے۔ اپنے منصب کی توقیر کرنا مفتی کے لئے فرض ہے۔ وہ اپنے مرتبے کی اچھی طرح دیکھ بھال کرے۔ دنیوی مصلحتوں کو سامنے رکھ کر یا دنیوی فتنوں سے گھبرا کر حق بات کو غیر واضح بیان نہ کرے اور نہ ہی حق کے بیان سے کبھی ہچکچائے۔

فہم و فراست: صحیح اور سچا فتویٰ وہی مفتی دے سکتا ہے جو صاحب فراست ہو۔ مسئلہ کو صحیح ادراک کرنا مفتی کی فراست کا امتحان ہوتا ہے۔ اس لئے وہ سب سے پہلے مسئلہ کی تہہ تک پہنچے اور پھر اس کا حکم کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ میں تلاش کرے۔ پھر اپنے فہم اور حکم کو ایک دوسرے سے ملا کر دیکھے۔ مطابقت ہو تو پھر بیان کرے ورنہ غلط قیاس سے ہر ممکن بچے۔ اگر نصوص (texts) موجود ہیں اور قابل فہم ہیں تو اپنی طرف سے بات کو طول نہ دے۔ بس انہی کو بیان کر دے۔ اگر نصوص (texts) موجود نہیں تو رائے و قیاس میں محمود رائے سے فتویٰ دینے کی اجازت ہے مگر محمود رائے بناتے وقت بھی تمام ائمہ فقہاء کے فتاویٰ و اقوال سے اولاً مستفید ہو جائے۔

غیر متعصب ہو: مفتی متعصب و تنگ نظر نہ ہو اور نہ ہی محدود علم و سوچ کا مالک ہو۔ وہ صحیح فتویٰ دیتے وقت تمام ائمہ ہدٰی کے اجتہادات و فتاویٰ سے مستفید ہو۔ پھر جسے بھی قرآن و سنت کے دلائل سے اقرب پائے اس کے مطابق وہ فتویٰ دے دے۔ اس کا ذہن تقلیدی نہ ہو اس لئے کہ مقلد مفتی فتویٰ دینے کا اولاً تو استحقاق ہی نہیں رکھتا دوسرا یہ کہ وہ مقلد ہونے کی وجہ سے جانب داری کو ترک نہیں کر سکتا اور یوں وہ درست فتویٰ دے ہی نہیں سکتا۔ اور اگر وہ فتویٰ دے بھی دے تو ایسے مقلد مفتی کے فتویٰ کی علماء کے ہاں کوئی حیثیت نہیں ہے کیونکہ یہ فتویٰ تو پہلے ہی سے موجود تھا۔ اس مفتی کا اس میں کیا کمال ہے کہ اسے مفتی کہا جائے۔

قرآن و حدیث کا عالم ہو: قرآن و حدیث کے خلاف کسی کا قول ہو تو مفتی کو اس کی طرف مائل نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ جس نے حدیث کے خلاف کچھ کہا ہے اسے یہ حدیث نہ ملی ہوگی یا اس سے صحیح وضعیف کی پہچان میں غلطی ہوگئی ہوگی۔ یہی معتدل رائے ہے۔ حدیث خواہ حجازی ہو یا کوئی، یمنی ہو یا شامی یا مصری۔ اگر وہ صحیح ہو تو مفتی اس کے مطابق ہی فتوے دے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

ولو بلغه الحديث فاعتمد. فكذلك عن
محمد لأن قول الرسول لا ينزل عن قول
المفتي.
اگر عالم کو حدیث ملے تو اس پر وہ اعتماد کرے۔ امام محمد
کے نزدیک یہی درست طرز عمل ہے۔ کیونکہ فرمودہ
رسول مفتی کے قول سے کم تر نہیں ہو سکتا۔

امام شافعیؒ سے پوچھا گیا کہ مفتی کون ہو سکتا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا:

اللہ کے دین میں فتویٰ دینا صرف اسی کے لئے جائز ہے جو کتاب اللہ کا ماہر ہو، احادیث پر بھی اس کی نظر کامل ہو، قرآن و حدیث کی وضاحت کے لئے کام آنے والے دیگر فنون یعنی لغت و شعر کا بھی عالم ہو۔ ان فنون کا پھر نہایت انصاف کے ساتھ استعمال کرتا ہو۔ لوگوں کے اختلاف پر بھی اس کی نگاہ ہو اور استنباط کا ملکہ بھی رکھتا ہو۔ جس شخص میں یہ اوصاف جمع ہوں وہ شریعت پر گفتگو کرنے اور حلال و حرام کے فتوے دینے کا اہل ہو سکتا ہے ورنہ نہیں۔ (اعلام الموقعین - ص 49)

امام احمدؒ سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:

”جب کوئی فتویٰ دینے کے عہدے پر آنا چاہتا ہو تو اس کے لئے قرآن، احادیث اور ان کی اسانید کا عالم ہونا ضروری ہے۔ ورنہ اس کیلئے فتویٰ دینا جائز نہیں۔“

وہ مفتی جو قرآن و حدیث سے لوگوں کے استفتاء کا جواب مزین کرتا ہے اس کا فتویٰ اس قابل ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ ایسا فتویٰ جس میں غیر مستند کتب کے حوالے ہوں اور قرآن و سنت سے مستفاد نہ ہوں، ان کی حیثیت ایک رائے کی ہو سکتی ہے جسے مانا بھی جاسکتا ہے اور نہیں بھی۔ بشرطیکہ معاملہ سخت نہ ہو۔ اکثر علماء نے مفتی کیلئے اجتہاد کی شرط ضروری قرار دی ہے۔ یعنی وہ مجتہد ہو۔ اس صورت میں مقلد کے فتویٰ کو نہ فتویٰ کہا جاسکتا ہے اور نہ ہی اسے مفتی تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ایسی شرط درست نہیں کیونکہ علم فقہ کی ایک فرع (Branch) ہے۔ یعنی جس میں فقہاء نے جزئی واقعات کے بارے میں فروعی احکام بیان کئے ہیں تاکہ بعد میں آنے والے قوت استنباط سے محروم لوگ ان سے مستفید ہو سکیں۔ چونکہ اس میں کسی اجتہادی کاوش کا دخل نہیں اس لئے مقلد بھی مفتی ہو سکتا ہے۔

فتویٰ نویسی کا اسلوب: اسلاف میں فتویٰ نویسی یا افتاء کا اسلوب بہت سہل، مختصر اور سادہ تھا۔ واضح زبان اور تحریر میں گیرائی و گہرائی کے ساتھ جامعیت ہوتی تھی۔ مخاطب کی رعایت الدین یسر کی روشنی میں کی جاتی تھی۔ اولاً تو کوشش یہی ہوتی کہ صورت مسئلہ کی وضاحت کو قرآن مجید سے تلاش کر کے اسے حدیث رسول ﷺ سے مزین کر دیا جائے۔ بصورت دیگر احادیث رسول ﷺ سے سائل کی تشفی کرا دی جاتی۔ صحابہ کرامؓ کے فتاویٰ ہمیں ایسے ہی نظر آتے ہیں۔

اسلاف کے اسی منہج کو سامنے رکھ کر فتویٰ نویسی کے اسلوب کو یوں متعین کیا جاسکتا ہے۔

☆..... جواب باحوالہ ہو۔ یعنی کتاب کا نام، جلد نمبر اور صفحہ نمبر بھی لکھا جائے۔

☆..... حوالوں میں قرآن مجید اور احادیث رسول ﷺ کو ہر صورت میں فوقیت ہو۔ کیونکہ سوال کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ قرآن و

حدیث کی روشنی میں فتویٰ طلب کیا جائے۔ یہ نا انصافی ہوگی کہ جواب کسی خاص مکتب فکر کا دے دیا جائے۔

☆..... احادیث رسول میں بھی صحیح احادیث کا انتخاب ہو۔ ضعیف احادیث و اقوال علماء و فقہاء سے اجتناب کرنا چاہیے۔

☆..... صحیح حدیث اگر مل جائے تو بعد کے فقہاء کے تائیدی فتاویٰ بھی نقل کئے جاسکتے ہیں۔ ورنہ حدیث پر اکتفاء ہی کافی ہوگا۔

☆..... اگر صحیح حدیث نہ ہو تو پھر ضعیف حدیث یا اقوال فقہاء ناگزیر صورت میں پیش کئے جاسکتے ہیں اور ان کے مطابق

فتویٰ دیا جاسکتا ہے۔

فتویٰ نویسی کی ایک مختصر تاریخ: رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی اہل اسلام کے لئے ایک ایسا سرچشمہ تھی جس سے وہ ہمہ وقت اپنی دینی و دنیاوی پیاس بجھاتے تھے۔ اچانک پیش آنے والا واقعہ ہو یا عرصہ بیشتر کا، اس کا حل آپ ﷺ سے ہی مانگا کرتے تھے۔ بعض اوقات آپ ﷺ فوراً جواب عنایت فرمادیتے۔

اور اگر اس سلسلے میں کوئی ربانی ہدایت نہ ہوتی تو وحی کا انتظار فرماتے۔ اور وحی کے بعد آپ ﷺ مسائل کو جواب دیتے۔ شرعی مسئلہ بتانے میں پیارے رسول ﷺ بھی بڑے محتاط تھے۔ آپ ﷺ کے جوابات (فتاویٰ) وحی الہی سے ہی ہوتے تھے۔

رسول اکرم ﷺ کے فتاویٰ کو اگر بغور دیکھا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ آپ ﷺ نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ بہت ہی مختصر الفاظ میں بیشمار احکامات کو سمو دیا ہے۔ یہ الفاظ بڑی گہرائی و گیرائی رکھتے ہیں۔ یہ فتاویٰ آپ ﷺ کی پیروی کرنے، انہیں فیصلہ کن ماننے، اور اپنے تمام تر جھگڑوں اور اختلافات کو مٹانے و ختم کرنے میں قرآن کی مانند ہیں۔ آپ ﷺ کے بعد منصب فتویٰ پر آپ ﷺ کے اصحابؓ فائز ہوئے جو اسلام کے ستون اور کلام اللہ و سنت رسول اللہ کی عملی تصویر تھے۔ طہارت قلب، وسعت علم، بے تکلفی اور واضح نقطہ نظر رکھنے میں اپنی مثال آپ تھے۔ دین کے سب سے زیادہ سچے خیر خواہ، خدا ترسی میں یکتا یہ بندگان خدا فتویٰ دینے میں بھی بہت محتاط تھے۔ اللہ تعالیٰ نے دین میں وسعت پیدا کرنے اور حد درجہ احتیاط سے قدم اٹھانے کا کام ان سے لیا۔ انکی تعداد ایک سو تیس سے کچھ اوپر تھی جن میں خواتین بھی تھیں۔ اُعلام الموقعین میں امام ابن القیم رحمہ اللہ نے ان کا مختصر حال لکھا ہے۔

یہ سب حضرات زبانی اور تحریری دونوں طریقوں سے فتویٰ جاری کرتے تھے۔ مدینہ سے باہر جہاں بھی رہے لوگ اپنے مسائل انہی کے پاس لاتے۔ مزید برآں سنت رسول ﷺ سے واقف ہونے کے لئے بھی ان کے حلقوں سے مستفید ہوتے۔ یہ سلسلہ تقریباً حضرت انس بن مالکؓ کی وفات یعنی پہلی صدی ہجری کے آخر تک چلتا رہا۔

تابعین کے دور میں فتویٰ: اسی دوران تابعین کی ایک نسل تیار ہو کے اپنی علم و فضل سے دنیا کو نوازا رہی تھی۔ ان میں انہی حضرات صحابہؓ کے شاگردوں میں سعید بن المسیب، عروہ بن الزبیر و دیگر فقہاء شامل ہیں۔ جنہیں فقہاء سبعہ کہا جاتا ہے۔ جن کو منظور کسی نے یوں پیش کیا گیا ہے۔

إذا قيل من في العلم سبعة أبحر روايتهم ليست عن العلم خارجة
فقل هم عبيد الله، عروہ، قاسم سعيد، أبوبكر، سليمان، خارجة

ترجمہ:

جب تم سے یہ پوچھا جائے کہ علم کے وہ سات سمندر کون ہیں جن کی روایت ہی یقین و اذعان بخشی ہے۔ تو تم کہو وہ حضرات عبيد اللہ، عروہ، قاسم، سعيد، ابوبکر، سليمان اور خارجہ ہیں۔

ان سات فقہاء کے علاوہ دیگر تابعین بھی مفتی تھے۔ جنہوں نے اپنی علمی وسعت و بصیرت کی وجہ سے جگہ جگہ اس خلا کو پر کیا۔ مکہ، بصرہ، کوفہ، شام، مصر اور یمن میں یہ سب لوگ اس منصب پر فائز معاشرے کی دینی و اصلاحی راہنمائی میں مصروف رہے۔ ان تمام کا منہج فتویٰ و افتاء قرآن و سنت کے بعد صحابہ کرامؓ کے اجماعی فیصلے اور بعد میں انفرادی فتوؤں پر مبنی تھا۔ اپنی بات یا کلام لکھے جانے کو بہت کم روئے سمجھتے تھے۔ اور اس پر بڑی سختی سے قائم تھے۔ یہ مسلک بھی تھا کہ فتویٰ پایا اور اس کے خلاف صحابہؓ سے کسی کا فتویٰ نہیں ہے۔ تو بس اسی پر قناعت کر لی جائے۔ اور اپنی اجتہادی کوشش سے باز رہا جائے۔

زمانہ خیر کے بعد فتویٰ: دوسری صدی ہجری میں قرون اولیٰ کے اس منہج میں اہل علم کے درمیان کچھ اصولی اور عقلی بنیادوں پر اختلافات رونما ہوئے۔ اس طرح اصولی نقطہ نظر کی تبدیلی سے فقہاء کے درمیان دو گروہ ہو گئے۔

وہ گروہ جو استنباط مسائل میں یا افتاء میں احادیث و فتاویٰ صحابہؓ کی بنیاد پر فتویٰ دیتا تھا اور مفروضہ مسائل میں شرعی حکم بیان کرنے سے مجتنب تھا۔ یہ محدثین کی جماعت تھی جس میں مجازی علماء و فقہاء کی غالب اکثریت تھی۔

دوسرے گروہ کے نمائندے فقہاء عراق تھے جن کی غالب اکثریت تھی جنہوں نے بعض قواعد بنائے اور انہی کی روشنی میں پیش آمدہ مسائل اور مستقبل میں پیش آنے والے مسائل کو مفروضی شکل میں تحریر کر دیا۔ اس کی وجہ غالباً یہی بیان کی جاسکتی ہے کہ اہل عراق کے ان فقہاء کے پاس صحیح احادیث کم تھیں۔ باقی موضوع احادیث کیلئے تو عراق ایک ٹکسال تھا۔ یہ فقہاء کسی بھی حدیث کو قبول کرنے میں محتاط تھے اس لئے ان کے ہاں رائے اور قیاس کا استعمال

بکثرت تھا۔ جنہیں بعد میں کتب فقہ میں اور کتب فتاویٰ میں جگہ دے دی گئی۔

بعد کی نسلوں میں انہی کے تبعین اور مقلدین نے اپنے اپنے مسلک کی توجیہ و تائید میں کتب لکھیں۔ اور یوں دو انتہائیں سامنے آ گئیں۔ ایک نصوص میں اتنا منہمک ہوا کہ فقہ نظر انداز ہو گیا اور دوسرا اصول و فروع میں اتنا گم ہوا کہ نصوص اسے نظر نہ آئیں۔ انہی میں کچھ ایسے مجتہدین بھی ظاہر ہوئے جنہوں نے نصوص اور فقہ کو باہم ساتھ لیا اور جمود و سابقہ منہج آراء و قیاس سے آزاد ہو کر سلف صالحین کے اس منہج کو اپنایا جو اجتہادی تھا۔ انہوں نے وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اس کا علاج کیا اور بخوبی کیا۔ اس طائفہ کے سرخیل شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ تھے۔ ان کے اس طریقہ کار کا اثر مصر و شام اور دیگر بلاد عربیہ پر خاصا ہوا۔ ایسی روشن فکر نے جمود و قیاسات کی دیواریں توڑ دیں اور ہر جگہ نصوص و فقہ سے استفادہ کا رجحان بڑھا اور بہتر نتیجہ دیکھنے میں آیا۔

خلافت عثمانیہ نے جب ۱۲۸۶ھ میں مجلۃ الاحکام العدلیہ کی تدوین کی تو پہلی بار مذاہب اربعہ سے ہٹ کر بعض مسائل میں امام ابن شبرمہ کے مسلک پر فتویٰ بھی دیا گیا۔ ۱۹۲۹ھ اور ۱۹۳۶ھ میں مصر نے بھی اسی ڈگر پر چلنے کی کوشش کی۔ برصغیر میں بھی بڑے بڑے علماء نے اپنے اپنے مسلک سے ہٹ کر دیگر مسالک پر فتوے دیے۔ اور اس کی تائید میں کتب لکھیں۔ جن میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی شامل ہیں اور ان کی اولاد و تلامذہ کی کثیر تعداد شامل ہے۔ پاکستان میں بھی بیشتر عالمی مسائل کا نفاذ انہی اجتہادی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ جن میں اکثر مستحسن ہیں اور بعض دین سے جہالت پر مبنی اور خواہشات کا پلندہ ہیں۔

افتاء کی نوعیتیں: اسلاف میں افتاء کی نوعیتیں۔ وقت، زمانہ اور تحقیق کے اعتبار سے بدلتی رہیں۔ کہیں اجتہاد ہوا تو سابقہ مسائل نظر انداز کرنا پڑے۔ یا ان کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ کہیں دلیل ملی تو اپنی سابقہ رائے سے رجوع کرنا پڑا اور کہیں اپنے محترم استاذ کی رائے سے بھی مختلف رائے اس معذرت کے ساتھ دینا پڑی کہ اگر آج میرے استاذ بھی حیات ہوتے تو اس دلیل اور حجت کو پا کر اپنی رائے سے رجوع کر لیتے۔ یہ سب انداز، کتب فقہ میں اور ہم عصر فقہاء کی کتب فتاویٰ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

مگر ہمارے یہاں فتویٰ کی ایک اور قسم رائج ہو گئی ہے جو یقینی طور پر غیر شرعی ہے۔ کہ فلاں ملک اسلام دشمن ہے یا فلاں شخص فلاں دشمن کا ایجنٹ ہے اس کی مصنوعات کو خریدنا جائز نہیں وغیرہ۔ یہ دوسری قسم کا فتویٰ حقیقتاً فتویٰ نہیں وہ یک طرفہ طور پر ہدایت جاری کرنا ہے اور اس قسم کی ہدایت جاری کرنے کا اختیار ایک قائم شدہ حکومت کو ہے نہ کہ کسی مفتی کو۔

فتویٰ کی اہمیت: فتویٰ کی ہمارے دین میں غیر معمولی اہمیت ہے۔ اس لئے کہ جس فتویٰ کو علم و صداقت سے صادر کیا جائے وہ ایک حجت ہے۔ جس کے بعد آدمی کے پاس کوئی عذر نہیں رہتا۔ مگر اسے قانوناً نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ دراصل دونوں جانب یعنی مفتی اور مستفتی کی خدا خونی کا معاملہ ہے۔ خدا خونی نہ ہو تو مفتی، قاضی سے بھی زیادہ گناہ گار ہوتا ہے۔ اس لئے کہ مفتی کو فی الفور جواب دینا پڑتا ہے اور قاضی کو سوچنے اور غور کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ قاضی کی بہ نسبت مفتی زیادہ سلامت رہتا ہے۔ مفتی اپنے فتوے کو لازم و نافذ تو نہیں کرتا صرف وہ سائل کا جواب دیتا ہے۔ جو اگر چاہے تو قبول کر لے یا رد کر دے۔ مگر قاضی کا فیصلہ اٹل ہوتا ہے اور نافذ بھی۔ مزید یہ کہ قاضی کے حق میں جو وعید آئی ہے وہ مفتی کے حق میں نہیں۔

مذہبی بنیاد پر دیا جانے والا فتویٰ جس میں آراء و قیاس یا بزرگوں کی باتیں ہوں۔ ہمیشہ تعصب پر مبنی فتویٰ ہوتا ہے۔ جسے ایک معتدل آدمی ماننے سے انکاری ہوتا ہے۔ مفتی کو چاہیے کہ وہ فتویٰ دیتے وقت سائل کے مسئلے کو سمجھے اور اپنے مسلکی خول سے باہر آ کر دیگر فقہاء کرام کی آراء سے بھی سائل کو آگاہ کرے۔ اور پھر بعد میں جو حق کے قریب بات ہو اس کی روشنی میں جواب دے۔

فتاویٰ کی تاریخی اہمیت: گو کتب فتاویٰ، فقہاء کے ہاں تیسرے درجے کی کتب شمار ہوتی ہیں۔ مگر ان فتاویٰ کی بلاشبہ اہمیت غیر معمولی ہے۔ مثلاً:

- ماضی کے مختلف ادوار میں مسلمانوں کے سماجی، سیاسی، تمدنی اور فکری حالات کا علم ہوتا ہے۔
- فتاویٰ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کو کب اور کس طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اور علماء فقہاء وقت کا

موقوف کیا رہا۔

- ہر زمانہ کے اور ہر علاقے کے رسم و رواج اور مروجہ بدعات و خرافات کی تصویر بھی ان کتابوں سے نظر آتی ہے۔
- علماء کے فتاویٰ پر عوام کا رد عمل کیا ہوتا تھا۔
- مفتیان کرام کی سلاطین و امراء اور طلبہ و عوام سے تعلقات کیسے تھے۔
- ہر زمانے میں کن علماء کو فتویٰ نویسی یا افتاء کے مناصب ملے یا شہرت نصیب ہوئی۔
- ان کے علم و فہم اور بصیرت کا کیا حال تھا۔

اسی طرح دیگر باتیں جو تذکرہ نگاری اور سوانحی خاکوں کے مددگار ہو سکتے ہیں اور جن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

آج کے فتاویٰ: ہمارے یہاں ہر مسلک کے فتاویٰ میں مسلکی چھاپ نمایاں ہوتی ہے۔ اور اسی نقطہ نظر کی تائید کیلئے اپنے مسلک کی فقہی کتب سے اقتباسات ماخوذ ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں مسئلے کی مختلف صورتیں اور ان کے مختلف جوابات تحریر کئے جاتے ہیں۔ اور بعض فتاویٰ میں جواب کی علت بتانے کے لئے قیاس اور عقلی توجیہات کا سہارا بھی لیا جاتا ہے۔ مگر عموماً کتاب و سنت سے نصوص پیش کرنے کا اہتمام کم ہی ہوتا ہے۔ اگر کہیں احادیث کا ذکر ہوتا بھی ہے تو:

اولاً: ان میں صحیح، ضعیف اور مرفوع و موقوف کے درمیان کوئی تمیز نہیں ہوتی۔

ثانیاً: صحیح حدیث اگر ہو بھی سہی تو اس کا استدلال غیر محل میں ہوتا ہے۔

ثالثاً: سارا زور اپنے مذہب کے مطابق مسائل کی تخریج یا اپنے مسلک کے مختلف علماء کے متعارض اقوال کے درمیان

تطبیق و ترجیح میں صرف ہوتا ہے۔ حالانکہ ان اقوال میں باہم اتنا اختلاف ہوتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

رابعاً: دوسرے مذاہب کے علماء کے اقوال دلیل کے بغیر درج کر دیے جاتے ہیں۔ ان پر تسلی تب ہوتی ہے جب ان مآخذ کی طرف رجوع کر لیا جائے۔

ایسے فتوے عموماً مذہبی بنیادوں پر دیے جاتے ہیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ اپنے مذہب کا آدمی اسے قبول کر لے مگر یہ اپنی افادیت کھو بیٹھتے ہیں۔ تفریق بین المسلمین

کا سبب بھی بنتے ہیں۔ مفتی کا رعب و دبدبہ بھی فروعی مسائل میں پڑ کے جاتا رہتا ہے۔ ایسے فتویٰ کی حیثیت کیا باقی رہ جاتی ہے وہ عوام کی توجہ یا عدم توجہ پر یا

رد عمل پر مبنی نتیجہ ہوتا ہے۔ جسے مفتی حضرات خود جان لیتے ہیں۔ اس لئے خواہ کسی کی رائے سے بھی ہو، اور اس میں مذہبی عصبيت کا عنصر بھی ہو ایسا فتویٰ بالکل

نہ دیا جائے ورنہ وہ ایک مذموم کوشش ہوگی۔ ہاں مفتی اگر بے بس ہو جائے تو بوقت ضرورت اجتہاد کر کے رائے سے کام نکال لے۔ لیکن کسی کو یہ مت کہے کہ

اس کا ماننا لازم ہے اور نہ ہی اس پر عمل ضروری بتائے۔ حضرت عمرؓ نے قاضی شریح کو یہ لکھا:

جب کوئی مسئلہ آپ کتاب اللہ میں پائیں تو اسی کے مطابق فیصلہ دیجئے۔ دوسری طرف توجہ ہی نہ کیجئے۔ پھر سنت کو ٹٹولیں ان دونوں میں نہ ملے تو جہاں صحابہؓ

اجماع کریں اس سے فیصلہ کیجئے۔ اور اگر اتفاق سے ایسا مسئلہ سامنے آجائے جس کا ذکر نہ قرآن میں ہو اور نہ ہی حدیث میں اور نہ ہی آپ سے پہلے کسی نے

اس مسئلہ میں گفتگو کی ہو۔ اس صورت میں اگر آپ چاہیں تو اپنی رائے سے اجتہاد کر لیجئے اور اگر توقف کر سکیں تو ضرور کیجئے۔ میرے نزدیک آپ کا پیچھے ہٹ

جانا بہ نسبت آگے بڑھنے اور اجتہاد رائے کرنے کے زیادہ بہتر ہے۔

امام احمدؒ نے امام شافعیؒ سے سوال کیا کہ رائے و قیاس سے کسی چیز کے بارے میں کچھ کہنا کہاں تک جائز ہے؟۔ انہوں نے جواب میں کہا: بوقت ضرورت،

بقدر ضرورت، نہ زائد اور نہ ہی اسے شاخ در شاخ لے جانا جائز، نہ اسے پھیلا نا جائز اور نہ اسے بڑھانا جائز۔ یہی سلف کا طریقہ رہا۔ (اعلام الموقعین - ص ۶۲)

سائل کو بھی علماء نے یہ نصیحت کی ہے کہ وہ مفتی سے سوال کرتے وقت کچھ معیارات ضرور قائم کرے۔ مثلاً: مسئلہ پوچھنے والا اپنے عالم سے گزارش کرے کہ

براہ مہربانی مجھے اس مسئلے کا جواب قرآن و سنت کی رو سے دیا جائے اور دوسرے ائمہ حضرات کی رائے سے بھی مطلع فرمائیں تاکہ میں اپنی سہولت کے مطابق

جس کی رائے پر چاہوں عمل کر سکوں۔ علماء کو بھی چاہیے کہ وہ دیانتداری سے سب کی آراء پوچھنے والے کو بتادیں۔ اس طرح وہ خود بھی خطا کے احتمال سے محفوظ رہیں گے۔

مفتی بدلتا رہے: شرعی مسائل کی صحیح معلومات کے لئے اور دوسرے علماء و فقہاء کے علم سے مستفید ہونے کے لئے سائل کو ضرور ایسا کرنا ہوگا۔ تاکہ کسی کے محدود علم میں خود محدود نہ ہو جائے۔ پہلے لوگ مفتی کیا مجتہد بھی بدل دیا کرتے تھے۔ صحابہ کرامؓ ہوں یا بعد کے اسلاف ان کی اکثریت متفق تھی کہ اگر فقہاء و علماء موجود ہوں تو کسی سے بھی فتویٰ لیا جاسکتا ہے۔ شرح مسلم الثبوت: ۶۳ میں ہے:

أجمع الصحابة على أن من استفتى أبا بكر
وعمر أمير المؤمنين فله أن يستفتي أبا
هريرة ومعاذ بن جبل وغيرهما ويعمل
بقولهم من غير تكبر.

یہ اجماع صحابہ ہے کہ کوئی اگر حضرات ابو بکر و عمر و اہل
ایمان کے امیر ہیں۔ ان سے فتویٰ پوچھے تو وہ حضرت
ابو ہریرہ اور حضرت معاذ بن جبل اور ان کے سوا دوسروں
سے فتویٰ پوچھ کر بھی بغیر کسی ملامت کے عمل کر سکتا ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں:

قال ابن الهمام في آخر التحرير: كانوا
يستفتون مرة واحدا ومرة غيره، غير ملتزمين
مفتياً واحداً

ابن الہمام۔ التحریر۔ کے آخر میں لکھتے ہیں: لوگ بھی
کسی سے فتویٰ پوچھتے تھے اور کبھی کسی سے۔ کسی ایک
مفتی کا التزام نہیں تھا بلکہ بدلتے رہتے تھے۔

احناف میں بھی قدرے اس پر عمل ہے۔ روا المختار میں لکھا ہے: عبادات میں فتویٰ ہمیشہ امام ابو حنیفہؒ کے قول پر ہوگا۔ مسائل ذوی الارحام میں امام احمدؒ کے قول پر اور مسائل وقف، قضاء اور شہادات میں امام ابو یوسفؒ کے قول پر اور سترہ مسئلوں میں امام زفرؒ کے قول پر فتویٰ ہوگا۔ مگر امام صباغیؒ حنفی اس کے خلاف ہیں۔ وہ نماز میں امام ابو حنیفہؒ کے قول پر فتویٰ دیا کرتے، باقی مسائل خواہ عبادات ہوں یا غیر عبادات سب میں امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے قول پر فتویٰ دیا کرتے تھے۔ (روا المختار۔ جلد ۱، ۵۳، ۱۶۱ جلد ۲/۳۰۵)

غلط فتویٰ کی سبب: مفتی فتویٰ دینے سے قبل جائین کے حالات کا بھی اچھی طرح جائزہ لے۔ محض سائل کے سوال پر اکتفاء کر کے فتویٰ دینے کا شوق پورا نہ کرے۔ کیونکہ شنیدہ کے بود ماند دیدہ والی بات ہی کچھ اور ہے۔ اس میں مفتی کا بھی شرح صدر ہوتا ہے اور فریق ثانی بھی مفتی کے مقام اور تقدس کا احترام کرتا ہے۔ ورنہ مفتی حضرات کی سادگی فریق ثانی پر جب نمایاں ہوتی ہے تو مقام و احترام تو کجا لوگ دین کو اور اہل دین کو برا بھلا کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس لئے یہ اسلام کا طریقہ نہیں کہ کوئی شخص محض کسی کی مخالفت میں ذہن میں کوئی بات لائے۔ اس کو سوال بنائے یا اس قسم کا ایک مضمون استفتاء کیلئے بنائے کہ: فلاں دار العلوم میں یا کسی بھی دینی ادارہ میں پڑھنا، تعاون کرنا جائز ہے یا ناجائز۔ اور پھر مفتی صاحبان اس پر الجواب صحیح کی مہر کے ساتھ تفصیلی جواب دینا شروع کر دیں۔ اور جسے چاہیں چھری سے ذبح کرنا شروع کر دیں۔ عموماً ایسے فتوؤں میں مصیطر بننے کی کوشش کی جاتی ہے جو انتہائی نامناسب ہے۔ اولاً تو اس قسم کا سوال پوچھنا بھی اسلامی روح کے خلاف ہے اور اس کا جواب دینا بھی اسلامی روح کے خلاف۔ صحابہ و تابعین کی مثال بتاتی ہے کہ وہ حاکمانہ ہدایات کبھی جاری نہیں کرتے تھے۔ اس کی بجائے وہ دعوت و تبلیغ کا کام کرتے تھے مثلاً لوگ اگر سنت رسول کو چھوڑ رہے ہوں یا خواتین کو بے حجاب کیا جا رہا ہو یا انہیں فحاشی میں مبتلا کرنے کی کوشش ہو رہی ہو تو صحابہ و تابعین کی سنت کے مطابق، ایسے لوگوں میں دعوت و تبلیغ کا کام کرنا چاہئے نہ کہ بائیکاٹ کا فتویٰ صادر کرنا۔ نتیجہ کے اعتبار سے اس قسم کا فتویٰ سراسر لاجواب ہے۔ انسان کی اصلاح قلب و ذہن کے بدلنے سے ہوتی ہے نہ کہ فتاویٰ جاری کرنے سے۔ اسی طرح دیگر غلط فتوے جو حقائق کو چھپا کر یا تلبیس کے ساتھ دے اس سے بھی مفتی باز رہے۔ سنن ابی داؤد میں ہے۔

دو شخص میرے نام سے وہ بات کہے جو میں نے کہی
نہیں وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنا لے۔

﴿مَنْ قَالَ عَلَىٰ مَالِهِ أَقْلَهُ قَلِيلًا مَّقْعَدُهُ مِنَ

النَّارِ﴾

لا علمی پر فتویٰ دینا ایک سنگین گناہ ہے۔ علم کے ہوتے ہوئے غلط فتویٰ دینا اس سے بھی زیادہ بڑا گناہ ہے۔ اگر کوئی اپنے مسلمان بھائی کا بھلا کسی اور چیز میں دیکھتا ہے مگر اسے غلط اور الٹا مشورہ دیتا ہے تو یہ بہت بڑی بددیانتی ہے۔ اس لئے جتنا خطرہ مفتی کو اس سلسلے میں ہوتا ہے قاضی کو بھی ہو سکتا ہے۔ مگر مفتی کے فتویٰ کی سنگینی اس اعتبار سے بڑھ جاتی ہے۔ کہ اس فتویٰ کا مستفیق اور عوام دونوں پر اثر ہوتا ہے۔ جس پر وہ کسی بھی وقت عمل کر سکتے ہیں۔ لہذا جس طرح صحیح فتوے کا اجراء ثواب میں بہت بڑا اجر رکھتا ہے اسی طرح غلط فتوے کا اجراء گناہ اور برے نتائج میں بھی بڑا گہرا اثر رکھتا ہے۔ فتوؤں میں بغیر علم کے زبان کھولنا قرآنی آیات کی رو سے تمام حرام کاموں میں سب سے بڑھ کر حرام کام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

کہہ دیجئے بلاشبہ میرے رب نے تم جو چیزیں میرے رب نے حرام کی ہیں وہ تو یہ ہیں بے شرمی کے کام خواہ وہ کھلے ہوں یا چھپے، اور گناہ اور حق کے خلاف زیادتی اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرو، جس کے لئے اس نے کوئی سند نازل نہیں کی، اور یہ بھی کہ اللہ پر وہ باتیں چھانٹی جائیں جو تم جانتے ہی نہیں۔

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّي الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزَّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ (الاعراف: 33)

اس باب میں حرمتوں کی ترتیب درج ذیل ہے۔

♦ فحش کام حرام ہیں۔ (سب سے ہلکا گناہ)

♦ گناہ اور ظلم کرنا۔ (ذرا بڑا گناہ)

♦ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا۔ (اس سے بڑا گناہ)

♦ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر وہ بات کہنا جس کا علم نہ ہو۔ (سب سے بڑا گناہ)

خواہ وہ بات اللہ تعالیٰ کے نام یا صفات سے متعلق ہو یا اس کے کام سے۔ یا اس کے دین اور اس کی شریعت کے کسی بھی معاملے میں وہ بات ہو، سب سے بڑا جرم ہے اور سب کو شامل ہے۔ ایک اور آیت میں ارشاد فرمایا:

اپنی زبان سے جھوٹ موٹ اللہ پر بہتان باندھ کر نہ کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے۔ یاد رکھو! اللہ پر جھوٹ باندھنے والے نجات سے محروم رہتے ہیں۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ السُّنْتُكُمُ الْكُذِبَ هَذَا حَلَالٌ وَهَذَا حَرَامٌ لِتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ ط إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ لَا يُفْلِحُونَ (حل: 117)

یہ وعید ہے ان حضرات کے لئے جو اللہ کے احکام میں جھوٹ اور غلط بات شامل کر دیتے ہیں۔ یا خود سے غلط تاویلات کر کے اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ آدمی کو اللہ کے حرام و حلال کا علم نہ ہو تو اسے کسی بھی صورت میں کسی چیز کو حلال یا حرام نہیں کہنا چاہیئے۔ یہ کلمات کہ: اسے اللہ نے حرام کیا ہے یا یہ شریعت میں حلال ہے۔ وغیرہ۔ کہنے سے حتی الامکان اجتناب کرنا چاہئے ورنہ ایسا آدمی اللہ کی نظر میں جھوٹا اور ظالم ہے۔ چونکہ تقویٰ، احساس ذمہ داری محتاط گفتگو، عدم تعصب، علم و بصیرت جیسی صفات ہمارے مفتیان اسلاف میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اس لئے پہلے مفتیان کرام میں اور آج کے مفتیوں میں بڑا فرق ہے۔ جو فضیلت اسلاف کو حاصل تھی اس سے آج کے مفتی محروم ہیں۔ اِلا ما شاء اللہ۔

اختلاف اقوال اور فتویٰ : اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کہ مسلم علماء و فقہاء کے ہاں ہر دور میں اجتہاد ہوا ہے۔ ان اجتہادی کوششوں میں آپس میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ بعد کے ادوار میں بھی ایسا ہو رہا ہے۔ اس لئے فتویٰ دینے میں فقہاء کے مختلف اقوال و اجتہادات مفتی کے سامنے آجائیں تو ایسی صورت میں مفتی کو کیا کرنا چاہیے؟ مولانا عبدالحی لکھنویؒ امام الکلام میں فرماتے ہیں:

جو نظر انصاف رکھتا ہے اور کتب فقہ و اصول کے سمندروں میں غوطہ زن ہوتا ہے وہ یقیناً جان لے گا کہ بیشتر فروعی و اصولی مسائل میں علماء کا اختلاف ہے۔ لہذا محدثین کرام کا نکتہ نظر ہی اوروں کے نقطہ نظر سے قوی تر ہوتا ہے۔ میں جب بھی اختلافی مسائل سے گزرتا ہوں تو مجھے محدثین کا فیصلہ ہی انصاف کے قریب ترین نظر آتا ہے۔ بخدا ان کا کیا کہنا، اللہ ہی ان کو جزا دے گا۔ وہ کیوں نہ دے یہی تو سچے وارث نبی ہیں اور شریعت کے کھرے نمائندے۔ اللہ ہمارا حشران کے ساتھ کرے اور ان کی محبت و سیرت پر ہی ہمیں دنیا سے اٹھائے۔

﴿من نظر بنظر الانصاف و غاص في بحار الفقه و الأصول متجنباً عن الاعتساف، يعلم علماً يقينياً أن أكثر المسائل الفرعية و الأصلية التي اختلف العلماء فيها. فمذهب المحدثين فيها أقوى من مذاهب غيرهم واني كلما أسير في شعب الاختلاف أجد قول المحدثين فيه قريباً من الانصاف، فله درهم عليه شكرهم. كيف لا! وهم ورثة النبي صلى الله عليه وسلم و نواب شريعته صدقاً، حشرنا الله في زمرةهم، و أمانتنا على حبهم و سيرتهم﴾

آخری گزارش

ہمارے علماء و دانش ور حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ صراطِ مستقیم وہی راہ ہے جس پر جناب رسالت مآب ﷺ چلے۔

نیز اس کی یہ بھی ہدایت ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر مت چلو کہیں وہ تمہیں اس کی راہ سے بھٹکا نہ دیں۔

وَأَنَّ هَذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ۚ ذَلِكُمْ وَصَّكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ O (الأنعام: 153)

آپ ﷺ ہی اللہ کے پیامبر، اس کے احکام کے شارح، اسی کی شریعت کے حامل اور اس کے محرم راز و مفسر تھے تو کیا یہی کافی نہیں کہ تمام راہوں کو چھوڑ کر آپ ﷺ ہی کا بتایا ہوا صراطِ مستقیم ہی اپنالیا جائے جو بالکل سیدھا راستہ ہے جس میں کوئی پیچ و خم نہیں اور جس میں کوئی کمی نہیں۔ جب کہ دوسرے راستے اختیار کرنے سے منع فرمایا گیا جن میں پڑنے سے آدمی بھٹک جاتا ہے، ہدایت گم ہو جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم نے جناب سیدنا علیؑ، امام ابوحنیفہؒ، بریلی اور دیوبند وغیرہ مقامات و شخصیات کے نام سے جو فرقے اور مسلک ایجاد کئے ہیں ان کا جواز کیا ہے؟ کون سی ایسی ضرورت پڑ گئی کہ ایسے مسالک کا ایجاد کرنا امت کیلئے ناگزیر ہو گیا؟ آیات و احادیث اور ائمہ کرام کے بے شمار اقوال و غیرہ تو ان فرقوں کی تردید میں مل جاتے ہیں مگر ان کا جواز آخر کہاں سے لیا گیا؟ مزید یہ چند باتیں بھی قابل غور ہیں:

☆ کیا ہماری اس محبت و عقیدت کا یہ غلو کہیں لوگوں کی نظر میں دیگر غیر معصوموں کو معصوم تو نہ بنا دے گا۔ کہ وہ غیر نبی کو معصوم قرار دے کر اسے بھی نبی بنا لیں یا نبی کا درجہ دے بیٹھیں۔

☆۔ کیا ہم نے یہ سوچا کہ ان شخصیات کو معصومیت کا درجہ دے کر کہیں انہیں رسول اکرم ﷺ کے مقابل تو کھڑا نہیں کر دیا؟ اگر انہیں معصومیت کا مقام ہی دینا ہے تو پھر مرزا غلام احمد قادیانی کذاب کے دعوے کو اور اس کے چیلوں کو اور اباحت و تجدد کی آڑ میں قرآن مجید کی من مانی تاویل کرنے والوں کو اور رسول اکرم ﷺ کی احادیث پاک کے منکروں کو اور آپ ﷺ کی سیرت سے نفرت کرنے والوں کو ہم کیوں کا فر قرار دے رہے ہیں اور انہیں کیا دلائل فراہم کر رہے ہیں؟

☆۔ ہم نے سوچا کہ ایک فرقہ سے نکلنے والے کئی فرقے، ان کے منتشر افکار اور ایک دوسرے کے خلاف تکفیری فتوے، کیا یہ سب کچھ رحمت ہے یا زحمت؟

☆۔ ہم نے سوچا کہ یہ قرآن مجید کا ہمارے لئے پہلا اور زندگی کا آخری درس ہے: کہ

وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝

نہ تم مرو مگر مسلم ہو کر۔

(آل عمران: 102)

یہ تو قطعاً نہیں کہا: کہ

”وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ حَنَفِيُونَ“

نہ تم مرو مگر حنفی بن کر۔

”وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ جَعْفَرِيُونَ“

نہ تم مرو مگر جعفری بن کر۔

”وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ دِيوبَنْدِيُونَ“

نہ تم مرو مگر دیوبندی بن کر۔

”وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ وَهَابِيُونَ“

نہ تم مرو مگر وہابی بن کر۔

”وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ بَرِيلِيُونَ“

نہ تم مرو مگر بریلوی بن کر۔

”وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ شِيعِيُونَ“

نہ تم مرو مگر شیعہ بن کر۔

”وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ نَقْشِبَنْدِيُونَ“

نہ تم مرو مگر نقشبندی بن کر۔ وغیرہ

ہماری اہل درد سے ہمدردانہ درخواست ہے کہ ان فرقوں اور ناموں کو خیر باد کہنے کی قربانی دیں۔ جس کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بڑی قیمت ہے۔ اور یہی وقت ہے قربانی دینے کا، تاکہ تھکی ماندی، اور شکست خوردہ امت کو مزید انتشار سے بچایا جاسکے اور دشمن کا ترنوالہ بننے سے مسلمان محفوظ ہوں۔ اس لئے کہ رب ذوالجلال کی عدالت میں معاملہ بڑا سخت ہے۔ اگر وہاں یہ پوچھ لیا گیا کہ میرے رسول ﷺ نے دین کیا دیا تھا اور امتیوں نے اس کے حصے بخرے کر کے اسے کیا بنا دیا۔ آخر کیا جواب ہوگا ہمارے پاس؟

☆۔ نیز قرآن کی اس آیت کو ہم وَاَعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا کے سیاق (Context) میں ضرور پڑھیں اور سوچیں کہ جو مسلم اتفاق و اتحاد کو پارہ پارہ کرتے ہیں اور مختلف گروہوں میں بٹ کر جینا چاہتے ہیں روز قیامت ان کا کیا حشر ہوگا۔ آئیے! ہم غور کریں کہ ایسی صورت میں ہم اللہ کی نظر میں کیا ہیں؟ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ

اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكْفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ

فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۝

جس دن کچھ چہرے سفید ہونگے اور کچھ کالے۔ رہے وہ جن کے چہرے کالے ہونگے (انہیں کہا جائیگا)

کیا تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا تھا۔ لہذا اپنے کفر کی پاداش میں اس عذاب کو چکھو۔

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ

اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكْفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ

فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۝

(آل عمران: 106)

سوچئے کیا عذر ہوگا ہمارے پاس اس کفر کا؟

☆۔ اسی طرح ایک مسلمان جب مرتا ہے تو بمصداق حدیث رسول ﷺ اس سے قبر میں منکر نکیر (دو فرشتے) تین سوالات کرتے ہیں جن میں ایک سوال یہ

بھی ہے :

﴿ما دینک؟﴾

تیرا دین کیا ہے؟

اگر مرنے والے کا جواب ”دینی الاسلام“ میرا دین اسلام ہے۔ تو اس کی نجات ممکن ہے۔ اور اگر اس کا جواب یہ ہے کہ میرا دین اہل حدیث ہے، شیعہ ہے، حنفی ہے، وہابی ہے یا دیوبندی، بریلوی ہے یا نقشبندی، تو تمام ائمہ اسلام کا اتفاق ہے کہ اس کی نجات نہیں ہوگی۔

امت کا المیہ: امت کا یہ انتشار جس سے عالم اسلام آج کرہ نار بنا ہوا ہے اس میں دو طرح کی گروہ بندیاں اب نظر آتی ہیں۔

ایک گروہ کے وہ فرقہ باز ہیں جن میں الحاد گھس آیا ہے اور تجدد کے نام پر قرآنی آیات کی من مانی تاویل اور دینی مسائل کی خود ساختہ تشریح کرتے ہیں۔ اور distortion تحریف بھی۔ رسول اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ ایک ماڈل کے طور پر انہیں ایک لحظہ پسند نہیں۔ یہ اسوہ ان کے نزدیک کیا حیثیت رکھتا ہے وہ ان کے حلیوں، باتوں، تحریروں یا مشتعل نفسیات سے بخوبی جانا جاسکتا ہے۔ اہل دین کو گالیاں دے کر، انہیں برا بھلا کہہ کر، ان کے مقام و مرتبہ کو گرا کر اور نفرت آمیز تحریریں پیش کر کے یہ اپنا چھوٹا قد اونچا کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف اسلام کا بڑا خیر خواہ، داعی اور بزعم خویش بڑا صاحب بصیرت و ہمدرد بھی خود کو سمجھتے ہیں اور اپنے نفس کی شرارتوں کو چھپاتے ہیں۔ انہیں پرکھنا ہو تو ان کے حلیوں، باتوں اور عملوں کو سیرت رسول کے سامنے رکھ کر پرکھ لیجئے۔ باسانی معلوم ہو جائے گا کہ یہ کس طبقے کے لوگ ہیں۔ اور کس کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں؟

دوسرا گروہ وہ ہے جو اپنی دھڑے بندیوں اور فقہی مسالک میں منقسم ہے۔ ان میں باعمل، نیک، متقی اور متواضع بزرگوں کی کمی نہیں۔ جو خوفِ خدا بھی رکھتے ہیں۔ اور امت رسول ﷺ کا درد بھی۔ مگر دھڑے بندی کی سب سے بڑی کمزوری کو وہ اپنے لئے سب سے بڑی طاقت و حمایت سمجھتے ہیں۔ ان میں بڑے قد کاٹھ کے علماء بھی شامل ہیں۔

ان مذہبی بزرگوں اور دوسرے آزاد منش طبقے سے ایک عاجزانہ سوال یہ ہے کہ ایک غیر مسلم اگر اسلام قبول کرنا چاہے تو کیا یہ مسالک اور ہماری عصیتیں و مادر پدر آزادی اس کے اسلام کی قبولیت میں کشش کا باعث بنیں گی یا نفرت کا؟ جب کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ناتھ امریکہ، جاپان و دیگر غیر مسلم ملکوں میں لوگوں کی اکثریت اسلام قبول کرنے سے اس لئے باز رہی کہ مسلکی عصیتوں نے وہاں جو رنگ دکھائے وہ ناقابل بیان ہیں۔ اور مسلمانوں کی آزادی و بے راہ روی نے جو انہیں شرمندہ کیا وہ الگ المیہ ہے۔ ہمارے اخلاق و رویے کو دیکھ کر وہ توبہ توبہ کرتے ہوئے یہ سوال کرتے ہیں کہ کون تم میں مسلمان ہے اور کون کافر؟۔ یہ مادر پدر آزادی جو تمہارا اسلام دیتا ہے اور جو آزادی مغرب دے رہا ہے آیا ان دونوں میں کوئی فرق بھی ہے؟ اگر نہیں ہے تو ہم بھلے ہی سہی ورنہ ہمیں تو تمہارے اسلام سے شرم آتی ہے۔ بتائیے آپ کے پاس کون سا اسلام ہے؟ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا دین یا اپنا حزبی مذہب؟

☆ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان تمام فرقہ بندیوں کو خدا حافظ کہہ کے قرآن مجید و سنت رسول ﷺ کی بنیاد پر ہم ایک ہو جائیں؟ اگر حکومت وقت بھی تھوڑی سی مخلصانہ دلچسپی لے تو معتدل مزاج، صاحب مروت، روادار، صحیح معنوں میں عالم اور قدیم و جدید پر گہری نظر رکھنے والے علماء پر مشتمل ایک اعلیٰ اختیاراتی بورڈ بنائے جو مدارس، سکول و کالج اور یونیورسٹیز کا نصاب مسلکی بنیاد پر نہیں بلکہ دینی اور دنیوی و اخروی بہتری کے لئے بنائے تاکہ مستقبل کی نسلیں تعصبات کی بجائے دینی محبت اور حمیت لے کر اٹھیں۔ اسی طرح یہ بورڈ ہر فرقہ سے فائدہ ضرور اٹھائے مگر قرآن و سنت کو زندہ کرے۔ یہ نہ اجتہاد کی دعوت ہے اور نہ مذاہب خمسہ کے خلاف علم بغاوت۔ یوں تقریباً بین المذاہب کی کوششیں کامیاب ہو سکتی ہیں اور بتدریج تعصب کو کم کیا جاسکتا ہے۔ اس بورڈ کو قرآن مجید کا یہ اصول بطور ایک ماٹو کے ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ:

بے شک جن لوگوں نے اپنے دین میں تفریق کی اور

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا لَسْتَ

مختلف گروہوں میں بٹ گئے، تمہارا ان سے کوئی تعلق

مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ... O (الانعام: 159)

نہیں۔

صنف کا تعارف

ملتان کے علمی و تدریسی خانوادہ سے ان کا تعلق ہے۔ ۱۳۹ھ میں اپنے والد محترم شیخ الحدیث ابو الطیب شمس الحق مسعود سے درس نظامی مکمل کیا۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ۱۹۸۰ء میں ایم اے عربی کیا۔ ۱۹۸۳ء میں انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کے کلیہ اصول الدین سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۸۹ء میں گلاسگو یونیورسٹی اسکاٹ لینڈ سے پی ایچ ڈی کی۔ ۱۹۹۸ء میں ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد میں بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر کے شعبہ قرآن و حدیث میں آگئے۔ ۲۰۰۰ء میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں بطور پروفیسر ان حدیث اور چیئر مین شعبہ حدیث و سیرت کے تقریری ہوئی۔ سن ۲۰۰۲ء میں اپنی بعض مصروفیات کی بناء پر استعفیٰ دے دیا۔ عربی، اردو اور انگریزی زبان میں بہت سے آرٹیکلز لکھے۔ چند کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔